پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

سوارہ

وہاں بہت تاریکی تھی۔ اتنی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجائی نہ دیتا تھا۔ اتنا اندھیرا اور گھٹن کہ سانس رکنے لگا تھا۔ اس نے بہت تیز تیز سانس لیے لیکن اس تاریک زندان میں آکسیجن کہیں نہ تھی اور آکسیجن کی کمی سے اس کا سانس بند ہونے لگا اور اس کے منہ سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی جیسے کوئی اپنی جان بچانے کی آخری کوشش کرے اور پھر ہاتھ پھیر ڈال دے۔

''اصبح...... اصبح!''

اس کی روم میٹ نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ماریہ سبطین اس پر جھکی ہوئی تھی۔ دائیں ہاتھ کی پشت سے پسینے کے قطرے صاف کرتے ہوئے وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''کیا ہوا اصبح ؟ کیا کوئی خواب دیکھ رہی تھیں؟''

''ہاں شاید۔ میں نے کیا کچھ کہا تھا؟''

''نہیں لیکن بہت گہرے گہرے سانس لے رہی تھیں اور تمہارے حلق سے گھٹی گھٹی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔'' ماریہ نے ٹیبل پر پڑے جگ سے گلاس میں پانی ڈالا اور اس کی طرف بڑھایا۔ ''لو یہ پی لو اصبح۔''

''تھینک یو۔'' اصبح نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔ اس کا دل ابھی تک زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ تاریک زنداں جس میں کوئی روزن...... کوئی کھڑکی نہ تھی اور آکسیجن نہ ملنے سے سانس گھٹتا ہوا سا محسوس ہوتا تھا۔

یہ خواب یا تھوڑے سے فرق سے اس سے ملتے جلتے خواب وہ مسلسل کئی سالوں سے

دیکھ رہی تھی۔ کبھی ہفتوں بعد' کبھی مہینوں بعد...... لیکن خواب تقریباً یہی ہوتا تھا۔ یہی گہرا دم گھونٹتا ہوا اندھیرا اور بند زنداں اب تو پورے سال بعد اس نے یہ خواب دیکھا تھا۔

اس نے ماتھے سے پسینے کے قطرے صاف کرتے ہوئے ماریہ کی طرف دیکھا' جو پھر چادر اوڑھ کر سو گئی تھی۔ اس نے کلاک کی طرف نظر دوڑائی چار بج رہے تھے۔ فجر کی نماز کا وقت ہونے ہی والا تھا۔ اب سونا بیکار تھا۔ اس نے بیڈ کے ساتھ چھوٹی ٹیبل پر لیمپ جلایا اور کتاب کھول لی' لیکن ذہن پڑھنے کی طرف مائل ہی نہ ہو سکا۔

اسے یہاں آئے ایک سال ہونے والا تھا۔ حالانکہ اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ بابا جان یوں اس کے خواب کی تعبیر اس کی جھولی میں ڈال دیں گے۔ یوں اچانک اسے میڈیکل کالج میں ایڈمیشن کی اجازت دے کر۔ بہت بچپن میں جب بی جان بیمار پڑ گئی تھیں اور گاؤں میں کوئی ڈاکٹر نہ تھا' تب بابا جان نے بی جان کو پشاور لے جانے کا فیصلہ کیا تھا لیکن بی جان نے رستے میں ہی دم توڑ دیا تھا تو بابا جان کی گود میں بیٹھے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے ان کے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے بابا جان کو جیسے ڈھارس دی تھی۔

"بابا جان! میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور اگر بی جان بیمار ہو گئیں تو ان کا علاج کروں گی' پھر وہ ٹھیک ہو جائیں گی اور ہمیں پشاور نہیں آنا پڑے گا۔" اس کے ننھے سے ذہن میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ بی جان اب کبھی واپس نہیں آئیں گی۔

بابا جان نے خاموشی سے بغیر کچھ کہے اس کی پیشانی پر اپنے لب رکھ دیئے تھے۔ اب پتا نہیں تب سے بابا جان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی یا ایف' ایس سی میں اس کی شاندار کامیابی نے انہیں یہ بات یاد دلا دی تھی۔ سب کی مخالفت مول لے کر وہ اسے لاہور میں اپنے دوست ڈاکٹر عبدالصمد خان کے پاس انٹری ٹیسٹ کی تیاری کے لیے چھوڑ گئے تھے' کیونکہ عبدالصمد خان کی بیٹی ستارہ خان بھی انٹری ٹیسٹ کی تیاری کے لئے اکیڈمی جا رہی تھی اور بابا جان نے لاہور سے واپس آ کر جب اسے اپنے کمرے میں بلا کر لاہور جانے کے لیے تیاری کرنے کے لیے کہا تو کتنی دیر تک اسے یقین نہیں آیا تھا اور جب وہ بولی تو اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"بابا جان! آپ کو...... آپ کو کیسے پتا چلا میرے دل کی آرزو کا۔" بے اختیار ان کے سامنے کارپٹ پر گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے اس نے ان کے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگائے

تھے۔

"اس لیے جان بابا کہ تم اپنے بابا کے دل میں رہتی ہو۔"

"لیکن وہ اجی جان تو کہہ رہی تھیں کہ مجھے اب سلائی کڑھائی کی طرف دھیان دینا چاہیے۔" اس نے ہاتھ میں پکڑے دھاگے کے لچھوں کی طرف دیکھا۔ جنہیں کچھ دیر پہلے اجی نے اسے دیا تھا اور بابا جان کا بلاوا سن کر وہ یونہی ہاتھوں میں دھاگے تھامے چلی آئی تھی۔

"میں اجی کو سمجھا دوں گا۔"

"لیکن بابا جان شاید وہ نہ مانیں۔" چند لمحے پہلے اس کی آنکھوں میں چمکنے والے تارے بجھ سے گئے تھے۔

"انہوں نے مجھ سے سختی سے کہا تھا کہ میں آپ سے مزید پڑھنے کی ضد نہ کروں۔ میں نے تو آپ سے ضد نہیں کی ناں۔ ایک بار بھی نہیں کہا۔ آپ خود ہی......"

"ہاں میں جانتا ہوں میری بیٹی ضدی نہیں ہے۔ تب ہی تو میں...... اچھا اب تم جاؤ۔ جا کر تیاری کرو۔ میں بات کر لوں گا تمہاری اجی سے۔ ستارہ ایک ہفتے سے اکیڈمی جا رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں تمہارا زیادہ حرج نہ ہو۔ اس لئے ایک دو روز تک ہم چلے جائیں گے لاہور کے لیے۔ دو روز تک تیاری ہو جائے گی۔"

"تیاری تو میں آج ہی کر لوں گی بابا جان لیکن......"

اس کی چہکار میں یک دم اندیشے آئے تو بابا جان نے جو اپنی کتاب پر جھک گئے تھے۔ یکدم نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"اب کیا ہے......؟"

"وہ آغا جان اور کاکا جان...... وہ تو کبھی نہیں مانیں گے بابا جان۔" مایوسی اس کے لہجے میں ہی نہیں اس کی آنکھوں میں بھی اتر آئی تھی۔

بابا جان کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں اور ان کا چہرہ سپاٹ تھا۔ ہونٹ بے اختیار بھنچ گئے تھے۔

"ٹھیک ہے بابا جان آپ ان کو خفا نہیں کریں۔ وہ آپ سے بہت ناراض ہوں گے۔ بابا جان میں آپ کو پریشان نہیں دیکھ سکتی۔ کوئی بات نہیں بابا جان میں نے اتنا پڑھ تو لیا

ہے۔" اس نے بے اختیار امڈ آنے والے آنسوؤں کو بمشکل روکا تھا۔

"میں نے جو کہا ہے وہ کرو۔"

بابا جان نے نظریں اس کے چہرے سے ہٹا لی تھیں اور اصبح کو لگا تھا' جیسے بابا جان کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی ہو۔ کئی بار اس نے محسوس کیا تھا' جیسے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بابا جان کی آنکھوں میں پانی سا بھر جاتا تھا اور وہ یکدم ہی اس کے سامنے سے ہٹ جاتے تھے۔

ایک بار اس نے امی سے بھی پوچھا تھا۔

"بابا جان اتنے اداس اور اتنے چپ چپ سے کیوں رہتے ہیں؟ کیا انہیں بیٹے کے نہ ہونے کا دکھ ہے؟"

"نہیں' ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔"

امی نے اس سے نظریں چرا لی تھیں اور جب سے وہ باشعور ہوئی تھی۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ امی بھی اس کے چہرے کی طرف کم ہی دیکھتی ہیں۔ کبھی نظر پڑ جائے تو فوراً نظریں ہٹا لیتی ہیں۔

"کیا میں بدصورت ہوں؟" اس نے خود سے سوال کیا کہ امی مجھے دیکھنا پسند نہیں کرتیں اور پھر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ہر زاویے سے خود کو دیکھا تھا اور آئینے نے اسے بتایا تھا کہ وہ تو بہت خوب صورت ہے۔ بالکل اپنی امی جان جیسی۔ ویسی ہی لانبی سرمئی آنکھیں' گلابی رنگت' دلکش قامت' عجب طرح کا حسن اور وقار تھا امی میں اور بابا جان بھی تو کچھ کم خوب صورت نہ تھے۔ کاکا جان اور آغا جان دونوں سے زیادہ باوقار اور خوب صورت اور ان دونوں کے برعکس نہایت نرم مزاج اور رحم دل۔ اس نے کبھی زندگی بھر اپنے بابا جان کو اونچی آواز میں بولتے نہیں سنا تھا۔ جب کہ کاکا جان کو تو اکثر اس نے اونچی آواز میں بولتے اور غصہ کرتے دیکھا تھا۔

امی تو لندن میں ہی پیدا ہوئی تھیں اور وہاں ہی اپنی ایجوکیشن مکمل کی تھی' پھر بھی پتا نہیں کیوں وہ اس کی تعلیم کے خلاف تھیں۔ یہ تو بابا جان ہی تھے' جنہوں نے اپنی مرضی سے اسے پشاور بھجوایا تھا۔ گاؤں میں تو لڑکیوں کا صرف پرائمری سکول تھا' جبکہ بوائز کا مڈل سکول تھا اور بابا جان کوشش کر رہے تھے کہ وہ ہائی ہو جائے۔ آغا جان نے بھی اس کے پشاور جانے کی بہت مخالفت کی تھی۔

مڈل کا امتحان اس نے پرائیویٹ دیا تھا۔ بابا جان خود اسے پڑھاتے تھے اور نائنتھ میں انہوں نے اس کا ایڈمیشن پشاور میں کروا دیا تھا اور رہنا اسے ہاسٹل میں تھا۔ آغا جان نے بے حد مخالفت کی تھی' لیکن ابا جان کی ایک ہی بات پر وہ خاموش ہو گئے تھے۔

"آغا جان آپ تعلیم کی بات کرتے ہیں میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس کے سامنے آسمان کے تارے توڑ کر رکھ دوں۔ میں اسے اتنی خوشیاں دوں کہ...... آغا جان پلیز آپ اصبح کے معاملے میں کچھ اور مت کہیں۔"

اور بابا جان کی بے تحاشا محبت پر اس کا دل بھر آیا تھا۔ حالانکہ تب وہ صرف تیرہ چودہ سال کی تھی' لیکن اسے یاد تھا کہ بابا جان کی بات سن کر اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے اور بابا جان نے بے اختیار اس کی پلکوں پر اٹکا آنسو اپنی انگلی کی پور پر چنا تھا۔

"اصبح بچے اس حویلی میں اپنے باپ کے گھر رہتے ہوئے کبھی مت رونا۔ تمہارا ایک آنسو بھی گرا تو تمہارا یہ باپ مر جائے گا۔ وہ تمہیں روتے نہیں دیکھ سکتا بچے۔" وہ تیز تیز قدموں سے آغا جان کے کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔

وہ حیران سی سوچتی رہ گئی تھی کہ بابا جان اتنے کمزور دل کیوں ہیں۔ شاید اس لیے کہ انہیں مجھ سے بہت محبت ہے اور ہاسٹل میں وہ بڑے فخر سے لڑکیوں کو بتایا کرتی تھی کہ اس کے بابا جان کو اس سے بے تحاشا محبت ہے۔

"اور تمہاری امی جان......"

ایک بار اس کی روم میٹ زہرہ جان نے پوچھا تھا' جو مردان کے قریب ایک گاؤں کی رہنے والی تھی۔ اس کے بابا جان پولیس میں تھے اور اس کے بابا جان کی طرح اپنی بیٹی کو بہت سارا پڑھانا چاہتے تھے۔

"کیا وہ بھی تم سے اتنی ہی محبت کرتی ہیں جتنی تمہارے بابا جان؟"

"ہاں' کیوں نہیں۔" اس نے کسی قدر حیرت سے زہرہ جان کو دیکھا۔ "بھلا امی مجھ سے کیوں محبت نہیں کریں گی۔ میں ان کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ ہاں البتہ وہ اظہار نہیں کرتیں اس کا۔"

"مگر میری ماں تو مجھ سے اتنی محبت نہیں کرتی' جتنی میرا بابا کرتا ہے۔"

زہرہ جان نے کہا تو اس روز بستر پر لیٹ کر وہ بہت دیر تک امی کے متعلق سوچتی رہی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

وہ بہت چھوٹی سی تھی اور ابھی وہ صرف امی امی کرنے لگی تھی تب بابا نے بے اختیار اسے گود میں اٹھا کر پیار کر لیا تھا۔ ایک بار امی نے اسے بتایا تھا۔ تب وہ لندن میں تھے اور امی نے کتنی ہی کوشش کی تھی کہ وہ اسے ماما یا ممی کہہ کر بلائے' لیکن وہ ایک بار ممی کہتی تو دوسری بار امی کہہ کر بلانے لگتی تھی۔ تب بابا جان اس کی حمایت کرتے۔

"کہنے دو نا امی' اچھا لگتا ہے اس کی زبان سے۔" باشعور ہوتے ہی اس نے خود امی کے ساتھ جان لگا لیا تھا۔ کبھی بہت لاڈ میں آتی تو امی جی کہہ کر بلا لیتی تھی۔

امی جان عذرا خانم بی جی کی سگی بھتیجی تھیں' لیکن بہت پہلے ان کے بھائی اپنی کم عمری میں ہی لندن چلے گئے تھے۔ وہاں ہی ان کی رہائش تھی۔ عذرا خانم وہیں پیدا ہوئی تھیں۔ وہیں تعلیم حاصل کی تھی۔ او لیول میں تھیں جب وسیط خان پڑھائی کی غرض سے انگلینڈ گئے تھے اور لندن میں ہی سبطین خان کے ہاں ٹھہرے تھے اور پھر اپنی تعلیم مکمل کرتے ہی وہاں ہی عذرا خانم سے ان کی شادی ہو گئی تھی اور لندن میں رہنے اور پڑھنے کے باوجود انہیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان کی پرورش لندن میں ہوئی ہے۔ روایتی لباس میں ملبوس حویلی میں اِدھر سے اُدھر جاتی کام کرواتی وہ کشمالہ تائی سے کسی طرح بھی مختلف نظر نہیں آتی تھیں۔ کشمالہ جو کاکا جان کی بیوی اور آغا جان کی بڑی بہو تھیں۔

انٹری ٹیسٹ کی تیاری کے دوران دو بار بابا جان لاہور آئے تھے اور پھر ٹیسٹ کے بعد وہ حویلی واپس آ گئی تھی اور پھر عبدالصمد خان نے ہی کامیابی کی اطلاع دی تھی۔ اسے علامہ اقبال میڈیکل کالج میں ایڈمیشن مل گیا تھا۔

آغا جان اور کاکا جان کا موڈ کافی خراب تھا۔ بابا جان کے ساتھ ان کی کیا بات ہوئی تھی اسے علم نہ تھا' لیکن امی کو اس نے بہت پریشان دیکھا تھا۔ بابا جان بھی کچھ کم پریشان نہ تھے' لیکن وہ اپنی پریشانی ظاہر نہیں کر رہے تھے۔ ضرور آغا جان اور بابا جان میں میرے ایڈمیشن کے سلسلے میں کوئی بات ہوئی ہے' کیونکہ آغا جان نے کئی بار اس کے سامنے ہی اس کے لاہور جا کر میڈیکل کالج میں داخلہ لینے کی مخالفت کی تھی۔

تب اس روز جب اس نے بابا جان کو لان میں بہت دیر سے ٹہلتے دیکھا تھا اور پھر برآمدے میں آ کر کرسی پر آنکھیں موندے کچھ سوچتے ہوئے تو وہ کمرے سے نکل کر ان کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔

"بابا جان اگر آغا جان کو میرا ڈاکٹر بننا پسند نہیں تو میں نہیں بنتی ڈاکٹر......"

"تمہیں پسند ہے؟" یک دم ہی آنکھیں کھول کر انہوں نے اسے دیکھا تھا۔

"جی...... لیکن مجھ سے آپ کی اور امی کی پریشانی نہیں دیکھی جاتی۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تو انہوں نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"نہیں جانِ بابا ابھی تمہارے بابا زندہ ہیں اور میرے ہوتے ہوئے اس گھر میں تمہاری ہر خواہش پوری ہو گی۔ ہاں میں نہ رہا تو......" اور تب بے اختیار اس نے اپنے ہاتھ ان کے ہونٹوں پر رکھ دیئے تھے۔

"نہیں بابا جان اس طرح مت کہیے۔ خدا آپ کو بہت لمبی زندگی دے۔ میری ہر خواہش آپ کی پریشانی پر قربان ہے بابا جان یہ اتنی اہم نہیں ہے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

انہوں نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اس کے سر کو چوم کر آہستگی سے کہا۔ "امیج جب تک تم یہاں ہو بیٹا تو مت رونا میں نے پہلے بھی تمہیں کہا تھا تمہارے آنسو میرا دل ڈھا دیتے ہیں۔ یہ تمہارے بابا کی جان لے لیں گے۔"

پھر وہ ایک دم ہی تیزی سے اٹھ کر برآمدے میں سے ہوتے اور بڑے صحن کو پار کر کے مردانہ حصے کی طرف چلے گئے تھے اور وہ حیران سی کھڑی رہ گئی۔ ان کا یہ رویہ اسے پریشان کر دیتا تھا۔

"پتا نہیں بابا جان کو کیا دکھ ہے؟ حالانکہ حویلی میں سب اچھا تھا۔ کشمالہ تائی اور امی کی بہت دوستی تھی۔ آغا جان اور کاکا جان گو بہت غصیلے تھے۔ شاہ زر خان اور امان اللہ خان کو ڈانٹتے بھی تھے' لیکن اس کے لیے تو بہت شفیق اور مہربان تھے۔ شاہ زر لالہ اور امان اللہ خان بھی اسے سگی بہنوں کی طرح ہی چاہتے تھے۔ شاہ زر تو اپنی تعلیم مکمل کر کے گھر پر ہی کاکا جان کے ساتھ زمینوں کو دیکھتا تھا۔ امان اللہ پشاور یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا اور وہ دونوں سے ہی بے تکلف تھی۔

امان اللہ گھر پر ہوتا تو ہر طرف قہقہے بکھرتے رہتے تھے۔ اس کی باتوں پر اس نے کئی بار امی کے لبوں پر بھی دبی دبی مسکراہٹ دیکھی تھی' لیکن پھر بھی اسے لگتا جیسے ہر ایک اداس ہو۔ آغا جان اور کاکا جان بھی کبھی کبھی اسے چپ چپ اور اداس لگتے اور بی جی جب تک زندہ

رہیں' کئی بار اس نے انھیں چپکے چپکے روتے دیکھا تھا۔

"شاید کوئی ماضی کا دکھ۔" اس نے خود ہی سوچ لیا تھا' جو سب کو کبھی کبھی افسردہ کر دیتا تھا۔

بابا جان مردانے میں چلے گئے تھے اور اجی نے اس کے قریب آ کر کہا تھا۔ "پیکنگ کر لو بلکہ پہلے لسٹ بنا لو کہ تمھیں وہاں کس کس چیز کی ضرورت ہوگی؟ اب تمھیں صمد لالہ کے ہاں نہیں بلکہ ہاسٹل میں جانا ہے۔"

"لیکن اجی وہ آغا جان......" اور اجی اس کی بات سنے بغیر ہی بڑے سے کچن کی طرف چلی گئی تھیں اور ان کے پیچھے آتے امان اللہ نے ہنس کر کہا تھا۔

"تمھیں آم کھانے سے کام ہے یا گٹھلیاں گننے سے۔" اور پھر اس نے اسے تیاری میں مدد دی تھی اور ساتھ ہی ساتھ مشورے بھی دیتا جاتا۔ یہ بھی رکھ لو۔ وہ بھی رکھ لو۔

شاہ زر لالہ بھی بہت خوش تھے اور خود اسے بابا جان کے ساتھ چھوڑنے ہاسٹل آئے تھے اور اب اسے یہاں آئے ایک سال ہو چکا تھا۔ اس کے پہلے سال کے پیپرز ہونے والے تھے۔ اس کی روم میٹ ماریہ بہت اچھی اور مخلص لڑکی تھی۔ اس کا تعلق اسلام آباد سے تھا۔ اس کے والد انجینئر تھے۔ اس ایک سال میں دو تین بار وہ گھر گئی تھی۔ بابا جان اور شاہ زر لالہ' امان اللہ اسے ملنے آتے رہتے تھے۔ بابا جان تو باقاعدگی سے ہر پندرہ بیس دن بعد چکر لگاتے تھے۔

خدا کا شکر تھا کہ اس کی روم میٹ بہت اچھی تھی۔ گو اس کی اردو بہت صاف اور انگلش بہت اچھی تھی' پھر بھی اس کا لہجہ اس کے علاقے کی چغلی کھاتا تھا۔ ساتھی اسٹوڈنٹ پہچان لیتے تھے' لیکن سب ہی بہت مخلص اور بے تکلف سے تھے۔ اس کے گروپ کے سب لڑکے لڑکیاں اپنی پڑھائی میں مگن رہنے والے تھے۔ شروع میں کو ایجوکیشن کی وجہ سے وہ جتنا گھبرا رہی تھی' اب مطمئن تھی۔ بابا جان کو بھی اس نے اطمینان دلا دیا تھا کہ سب اچھے ہیں۔ بابا جان جب بھی آتے ماریہ ان سے ملنے ضرور جاتی تھی۔ اجی نے یہاں آنے سے پہلے اپنے علاقے اور خاندان کے رسم و رواج سے اسے آگاہی دینا ضروری سمجھا تھا۔

"تم خوب صورت بھی ہو اور کم عمر بھی۔ یہ عمر بہت خطرناک ہوتی ہے۔ اصبح میں تمھیں اس اعتماد کے ساتھ بھیج رہی ہوں کہ تم اپنے بابا جان اور آغا جان کا سر نہیں جھکاؤ گی۔"

بابا جان نے پورے اعتماد سے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔ "ہمیں اپنی بیٹی پر اعتماد ہے عذرا خانم وہ بہت باشعور اور سمجھ دار ہے۔ اپنا مقام جانتی اور پہچانتی ہے۔ تم خوامخواہ متردد ہو رہی ہو۔ کیوں اصبح بچے؟"

"جی بابا جان......"

اس لمحے اس نے اپنے دل میں عہد کیا تھا کہ وہ کبھی عمر بھر اپنے بابا جان کا اونچا سر جھکنے نہیں دے گی۔

اس ایک سال کے دوران اس نے کبھی اِدھر اُدھر نہیں دیکھا تھا۔ بڑی سی چادر میں لپٹی سنجیدہ سی اصبح کا سب ہی خود بخود احترام کرنے لگے تھے اور پھر اس کے ساتھی اسٹوڈنٹ سب ہی پڑھاکو سے تھے اور یوں بھی بقول ماریہ کو میڈیکل کی پڑھائی میں تو محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔

"ارے ساڑھے چار ہو گئے۔" یک دم ہی اس کی نظر کلاک پر پڑی اور وہ وضو کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

● ● ●

"خان آپ نے سنا زرک خان وطن واپس آ رہا ہے۔" زمرد جان نفیس چکن کی چادر اچھی طرح لپیٹتے ہوئے خان افروز خان کے سامنے پلنگ پر بیٹھ گئیں۔

"اچھی بات ہے' آخر بندہ کب تک غیروں کی زمین پر رہے۔ یہ فیصلہ تو زرک خان کو بہت پہلے کر لینا چاہئے تھا۔ غیر زمین پر پلنے والی اولاد اپنی ریتیں' رسمیں فراموش کر دیتی ہیں' لیکن تمھیں یہ خبر کس نے دی؟"

"دلبر کہہ رہا تھا اِدھر پہاڑی سے پرے والی حویلی کی صفائی ہو رہی ہے۔ آپ کو تو پتا ہے خان وہ اِدھر اُدھر بھٹکتا رہتا ہے۔ کہیں چین نہیں اسے' کبھی اس ٹیلے پر کبھی اس پر۔"

"صفائی کا یہ مطلب تو نہیں کہ حویلی کے مالک آ رہے ہیں۔" افروز خان نے حقے کا کش لے کر نے ایک طرف کر دی۔

"نہیں خان' دلبر کہہ رہا تھا کہ اسے حویلی کے ملازموں نے بتایا ہے کہ زرک خان آ رہا ہے۔ پورے اٹھارہ برسوں بعد کہیں پرانی دشمنیاں پھر نہ جاگ اٹھیں۔"

"ارے نہیں زمرد جان! زرک خان پڑھا لکھا آدمی ہے۔ وہ برسوں چلنے والی پشت در

پشت دشمنوں کے خلاف ہی تو تھا' جبھی تو وطن چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ مجھے یاد ہے جب وہ جا رہا تھا تو اس نے مجھ سے کہا تھا۔ "افروز خان لالہ میں یہاں سے جا رہا ہوں' میں نہیں چاہتا کہ میرے بچے خوف کی فضا میں پلیں...... اور میں خود ہر وقت اس خوف میں مبتلا رہوں کہ کسی انجان سمت سے آنے والی گولی میرے کسی بچے کی زندگی لے لے گی۔" خان افروز خان نے زمرد جان کو تسلی دی۔

"لیکن خان آپ کا کیا خیال ہے ولی خان والے اپنے بیٹے کا قتل بھول گئے ہوں گے' جو زرک خان کے چاچا نے کیا تھا؟"

زمرد جان زرک خان کے لیے پریشان ہو رہی تھیں کیونکہ وہ ان کی ماں کے سگے ماموں کا بیٹا تھا۔ افروز خان نے بہت غور سے زمرد جان کی طرف دیکھا۔

اس وقت جرگے کے فیصلے کے مطابق قصاص کی رقم ادا کر دی گئی تھی' کیونکہ زرک خان کے خاندان میں نہ اس کے چاچا کے گھر اور نہ زرک کے والد کے گھر کوئی لڑکی تھی' جس کو سورہ کے لیے مخصوص کر دیا جاتا۔

"پھر بھی پتا نہیں کیوں خان میرا دل ڈر رہا ہے۔ زرک خان کو وطن نہیں آنا چاہیے تھا۔ ولی خان نے تو بیٹے کے قتل کے بدلے میں قصاص کی رقم لے لی تھی' لیکن ولی خان کے دوسرے بیٹے اور بھتیجے اس کے لیے تیار نہ تھے۔" زمرد جان کچھ پریشان سی تھی۔

"زرک خان نے اگر وطن آنے کا فیصلہ کیا ہے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔ آخر اتنے سال اس نے وطن سے دور بھی تو گزار دیے ہیں۔ سنا ہے اس کی ایک بیٹی بھی ہے۔ اب وہ گوروں کے دیس میں بیٹی کی پرورش نہیں کرنا چاہتا ہوگا۔ جوان ہو رہی ہوگی اب تو۔ میں نے چھوٹے لالہ کو بھی کہا ہے کہ بہت کما لیا اب وطن لوٹ آئیں۔ بیٹی جوان ہو رہی ہے۔"

"ہاں لالہ نے تو بس وہاں ہی دل لگا لیا۔" زمرد جان نے بھی ٹھنڈی سانس لی۔

"کہتے ہیں بیٹی کی تربیت ایسے ہی کر رہا ہوں' جیسے وطن میں رہ کر کرتا۔ وہ آپ کو اور وسیط خان کو مایوس نہیں کرے گی۔"

"خیر' میں نے اس لیے نہیں کہا تھا۔ کیا میں نہیں جانتا چھوٹے لالہ کو۔" انہوں نے حقے کی نے دوبارہ ہونٹوں میں دبالی۔

"وہ اولاد کی تربیت کے معاملے میں جتنے سخت ہیں۔ بیٹی تو بیٹی بیٹوں پر بھی اتنی سختی ہے کہ مجال ہے کوئی ایک نماز بھی چھوڑ دے یا رات کو دیر سے گھر آئے۔ میں تو یوں کہہ رہا تھا کہ وطن پھر وطن ہے۔ اپنی زمین' اپنے لوگ' اپنے ہوائیں' ان کا نشہ ہی اور ہوتا ہے زمرد جان۔ میں وسیط خان سے ملنے گیا تھا تو چند دن رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ پتا نہیں لالہ کیسے رچ بس گئے ہیں۔"

"ہاں وسیط کا کوئی فون آیا؟ کیا پروگرام ہے اس کا؟" زمرد جان کو اپنے بیٹے کا خیال آ گیا تھا' جسے بچھڑے چار برس ہو گئے تھے۔

"کل رات ہی تو بات ہوئی تھی۔ آخری سمسٹر چل رہا ہے۔ چھوٹے لالہ کہہ رہے تھے کہ وسیط خان امتحان سے فارغ ہو جائے تو وہ بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں' لیکن لالہ شادی کے لیے تو پاکستان آئیں گے نا؟"

"اس سلسلے میں تو ابھی بات نہیں ہوئی۔" افروز خان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن میرا خیال ہے لالہ چاہتے ہیں کہ شادی وہیں ہو لندن میں...... گو صاف نہیں کہا' لیکن ان کی باتوں سے اندازہ ہوا مجھے۔"

"نہ خان میں نے کہہ دیا ہے کہ میں اپنے بچے کی شادی بہت دھوم دھام سے کروں گی۔ اپنے وطن میں اور ساری رسمیں کروں گی۔"

"بھئی یہ بات تو تم اپنے لالہ سے خود ہی طے کر لینا فی الحال تو وسیط کو پڑھائی سے فارغ ہونے دو۔" افروز خان مسکرائے۔

"امید خان کی شادی کے وقت تو میں بیمار تھی' پھر شادی بھی جلدی میں ہوئی وسیط خان کے لندن جانے کی وجہ سے لیکن اب تو......"

"خیر شادی کی کمی تو تم نے شاہ زر خان کی پیدائش پر پوری کر لی تھی۔ پورے سات روز جشن منا کر۔" افروز خان نے یاد دلایا تو وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولیں۔

"شاہ زر امید خان کا وارث پیدا ہوا تھا کیا جشن نہ مناتی۔ خدا پھر خوشی دکھائے تو پھر جشن مناؤں گی۔"

"لالہ نہ مانے تو کیا ہے اپنی حسرتیں ثمین خان کی شادی پر نکال لینا۔" افروز خان کھل کر مسکرائے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"ابھی تو وسیط کی باری ہے۔ شثین کا وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ ویسے شثین خان تو صاف کہتا ہے' بی جی میں تو جہاں من چاہا شادی کروں گا اور کسی روز اس سے نکاح کر کے گھر لے آؤں گا کہ یہ ہے میری دلور......"

"اچھا یہ ارادے ہیں شثین خاناں کے۔" افروز خان نے قہقہہ لگایا۔

"جانے کس پر چلا گیا ہے۔ امید خان اور وسیط خان تو اتنے منچلے نہ تھے۔" زمرد جان نے تبصرہ کیا اور اپنی چادر سنبھالتی باہر چلی گئیں' جبکہ افروز خان حقہ پیتے ہوئے زرک خان کی آمد کے متعلق سوچنے لگے۔ زمرد جان کے خدشے کچھ غلط بھی نہ تھے۔

افروز خان کے گھر کا ماحول قبیلے کے دوسرے گھروں سے خاصا مختلف تھا۔ خود وہ پڑھے لکھے تھے۔ بیٹوں کو بھی تعلیم دلوائی تھی۔ امید خان سب سے بڑے بیٹے تھے۔ انہوں نے زرعی یونیورسٹی سے ماسٹر کیا تھا جبکہ وسیط خان اعلیٰ تعلیم کے لئے ملک سے باہر گئے ہوئے تھے اور شثین خان جو سب سے چھوٹے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ماسٹر کر رہے تھے۔ گو افروز خان کی خواہش تھی کہ وہ ایم بی اے کرتے یا ڈاکٹر انجینئر بنتے لیکن شثین خان کا ذہن شعر و ادب کی طرف مائل تھا۔

"اوئے شثین خاناں یہ کیا ماسٹر بنے گا؟" افروز خان نے ہنس کر کہا تھا' لیکن کوئی دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ وہ شثین خان کو چاہتے بھی بہت تھے۔ وہ عورت کی عزت کرتے تھے اور اس کی رائے کو اہمیت دیتے تھے جبکہ ان کے سگے چچازاد' تایا زاد عورت سے رائے لینا یا انہیں گھریلو معاملات میں شامل کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ زمرد جان تو ان کی بیوی تھیں' لیکن وہ بہو کو بھی پورا احترام دیتے اور ہر فیصلے میں شریک رکھتے تھے۔

شاہ زر کی پیدائش کے وقت وہ اسے پشاور لے گئے تھے تاکہ کوئی مسئلہ نہ بنے اور اب تین سال بعد جب وہ پھر ماں بننے والی تھیں تو انہوں نے پشاور کے ہی ایک اچھے ہسپتال میں اس کا نام لکھوا دیا تھا۔ یہ سارا علاقہ ان کی جاگیر تھا اور پہاڑی کے اس طرف زرک خان کی جاگیر تھی۔

اٹھارہ برس پیشتر زرک خان تین چھوٹے چھوٹے بیٹوں کے ساتھ اس مسلسل چلنے والی دشمنی سے تنگ آ کر ہالینڈ چلا گیا تھا۔ زرک خان کے آباؤ اجداد اور ولی خان کے بزرگوں میں پاکستان بننے سے پہلے کی دشمنی چلی آ رہی تھی' جس کو موقع ملتا وہ دوسرے خاندان کے کسی

نہ کسی فرد کو مار ڈالتا تھا۔ کبھی جرگہ فیصلہ کرتا' قصاص یا سورہ (سوارہ) اور کبھی جرگے کے فیصلے سے پہلے ہی مرنے والے کے عزیز بدلہ لے لیتے تھے۔

زرک خان نے پنجاب یونیورسٹی سے انگلش لٹریچر میں ماسٹر کیا تھا۔ وہ ادب کا شیدائی' فطرت کا عاشق اور انسانیت سے محبت کرنے والا بندہ تھا' لیکن زرک خان اور افروز خان قبیلے کی رواجوں سے انحراف نہیں کر سکتے تھے۔

رواجوں کی پاسداری اپنی تمام تر وسیع النظری کے باوجود انہیں عزیز تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس طویل سلسلہ دشمنی کو ختم کرنے کے لیے زرک خان نے وطن چھوڑ دیا تھا۔ حالانکہ چچا اور چچا کے بیٹوں نے اسے بزدل اور کم حوصلہ کہا تھا' لیکن وہ حویلی ملازموں اور زمینیں چچا کے حوالے کر کے ملک سے چلا گیا تھا۔

زرک خان' افروز خان کا دوست تھا۔ گو عمر میں چھوٹا تھا وہ ان سے' لیکن سوچ اور فکر کی یکسانیت نے انہیں ایک دوسرے کے قریب کر دیا تھا' پھر وہ زمرد جان کا رشتے دار تھا۔ اس ناتے بھی وہ انہیں عزیز تھا اور اتنے سالوں بعد اس کے وطن آنے کا سن کر ان کا دل اس سے ملنے کے لیے بے چین ہو گیا تھا' لیکن اب کیا ان کا زرک خان کی حویلی میں جانا مناسب ہو گا یا نہیں۔ زرک خان ان سے ملنا پسند کرے گا یا نہیں...... اور اگر ملے گا تو کیا پہلے جیسی گرم جوشی سے ملے گا۔ انہوں نے حقہ ایک طرف کر کے دونوں پاؤں پلنگ پر رکھ کر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا لی۔

زمرد جان سے زرک خان کی آمد کا سن کر انہیں بے حد خوشی ہوئی تھی' لیکن اب یہ خیال بری طرح ان کے ذہن سے آ چمٹا تھا کہ زرک خان کے آنے کی صورت میں کیا ان کے اور زرک خان کے درمیان وہی پہلے سا التفات ہو سکے گا یا نہیں' کیونکہ امید خان کی بیوی اور ان کی بہو ولی خان کے عزیزوں میں سے تھی۔ گو دور کی عزیز داری تھی پھر بھی زرک خان کو اعتراض ہو سکتا تھا۔ ایک بار اس کے چچا نے حجرے میں طنز کیا تھا کہ امید خان کی دلور دشمنوں میں سے ہے۔

کیا خبر زرک خان بھی اپنے چچا کی طرح سوچے حالانکہ جب امید خان کی شادی طے ہوئی تھی تو انہیں ہرگز علم نہیں تھا کہ ان کی بہو ولی خان کے عزیزوں میں سے ہے۔ یہ شادی ان کے ایک دوست نے طے کروائی تھی۔ یہ تو نکاح کے بعد ہی جب سناور خان سے بیٹھ کر

باتیں ہوئی تھیں تو انہیں پتا چلا کہ یہ لوگ تو ان کے اپنے ہی علاقے کے ہیں اور برسوں پہلے ان کے بزرگ پشاور میں آباد ہو گئے تھے۔

وہ کچھ پریشان سے ہو کر اٹھنے ہی لگے تھے کہ امید خان سے اس کے متعلق بات کریں کہ ان کا چار سالہ پوتا شاہ زر انہیں پکارتا ہوا اندر آ گیا۔

"آغا جان..... آغا جان مجھے بندوق چاہیے۔"

"بندوق بھی لے دیں گے یار!..... ادھر تو آؤ صبح سے کہاں تھے؟"

"دلبر کے ساتھ تھا۔"

انہوں نے اسے گود میں بٹھا لیا اور اس کی پیشانی چومتے ہوئے اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے لگے اور وقتی طور پر زرک خان کی طرف سے ان کا دھیان بٹ گیا۔

● ● ●

"صبی..... صبی..... یار کہاں ہو' تمہارے بابا جان آئے ہیں۔" ماریہ اسے پکارتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔

"ایک منٹ میری میں وضو کر رہی ہوں' تم ذرا بابا جان کو کمپنی دو..... میں آئی۔" واش روم کے ادھ کھلے دروازے سے اس نے جھانک کر کمرے میں دیکھا اور پھر تیزی سے منہ پر پانی کے چھپاکے مارنے لگی۔

دراصل وہ اور ماریہ ستارہ کے ساتھ اس کے گھر جا رہی تھیں۔ وہ کہیں اور تو نہیں جاتی تھی البتہ ستارہ کے ہاں چلی جاتی تھی۔ انٹری ٹیسٹ کی تیاری کے لیے بھی وہ ان کے گھر پر رہی تھی' پھر عبدالصمد خان بابا کے بہت گہرے دوست تھے اور وہ خود بھی جب لاہور آتے انہی کے ہاں قیام کرتے۔ ان کے گھر قیام کے دوران اس کی ستارہ سے اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی اور آج ستارہ کی برتھ ڈے تھی اور اس نے اپنی چند فرینڈز کو انوائٹ کیا تھا۔ چونکہ عصر کی اذان ہونے والی تھی اس لیے اس نے سوچا وضو کر لے۔ نماز ستارہ کے ہاں جا کر پڑھ لے گی۔

جلدی جلدی تولیے سے چہرہ پونچھا اور دوپٹہ لے کر وہ وزیٹنگ روم میں آ گئی۔ جہاں بابا کے سامنے بیٹھی ماریہ بڑی بے تکلفی سے گپ لگا رہی تھی اور بابا جان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

"بابا جان!" وہ بے اختیار ان کی طرف بڑھی۔ انہوں نے بھی بے اختیار اٹھ کر اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے اس کی پیشانی چومی۔

"آپ نے اس بار بہت دن لگا دیے۔"

"کیوں بھئی میرا بیٹا اداس ہو گیا تھا۔"

"جی بابا جان بہت۔ امی کیسی ہیں..... اور باقی سب آغا جان' کاکا جان' تائی کشمالہ سب۔"

"سب اچھے ہیں۔" وہ مسکرائے۔ "تم بتاؤ تمہارے پیپرز کیسے ہوئے' کچھ چھٹیاں وغیرہ ہوں گی تو گھر چلو کچھ دنوں کے لیے۔"

"پیپرز بھی اچھے ہو گئے ہیں۔ ساتھ ہی اگلی پڑھائی بھی شروع ہو گئی ہے۔ چھٹیاں تو ایک ماہ تک ہوں گی وہ بھی صرف تھوڑی سی..... لیکن میرا دل امی کے لیے بہت اداس ہے۔ آپ انہیں بھی لے آتے۔"

"بھئی تمہاری امی حویلی کو نہیں چھوڑتیں۔ تم ایسا کرو کہ اس ویک اینڈ پر میرے ساتھ ہی چلو۔ دو دن رہ آؤ پھر شاہ زر تمہیں چھوڑ جائے گا۔ میں ابھی یہاں ہی ہوں دو تین دن تمہارے صمد انکل کی طرف۔"

"ہم بھی ادھر ہی جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ ستارہ کی سالگرہ ہے آج۔" ماریہ نے جلدی سے کہا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں اصبح کا پروگرام رہ ہی نہ جائے۔

"ارے واہ۔" مجھے تو کسی نے نہیں بتایا ادھر۔"

"کوئی فنکشن تو نہیں انکل بس وہ اپنی فرینڈز کو ہی بلایا ہے۔"

"تم لوگ کیسے جاؤ گی؟" انہوں نے پوچھا۔

"ستارہ نے کہا تھا کہ وہ لینے آئے گی۔" ماریہ نے بتایا۔

"تو پھر ٹھیک ہے میں ستارہ کو منع کر دیتا ہوں تم میرے ساتھ ہی چلو۔" وہ موبائل نکال کر عبدالصمد خان کا نمبر ملانے لگے اور ماریہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آؤ اتنے میں ہم تیار ہو کر آتے ہیں۔"

"میں تو تیار ہی ہوں بس میری چادر لے آنا اور کمرہ لاک کر دینا۔"

"ہاں جی' تمہیں تو اللہ نے اوپر سے تیار کر کے بھیجا ہے' لیکن ہم جیسوں کو تو باقاعدہ

لیپا پوتی کرنا پڑتی ہے تب کہیں جا کر شکل نکلتی ہے۔" اس نے گویا امیج کے کانوں میں سرگوشی کی تو امیج مسکرا دی۔

"خیر اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے' لیکن تم بھی ان خواتین کی صف میں شامل ہو جنہیں لیپا پوتی کا شوق ہوتا ہے۔"

"بھئی آفٹر آل ہم لڑکیاں ہیں اور حق ہے ہمارا۔" ماریہ چلی گئی تو وہ بابا جان کو دیکھنے لگی۔ جو موبائل پر بات کر رہے تھے۔

"کیا دیکھ رہی ہو بیٹا؟" موبائل آف کر کے انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔

"بابا آپ کچھ کمزور لگ رہے ہیں۔ کیا آپ کچھ بیمار رہے ہیں۔"

"نہیں تو جان بابا تمہیں یہ وہم کیوں ہوا؟"

"آپ کی آنکھوں کے نیچے حلقے پڑے ہوئے ہیں۔ آپ ضرور بیمار رہے ہیں' لیکن چھپا رہے ہیں مجھ سے۔"

"نیند نہیں آتی۔ حلقے اس لیے پڑ گئے ہیں۔" انہوں نے ایک گہری سانس لی۔

"مگر کیوں بابا جان! آپ نے ڈاکٹر کو دکھایا۔" وہ پریشان سی ہو گئی۔

"ہر بیماری کا علاج ڈاکٹر کے پاس نہیں ہوتا امیج بچے' کچھ مرض لاعلاج ہوتے ہیں۔ نیند تو برسوں سے روٹھی ہوئی ہے۔ ٹرانکولائز دے دے کر مناتا ہوں۔" وہ ہولے سے ہنسے۔

"دراصل پچھلے دنوں ٹیبلٹس لینی چھوڑ دی تھیں تنگ آ گیا تھا۔"

"لیکن اس طرح تو آپ کی صحت خراب ہو جائے گی۔" اسے تشویش ہوئی۔ "کسی اسپیشلسٹ کو دکھائیں نا' کوئی وجہ تو ہو گی نیند نہ آنے کی۔"

"ہاں کوئی وجہ تو ہو گی۔" انہوں نے آہستگی سے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ "بہرحال اب پھر نیند کی گولیاں لینا شروع کر دوں گا خوش۔"

"پھر بھی آپ یہاں آئے ہوئے ہیں تو کسی اچھے ڈاکٹر کو ضرور دکھائیں۔"

ماریہ کو آتے دیکھ کر وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس سے چادر لے کر وہ دونوں ہولے ہولے باتیں کرتے ہوئے ان کے پیچھے ہی کمرے سے باہر نکل آئیں۔

"بابا' آج تو امیج جی آئی ہیں۔" سمیر خان نے ذرا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو امیج جو بے دھیانی سے دوپٹہ گلے میں ڈالے ستارہ سے باتیں کر رہی تھی اس نے یک دم چونک کر

دوپٹہ سر پر کیا اور مسکرا کر سمیر خان کی طرف دیکھا۔

"کیسے ہو سمی؟"

"بہت اچھا سسٹر۔" وہ پورا دروازہ کھول کر اندر چلا آیا اور ان کے سامنے پڑے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "یہ کیا بہنا چپکے چپکے سالگرہ منا لی اور بھائی کو سوکھے منہ پوچھا تک نہیں۔"

"سوری سمی' میں کالج میں ہی پروگرام بنا مجھے تو یاد تک نہیں تھا کہ آج میرا برتھ ڈے ہے۔ سب کہنے لگے کہ پارٹی دو تو......"

"خیر آپ کو یاد نہ ہو مجھے یاد تھا یہ لیجیے اپنا گفٹ۔" اس نے پارکر پین کا سیٹ ستارہ کی طرف بڑھایا۔

"اوہ تھینک یو سمی۔" ستارہ کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔ "تم کبھی بھی نہیں بھولتے۔"

"ہاں' اس لیے کہ آپ ہماری اکلوتی پیاری بہن ہیں۔" سمیر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں بہن کے لیے محبت تھی۔ امیج اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"سمیر' ستارہ سے تقریباً تین سال چھوٹا تھا اور اس وقت فرسٹ ایئر میں پڑھ رہا تھا۔ سمیر سے چھوٹا بسیر ابھی ساتویں کا سٹوڈنٹ تھا۔ تینوں بہن بھائیوں میں بہت محبت تھی۔ انٹری ٹیسٹ کی تیاری کے دوران جب وہ یہاں رہی تھی تو دو ماہ کے عرصے میں وہ سب سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔ سمیر اور بسیر بھی اس سے کافی بے تکلف ہو گئے تھے اور بڑی بہن کی طرح ہی سمجھتے تھے۔ خصوصاً سمیر جب اسے سسٹر کہہ کر بلاتا تو اسے بہت اچھا لگتا۔ وہ ایک ہنس مکھ اور مہذب لڑکا تھا۔ کبھی سسٹر' کبھی امیج جی' کبھی بہنا کہہ کر بلایا کرتا۔

"تمہارے حصے کا کیک رکھا ہے لاؤں؟" ستارہ اٹھی۔

"نہیں...... اس وقت اسد کے ہاں بہت کھا پی کے آیا ہوں اور ہاں سسٹر۔" وہ امیج کی طرف مڑا۔ "آپ نے تو ہمیں بھلا ہی دیا۔ کبھی ویک اینڈ پر ہی آ جاتا ہے بندہ۔"

"نہیں ایسی تو بات نہیں ہے۔ بس وہ پڑھائی بہت ٹف ہے اس لیے۔"

"آہ......" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "ڈیئر سسٹر تارہ کا بھی یہی خیال ہے۔ آپ بھی یہی کہہ رہی ہیں اور مجھے اپنا مستقبل مخدوش دکھائی دے رہا ہے۔"

"کیوں......؟" امیج نے پوچھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"ظاہر ہے پاپا کی خواہش ہے کہ ان کا ہونہار سپوت بھی ڈاکٹر ہی بنے اور اِدھر تارہ بی بی نے تو مجھے میڈیکل کی پڑھائی کی ہولناک تصویریں دکھا دکھا کر ڈرا ہی دیا ہے۔"

"خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔" اصبح نے اسے تسلی دی۔ "جو پڑھنا چاہتے ہیں وہ پڑھ ہی لیتے ہیں۔"

"اور اپنی بہنا پڑھنا ہی نہیں چاہتیں۔"

"بالکل......" ستارہ نے فوراً کہا۔ "یہ تو پاپا کی خواہش ہے ورنہ میرا تو دل چاہتا تھا میں اردو میں ماسٹر کروں...... مگر مجبوری......" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اصبح کی طرف دیکھا۔

"اصبح ایزی ہو کر بیٹھ جاؤ نا۔"

وہ دونوں اس وقت ستارہ کے بیڈ پر ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ماریہ اور دوسری کلاس فیلوز تو چلی گئی تھیں' جبکہ ستارہ نے اسے زبردستی روک لیا تھا۔ آنٹی اور انکل نے بھی بہت کہا تھا۔ خود اس کا بھی دل چاہ رہا تھا۔ بابا جان بھی ادھر ہی تھے اور حویلی میں تو بابا جان سے کم ہی ملاقات ہوتی تھی اور ہوتی بھی تو یوں بے تکلفانہ گفتگو نہیں ہو سکتی تھی' جبکہ ڈاکٹر عبدالصمد خان کے گھر کا ماحول بہت مختلف تھا۔

بہت سال پہلے ان کے والد پشاور سے لاہور آ بسے تھے۔ وہ ڈرائی فروٹ کا کاروبار کرتے تھے' لیکن انہوں نے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی۔ ان کے دو بیٹے ڈاکٹر تھے۔ ایک بینکر اور ایک انجینئر' بیٹی بھی ڈاکٹر تھیں۔ جو شادی کے بعد امریکہ چلی گئی تھیں۔ جبکہ چاروں بیٹے پاکستان میں تھے۔ دو بیٹے تو مستقل لاہور میں ہی رہتے تھے جبکہ ایک کراچی میں رہتا تھا اور دوسرے کا ٹرانسفر ہوتا رہتا تھا' کبھی لاہور' کبھی اسلام آباد۔ آج کل وہ بھی لاہور میں تھا اور بقول ستارہ کے' چاچو یہاں ہوں تو بڑے مزے میں رہتے ہیں۔ ہم مہینے میں ایک بار تو ضرور اکٹھے ہوتے ہیں۔ ان کے گھر رات کے کھانے پر۔ ڈاکٹر عبدالصمد بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔

"میں ٹھیک ہوں۔" اصبح نے بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائی ہی تھی کہ بصیر کھلے دروازے سے اندر چلا آیا۔

"تارہ آپی' ماما بلا رہی ہیں آپ کو۔"

"کیوں......؟" ستارہ کا موڈ نہیں ہو رہا تھا اٹھنے کو۔

"مہمان آئے ہیں چائے بنا کر بھیجیں۔"

"کون آیا ہے پارٹنر......؟" سمیر خان نے پوچھا۔

"پاپا کے کوئی دوست ہیں اِدھر ڈرائنگ روم میں ہیں ان کی مسز بھی ہیں۔"

"پوچھا۔" ستارہ بے دلی سے اٹھی۔

"تم بیٹھو میں بنا دیتی ہوں۔" اصبح اٹھی۔

"بچی کالج سے آ کر کچن میں گھس گئی تھی اور اب بالکل موڈ نہیں ہو رہا کچن میں جانے کا لیکن مجبوری ہے۔ نسیم بانو بھی آج شام چھٹی کر گئی ہے۔"

"میں نے کہا نا میں بنا دیتی ہوں۔"

"چلو دونوں چلتے ہیں۔ تمہیں اب کیا پتا کہ کہاں کون سی چیز رکھی ہے۔" ان کے ساتھ ہی سمیر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں اِدھر ہوں ٹی' وی لاؤنج میں جب چائے بن جائے تو مجھے بتا دینا میں لے جاؤں گا۔"

"بابا جان بھی آ گئے ہیں کیا؟" اس نے اٹھتے ہوئے بصیر سے پوچھا۔

"ہاں...... وہ تو بہت پہلے آ گئے تھے اور پاپا سے گپ لگا رہے تھے۔"

بصیر بتا کر چلا گیا۔ وہ شام کو چائے پی کر کسی کام سے پہلے چلے گئے تھے اور تب سے ہی وہ ان کا انتظار کر رہی تھی کہ وہ آ جائیں تو وہ ان سے ڈھیر ساری باتیں کرے۔

"بھائی بھی کتنے پیارے ہوتے ہیں تارہ۔" کچن میں چائے دم کرتے ہوئے اس نے ستارہ کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" ستارہ ٹرالی میں اسنیکس رکھ رہی تھی۔

"سمیر مجھ سے چھوٹا ہے پھر بھی مجھے اس کے ہونے سے بڑے تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔ یوں میرے کزن وغیرہ بھی سب بہت محبت کرنے والے اور پیارے ہیں۔ تمہارے کزن کیسے ہیں؟"

"اچھے ہیں۔" اسے ایک دم شاہ زر اور امان اللہ یاد آ گئے۔ "بھائیوں والا مان دیتے ہیں لیکن ہم میں اتنی بے تکلفی نہیں ہے۔ اجی کو پسند نہیں' کاش میرا بھی کوئی بھائی ہوتا۔" اس

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

نے افسردگی سے سوچا۔ "یا پھر بہن ہی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ میرے آنے سے امی بھی کتنی اکیلی ہوگئی ہوں گی وہاں۔"

ٹرالی میں چائے لگا کر ستارہ نے سمیر کو آواز دی اور پھر دونوں ٹی وی لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئیں۔ ٹی وی پر کوئی ڈرامہ آ رہا تھا۔

"ارے...... یہ تو میرا فیورٹ ڈرامہ ہے۔ میں تو اس کی کوئی قسط مس نہیں کرتی۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ نورالہدیٰ شاہ میری فیورٹ ڈرامہ نگار ہے۔"

ڈرامہ دلچسپ تھا اور پُراثر بھی۔ اصبح بھی دھیان سے دیکھنے لگی۔ وہ ڈرامے میں اتنی کھوئی ہوئی تھیں کہ انہیں پتہ ہی نہ چلا کہ کب بابا جان اور ڈاکٹر عبدالصمد خان باتیں کرتے ہوئے لاؤنج میں آ گئے۔

"کیسی ہو اصبح بیٹی؟" عبدالصمد خان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ چونکی۔ جب سے وہ آئی تھی اس کی عبدالصمد خان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ سب سہیلیاں ستارہ کے کمرے میں ہی تھیں وہ گئیں تو باباجان اور ڈاکٹر صمد بھی کہیں چلے گئے تھے۔

"السلام علیکم انکل!" وہ کھڑی ہوگئی۔

"بیٹھو بیٹھو آرام سے ٹی وی دیکھو۔ پڑھائی ٹھیک ہو رہی ہے۔"

"جی۔"

"کوئی پرابلم تو نہیں؟"

"نہیں۔"

"میں نے تو کہا تھا وسیط خان سے کہ بھئی جیسی ستارہ ایسی اصبح اسے ہمارے پاس ہی رہنے دو۔ دونوں بہنیں اکٹھے کالج آیا جایا کریں گی لیکن تمہارے بابا جان بڑے ضدی ہیں۔" انہوں نے مڑ کر وسیط خان کی طرف دیکھا جو مسکراتے ہوئے دائیں طرف والے صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔ "بہرحال جب دل چاہے چلے آیا کرو یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔"

وہ وسیط خان کے پاس ہی جا کر بیٹھ گئے۔ وہ ابھی کھڑی ہی تھی کہ زریں آنٹی کسی سے باتیں کرتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔

"شمین خان!" وسیط خان بے اختیار کھڑے ہو کر بازو پھیلائے آنے والے شخص کی طرف بڑھے۔

شمین خان بھی تیزی سے آگے بڑھے تھے اور اصبح اپنی جگہ کھڑی شمین خان اور بابا جان کو گلے ملتے دیکھ رہی تھی اور کتنے سالوں بعد اس نے شمین خان کو دیکھا تھا۔ اگر بابا جان نام لے کر نہ بلاتے تو وہ پہچان نہ پاتی۔

شمین خان اس کے چھوٹے کاکا تھے لیکن وہ حویلی کبھی نہیں آئے تھے۔ امی نے اسے بتایا تھا کہ وہ ملک سے باہر رہتے ہیں۔ پہلی بار جب اس نے انہیں دیکھا تو وہ صرف چھ سال کی تھی۔ بی جی کی موت پر وہ آئے تھے اور دوسری بار جب آغا جان بہت بیمار پڑ گئے تھے تو وہ آئے تھے اور تب وہ پرائمری کے پیپرز کی تیاری کر رہی تھی۔ اسے چھوٹے کاکا بہت اچھے لگے تھے، بالکل باباجان کی طرح نرم خو اور محبت کرنے والے۔ گو انہوں نے اس سے زیادہ باتیں نہیں کی تھیں، لیکن کئی بار اس نے انہیں چوری چوری اپنی طرف دیکھتے پایا تھا۔ وہ زیادہ دن نہیں ٹھہرے تھے، لیکن جاتے ہوئے جس طرح انہوں نے اسے بانہوں میں لے کر پیار کیا تھا وہ اسے بھولتا نہیں تھا۔

"کیسے ہو شمین......؟" بڑی دیر بعد وسیط خان نے ان سے الگ ہوتے ہوئے پوچھا۔

ان کی آنکھیں ضبط کی کوشش میں سرخ ہو رہی تھیں، جبکہ شمین خان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی وہ دیکھ سکتی تھی۔

"آپ کیسے ہیں لالہ بہت کمزور لگ رہے ہیں؟" شمین خان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"اچھا ہوں، بچے اور بھابی کیسی ہیں؟"

"ٹھیک ہیں سب۔" شمین خان نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"تم اب پاکستان آ گئے ہو گے۔ یہاں سیٹل ہو گئے ہو تو حویلی کیوں نہیں آئے آغا جان اور لالہ یاد کر رہے تھے تمہیں۔" جواب میں شمین خان نے لمحہ بھر توقف کیا اور پھر ان کی طرف دیکھا۔

"آپ کب آئے لاہور...... میں کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ہی آیا ہوں گھر اور طاہرہ نے آپ کا پیغام دیا تو چلا آیا۔"

"طاہرہ اور بچوں کو بھی لے آتے۔" ڈاکٹر عبدالصمد نے کہا تو شمین خان نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"بس لالہ کا سنتے ہی چلا آیا۔ اتنے برس ہو گئے تھے ملے۔"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

’’مجھے تو یہاں آ کر پتا چلا کہ تم پاکستان آ چکے ہو تقریباً دو ماہ پہلے۔‘‘ وسیط خان کے لہجے میں شکوہ تھا۔ ’’کم از کم اطلاع تو کرتے۔‘‘

’’دو ماہ سے تڑپ رہا ہوں سب سے ملنے کو...... لیکن ہمت نہیں پڑتی لالہ۔‘‘

’’کب تک شین خاناں کب تک خود کو سزا دو گے۔ یہ خود ساختہ جلاوطنی کب تک؟‘‘ وسیط خان کے لہجے میں دکھ اتر آیا۔

چھوٹے کا کا نے کیا کیا ہے؟ کس بات کی سزا دے رہے ہیں خود کو؟ اصبح نے سوچا۔

’’میں وہاں کسی کا سامنا نہیں کر سکتا لالہ‘ میں اگر وہاں رہتا تو خود کو مار دیتا۔ اس لیے حویلی چھوڑ دی تھی‘ لیکن اب بچوں کی وجہ سے آنا پڑا۔ طاہرہ کی ضد تھی ورنہ۔‘‘ ان کی آواز کو بہت آہستہ تھی اور ٹی وی کی وجہ سے اور بھی مدھم ہو گئی تھی‘ لیکن اصبح نے سنا اور ان کا کرب اپنے دل میں اترتا محسوس کیا۔

شاید چھوٹے کا کا نے اپنی پسند کی شادی کی ہے اس لئے آغا جان ضرور ان سے ناراض ہوں گے۔ امی نے بتایا تھا اسے کہ طاہرہ شین خان کی بیوی کا تعلق پنجاب کے ایک زمیندار گھرانے سے ہے۔

’’ورنہ لالہ یہاں رہ کر خود کو سب سے دور رکھنا بہت اذیت ناک ہے۔‘‘

’’مت رکھو خود کو دور سب سے‘ کس نے کہا ہے تم سے ایسا کرنے کو۔‘‘ غیر ارادی طور پر وسیط خان کی آواز اونچی ہو گئی اور تب ہی ان کی نظر سامنے کھڑی اصبح پر پڑی تو انہوں نے شعوری کوشش سے خود کو سنبھالا۔

’’اصبح‘ ادھر آؤ اپنے کا کا سے ملو۔‘‘

شین خان چونکے۔ ’’اصبح!‘‘ اور مڑ کر پیچھے دیکھا۔

وہ جھجکتے ہوئے آگے بڑھی تو شین خان بے اختیار دو قدم آگے بڑھے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس کے سر پر رکھے ہاتھ کی واضح لرزش محسوس کر کے وسیط خان نے شین خان کا دوسرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔ جیسے ان کی ہمت بڑھا رہے ہوں اور پھر مسکرائے۔

’’اصبح یہاں میڈیکل کالج میں پڑھ رہی ہے صمد نے تمہیں نہیں بتایا؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ ان کی آنکھوں میں لحہ بھر کو حیرت سی اتری۔ ’’کون سے ایئر میں ہو؟‘‘ انہوں نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کر اصبح کی طرف دیکھا۔

’’ابھی چند دن ہوئے سیکنڈ ایئر کی کلاسز شروع ہوئی ہیں۔‘‘

اصبح نے بتایا اور واپس جا کر ستارہ کے پاس بیٹھ گئی جبکہ وسیط خان شین خان کا ہاتھ پکڑے پکڑے واپس صوفے پر بیٹھ گئے تھے اور اب دونوں دھیرے دھیرے باتیں کر رہے تھے۔ شین خان کبھی کبھی نظر اٹھا کر اس کی طرف بھی دیکھ لیتے تھے۔ ایک نرم اور مہربان سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر بکھر کر معدوم ہو جاتی۔

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ان کے پاس بیٹھے‘ ان سے باتیں کرے۔ ان سے چاچی اور بچوں کا پوچھے۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کے کتنے بچے ہیں؟ بی جی ان کا بہت ذکر کرتی تھیں اور ان کے بعد کشمالہ تائی بھی اکثر ان کا ذکر کرتی تھیں کہ شین ایسا تھا‘ شوخ شریر گھر آتا تو ہر طرف قہقہے بکھرتے رہتے تھے۔ کشمالہ نے بتایا تھا اسے کہ شین ایک روز دلبر کو پکڑ کر لایا تھا کہیں سے‘ تب دلبر اگرچہ بارہ تیرہ سال کا تھا لیکن نا سمجھ سا تھا۔ بس ٹکر ٹکر سب کو دیکھتا رہتا تھا۔ شین خان نے بتایا تھا کہ قبائلی دشمنی میں اس کا پورا خاندان ختم کر دیا گیا ہے اور یہ نہ جانے کیسے بچ گیا ہے اور بی جی نے اسے رکھ لیا تھا۔

بے چارہ بچہ...... اور تب سے ہی دلبر حویلی میں تھا‘ لیکن یہ اسے کسی نے نہیں بتایا تھا کہ شین خان نے ملک کیوں چھوڑ دیا‘ جبکہ اپنی زمین اور اپنے ملک سے انہیں بہت محبت تھی۔

وہ وطن کیوں نہیں آتے؟ اتنے ڈھیر سارے سالوں میں صرف دو بار یا بس کبھی کبھار آغا جان کے پاس فون آ جاتا تھا۔

’’چلو اٹھو‘ ماما کہہ رہی ہیں کھانا لگا دو۔‘‘ ستارہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک کر کھڑی ہو گئی۔

’’شین بھائی کھانا کھا کر جائیے گا۔ میں کھانا لگوا رہی ہوں۔‘‘ زریں آنٹی بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

’’ماما آپ بیٹھیں ہم لگا لیں گے۔‘‘ ستارہ نے کہا تو عبدالصمد خان نے زریں کی طرف دیکھا۔

’’بیٹھ جاؤ ڈیئر بیوی‘ بیٹی کی آفر سے فائدہ اٹھاؤ۔ کل کو پرائے گھر چلی جائے گی تو کس نے ایسی پرکشش آفر کرنی ہے۔ صاحب زادے کو تو ابھی سے ہی امریکہ کا مرض لاحق ہو گیا ہے۔‘‘

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

انہوں نے قہقہہ لگایا تو وسیط خان اور شین خان نے ایک ساتھ اصبح کی طرف دیکھا۔ جس نے ستارہ کے ساتھ چلتے چلتے مڑ کر مسکرا کر زریں آنٹی کی طرف دیکھا تھا' پھر دونوں نے ہی نظریں جھکا لیں۔ شین خان بے چینی سے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مرروڑ رہے تھے۔

"میں چلتا ہوں اب۔"

"نہیں نہیں شین بھائی کھانا کھا کر جایئے گا۔ سب کچھ تیار ہی ہے۔ ابھی بچیاں لگا دیتی ہیں۔" زرین بھابی نے کہا اور عبدالصمد خان نے بھی اصرار کیا تو وہ بے بس سے ہو کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد زریں بھی اٹھ کر کچن میں آ گئیں۔ ڈاکٹر صمد خان کا کوئی فون آ گیا اور لاؤنج میں صرف وسیط خان اور شین خان رہ گئے۔

شین خان انہیں ہولے ہولے اپنے پاکستان آنے اور یہاں آ کر صمد خان سے ملاقات کے متعلق بتانے لگے کہ کیسے طاہرہ نے اچانک ضد شروع کر دی کہ اب جبکہ بچے بڑے ہو رہے ہیں تو انہیں پاکستان چلے جانا چاہیے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ وہاں کے ماحول میں پلے بڑھیں۔

"میں دو ماہ سے سوچ رہا تھا کہ کیسے...... کیسے رابطہ کروں کیسے آؤں حویلی۔ آنے سے پہلے آغا جان سے بات بھی ہوئی' لیکن میں انہیں بتا نہ سکا کہ میں پاکستان آ رہا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ وہ پھر ضد کریں گے کہ حویلی آؤں۔"

"جو ہونا تھا وہ ہو چکا شین خان' اسے بدلا نہیں جا سکتا تھا' لیکن تم نے مجھے اکیلا کر دیا شین خاناں۔ مجھے تو تمہارے سہارے کی' تمہارے ساتھ کی ضرورت ہے۔ تم ہوتے تو پل پل میرا حوصلہ بڑھاتے' میں تو اندر سے بھربھری ریت کی دیوار کی مانند ہو گیا ہوں۔ شین خان مجھے تمہاری ضرورت ہے تمہارے سہارے کی' تمہارے ساتھ کی......"

انہیں کھانے کے لیے بلانے آتی اصبح نے سنا تو ٹھٹک کر رک گئی۔ بابا جان کی آواز سے چھلکتا کرب جیسے اس کے دل کو چھیلتا چلا گیا۔

ضرور بابا جان بیمار ہیں اور مجھ سے چھپا رہے ہیں۔ اپنے آنسوؤں کو بمشکل پیچھے دھکیلتی وہ ٹی وی لاؤنج میں آئی اور کھانا لگنے کی اطلاع دے کر تیزی سے باہر نکل کر ستارہ کے کمرے میں چلی گئی اور ستارہ کے بیڈ پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ اس کا دل کٹ رہا تھا اور لبوں پر ایک ہی دعا تھی۔

"نہیں...... نہیں میرے بابا جان نہیں...... اللہ میاں ان کو صحت...... زندگی دے۔" وہ رو رہی تھی اور دعا مانگ رہی تھی اور آنسو تھے کہ امڈے چلے آ رہے تھے۔

● ● ●

"اور میں نے لالہ کی شادی کے کتنے پروگرام بنا ڈالے تھے۔" شین خان بی جی کے سامنے بیٹھا منہ بسور رہا تھا۔ "اور پتا ہے آپ کو بی جی میں نے سب دوستوں کو پہلے سے ہی کہہ رکھا تھا کہ ان سب کو لالہ کی شادی میں اپنے علاقے میں بلاؤں گا۔"

"تو اب اپنی شادی پر بلا لینا دل چھوٹا نہ کر بچے۔" بی جی نے اسے تسلی دی۔

خود ان کی بھی یہی خواہش تھی کہ وہ بیٹے کی شادی بہت دھوم دھام سے کریں' لیکن انسان جو سوچتا ہے' وہ نہیں ہوتا۔ اچانک ہی لندن سے فون آیا تھا کہ ان کے چھوٹے لالہ کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ دل کا اٹیک ہوا ہے اور وہ اجازت طلب کر رہے تھے کہ بیٹی کا نکاح اور رخصتی کر دیں اور ایسے میں بھلا بی جی کیا کہتیں۔ بھائی کی بیماری کا سن کر ہی ان کا دل پانی ہونے لگا تھا۔ ان کے اختیار میں ہوتا تو خود اڑ کر پہنچ جاتیں' لیکن ممکن نہ ہو سکا اور لندن میں بہت سادگی سے وسیط کی شادی ہو گئی۔

"خیر' اب لالہ کا کیا پروگرام ہے کب آ رہے ہیں؟"

"فی الحال تو آنے کا کچھ نہیں بتایا۔ رات ہی تمہارے آغا جان سے بات ہوئی ہے اس لئے کہہ رہا تھا کہ ماموں کی طبیعت ابھی ٹھیک نہیں۔ اپنی جاب کے ساتھ ساتھ ان کا سٹور بھی دیکھ رہا ہوں اور مزید کسی کورس میں داخلہ بھی لے لیا ہے۔ دو سال تک تو آنے کا پروگرام نہیں ہے۔"

"اور یہاں میں جو اداس ہو رہا ہوں اتنا۔ اب تو مجھے شکل بھی بھولتی جا رہی ہے۔"

اس کی آواز بھرا گئی۔ اسے اپنے اس بھائی سے بڑی محبت تھی۔ عمروں میں چار پانچ سال کا فرق ہونے کے باوجود دونوں میں بے حد دوستی تھی۔

"تمہارے آغا جان نے کہا ہے اسے کہ چند دنوں کے لیے آ کر مل جائے۔ کہہ تو رہا تھا کوشش کروں گا جلد آنے کی۔"

"سچ!" شین خان نے بے ساختہ خوش ہو کر پوچھا۔

"ہاں سچ لیکن صرف دو ہفتوں کے لیے اور مستقل دو سال کے بعد آنے کا کہا ہے۔"

"بچی بی جی ان کے بغیر کچھ اچھا نہیں لگتا۔ اتنی ڈھیر باتیں جمع ہو گئی ہیں نا دل میں' اب تو لگتا ہے کسی دن دل پھٹ جائے گا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو خدا نہ کرے' بڑے بھائی سے بات کر لیا کر۔"

"لالہ سے......" اس نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "اب میں نے انہیں ا رومانس سنا کر قتل ہونا ہے ان کے ہاتھوں۔"

بی جی نے اسے چپت لگائی۔ "الٹی سیدھی ہانکتا رہا کر۔"

"تو وہاں تم پڑھنے کے بجائے رومانس کرتے ہو؟" کشمالہ نے اندر کمرے میں آ ہوئے پوچھا۔

"ارے توبہ بھابی جان میں تو بڑا شریف بندہ ہوں۔" وہ خالص لاہوری انداز میں ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" بی جی نے پوچھا۔

"ذرا آغا جان کے پاس اوطاق میں بیٹھوں گا۔"

"لیکن آغا جان تو زرک کاکا کی طرف گئے ہیں۔" کشمالہ نے بتایا۔

جب سے زرک خان آیا ہے تمہارے آغا جان کو چین نہیں آتا ان سے ملے بنا۔ میں ضرور ایک چکر لگاتے ہیں اِدھر کا۔" بی جی نے شمین خان کی طرف دیکھا۔ جس کی آنکھ میں یک دم ہی چمک آ گئی تھی۔

"میں بھی اِدھر ہی جا رہا ہوں بی جی' رات گیا تھا تو مقصود نہیں ملا تھا۔"

"اچھا جاؤ پر جلدی پلٹنا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل ہولتا رہتا ہے۔ گو زرک لالہ تو تمہار آغا جان کے بہت اچھے دوست ہیں' پھر بھی اس کے چچا اور چچا کے بیٹوں سے خوف آتا مجھے۔"

"مگر کیوں بی بی؟" وہ جاتے جاتے رک گیا۔

"تمہارے آغا جان بتا رہے تھے کہ وہ زرک خان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اس چچا زاد فیروز خان آ گیا اور زرک خان کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ زرک خان جانتا ہے تیر یار نے اپنے بیٹے کا بیاہ تیرے دشمنوں کے خاندان میں کیا ہے۔ پوچھ اس سے امید خان دلور کہاں سے ہے؟"

"تو زرک خان نے کیا کہا؟" شمین خان کی پیشانی پر لکیریں سی پڑ گئیں اور لہجے میں تشویش اتر آئی۔

"کچھ نہیں' اس نے فیروز خان کو ڈانٹ دیا کہ فضول باتیں نہ کرے۔ تمہارے آغا جان نے پہلے ہی روز زرک لالہ کو امید خان کی شادی کا احوال بتا دیا تھا۔ یوں بھی زرک لالہ اور طرح کا آدمی ہے۔ وہ ان قبائلی دشمنیوں سے سخت نفرت کرتا ہے۔ تب ہی تو وطن چھوڑ گیا تھا' مگر اب بیٹی کی وجہ سے آنا پڑا۔"

شمین خان کے ہونٹوں پر ایک دل فریب سی مسکراہٹ بکھر گئی اور پیشانی کے بل مٹ گئے اور اس نے ایک گہری اطمینان بھری سانس لی۔

"زرک کاکا کی حویلی میں آغا جان کو اور مجھے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔" اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

دو ماہ قبل جب وہ آیا تھا تو آغا جان کے ساتھ زرک خان سے ملنے گیا تھا۔ مقصود زرک کا بڑا بیٹا بچپن میں اس کا دوست تھا۔ وہ دونوں اکٹھے غلیل لے کر ٹیلے پر بیٹھ کر پرندوں کے نشانے لیتے تھے۔ ذرا باشعور ہوئے تو ایک روز نشانہ باندھتے ہوئے اچانک ہی مقصود خان نے غلیل پھینک دی۔

"آخر ان معصوم پرندوں کو مار کر کیا ملے گا ہمیں؟"

"ہاں یہ تو ظلم ہے نا۔" شمین خان نے بھی غلیل پھینک دی۔

چھ سات سال کی عمر میں دونوں کی یہ مشترکہ سوچ ہی تھی کہ پھر اس کے جانے کے بعد بھی شمین خان مقصود کو نہیں بھولا تھا۔ گو اٹھارہ سال کوئی رابطہ نہیں رہا تھا' پھر بھی وہ ان کی آمد کا سن کر آغا جان کے ساتھ ان کی حویلی جا پہنچا تھا۔ باہر اوطاق میں ہی مقصود اسے مل گیا تھا اور وہ یوں ایک دوسرے سے ملے جیسے بیچ میں اٹھارہ سال گزرے ہی نہ تھے۔

نیلی جینز پر میرون شرٹ پہنے مقصود گو اجنبی لگ رہا تھا' لیکن دل ایک ساتھ دھڑک رہے تھے۔ زرک خان نے بھی دلچسپی اور محبت سے اسے دیکھا۔

"یہ شمین خان ہے سب سے چھوٹا۔" آغا جان نے تعارف کروایا۔

عادات و مزاج میں بالکل تیرے پر گیا ہے اور تیری ہی طرح انگریزی ادب میں ماسٹر کر رہا ہے۔"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"ارے واہ!" زرک خان نے بھی اٹھ کر اسے گلے لگا لیا تھا۔

اسے بھی زرک خان بہت اچھے لگے تھے اور پھر جتنے دن وہ حویلی میں رہا زرک خان کی طرف جاتا رہا۔ کبھی اکیلا' کبھی آغا جان کے ساتھ۔ زرک خان کے ساتھ گفتگو کر کے اسے مزہ آتا تھا۔ شیکسپیئر سے لے کر شیلے اور بائرن تک کو وہ ڈسکس کر دیتے تھے۔ ایلیٹ کی Waste Land سے شروع ہو کر بات شیکسپیئر کی میکبتھ تک جا پہنچتی اور وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلتا۔ مقصود برے برے منہ بناتا رہتا۔

"یار! دوست تو میرا ہے یا بابا جان کا؟"

"یار تیرے بابا جان نے میرا دل اپنی مٹھی میں لے لیا ہے۔"

"اور میرا دل جو تیری مٹھی میں ہے اس کا کیا ہوگا؟"

"میری مٹھی میں...... میں سمجھا وہاں کسی میم کی جھولی میں ڈال آیا ہوگا۔"

وہ شرارت سے مقصود کی طرف دیکھتا تو مقصود مسکرا دیتا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا جب اٹھارہ سال پہلے وہ اسے رخصت کرنے آیا تھا تو مقصود نے کہا تھا۔

"شٹین خان مجھے بھولنا نہیں میں اپنے دل میں ہمیشہ تمہیں یاد رکھوں گا۔"

وہ اوطاق سے اٹھتا تو مقصود کے ساتھ گھومنے نکل جاتا۔ کسی ٹیلے پر بیٹھ کر بچپن کی طرح ڈوبتے سورج کا منظر دیکھتے ہوئے وہ کھو سا جاتا۔

ایسی ہی ایک شام کو جب وہ مقصود کے ساتھ ٹیلے پر بیٹھا تھا کہ اچانک اس کی نظر کچھ فاصلے پر ایک چھوٹے سے ٹیلے پر بیٹھی ماہ نور پر پڑی تھی۔ تب ہی مقصود نے بھی اس کی طرف دیکھا تھا اور آواز دی تھی۔

"ماہ نور...... ماہ نور تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

ماہ نور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ گو وہ شلوار قمیص میں تھی' لیکن اس کا لباس علاقائی تھا نہ ہی اس نے چادر اوڑھ رکھی تھی' بلکہ سر پر ریڈ کلر کا سکارف سا تھا اور لیدر کی جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ بے پروائی سے مقصود کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے نقوش بہت دلآویز تھے۔ رنگت میں گلابی پن تھا اور سنہری بالوں کی لٹیں اسکارف سے باہر نکل کر اس کے رخساروں اور پیشانی کو چوم رہی تھیں۔

"یونہی دل گھبرایا تو نیچر کا نظارہ کرنے باہر چلی آئی۔"

"گھر جاؤ' بابا جان نے دیکھا تو ناراض ہوں گے۔ یہاں چادر کے بغیر باہر مت نکلا کرو۔ شکر ہے کسی نے دیکھا نہیں۔" مقصود کی آواز میں نرمی تھی۔ "پچھلی طرف سے چلی جاؤ۔"

"ادھر سے ہی آئی بھی ہوں۔"

"یہ ماہ نور ہے میری بہن اور یہ شٹین خان ہے۔ میرا دوست بھی اور عزیز بھی......" اس نے کسی کو مخاطب کیے بغیر کہا اور اسے جانے کا اشارہ کیا۔

"یہ ابھی اولیول بھی نہیں کر سکی تھی کہ بس بابا جان نے اچانک ہی واپسی کا پروگرام بنا لیا۔" مقصود نے بتایا۔

"اسے اپنی تعلیم ادھوری رہ جانے کا بہت دکھ ہے۔ دکھ مجھے بھی ہے لیکن......" مقصود خاموش ہو گیا۔

اسے ٹیلے پھلانگتا ہوا دیکھ کر شٹین خان چونکا۔ "یہاں بھی تعلیم تو حاصل کی جا سکتی ہے۔"

"ہاں...... بابا بھی چاہتے تھے کہ اسے پشاور میں کسی اچھے سکول میں داخل کروا دیں' لیکن فیروز خان کاکا نے بڑے آغا خان نے سب نے ہی شدید مخالفت کی ہے' بلکہ فیروز کاکا تو کہہ رہے تھے کہ اس کی شادی کر دیں فوراً۔ بھلا ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے؟ پندرہ سال۔

میں نے تو بابا سے کہہ دیا ہے کہ بھلے ماہ نور تعلیم حاصل نہ کرے' لیکن ابھی شادی ہرگز نہیں کرنی کم از کم اٹھارہ سال کی تو ہو جائے۔ مجھے بلکہ ہم سب کو ماہ نور بہت عزیز ہے۔ بابا کی تو لاڈلی ہے وہ۔"

"لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں بابا مجبور نہ ہو جائیں۔" مقصود بہن کے خیال سے کچھ افسردہ ہو گیا تھا۔

خود وہ الیکٹریکل انجینئر تھا اور وہاں ایک سال قبل ہی اس نے ایک مشہور فرم میں جاب شروع کی تھی۔ دونوں چھوٹے بھائی چونکہ پڑھ رہے تھے اس لیے وہ وہاں پر ہی تھے جبکہ خود وہ دو ماہ بعد واپس جا رہا تھا اپنی جاب پر۔

"بے فکر رہو مقصود یار کاکا کو کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔ ماہ نور ان کی بیٹی ہے وہ اس کے متعلق جو چاہے فیصلہ کریں۔"

"بابا تو چاہتے ہیں کہ وہ کم از کم انٹرنس کر لے۔ خیر' چلو کوئی اور بات کرو۔ تم بھی کہو

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

گے کیا قصہ لے بیٹھا ہوں۔"

مقصود نے بچپن سے لے کر جوانی تک کا سارا وقت ہی باہر گزارا تھا۔ اس کی سوچ اور فکر میں وسعت تھی اور اس نے ماہ نور کا ثمین خان سے تعارف کروانے میں کوئی حرج نہیں سمجھا تھا' لیکن اب وہ پریشان سا ہو گیا تھا۔ اگر ماہ نور نے کسی سے ذکر کر دیا اور بات فیروز خان یا بڑے آغا تک پہنچی تو......

"خیر' ماہ نور کو جاتے ہی سمجھا دوں گا۔" اس نے خود کو بہلایا۔ ثمین خان بھی شاید اچانک اس کے پریشان ہونے کی وجہ جان گیا تھا۔ بنا کچھ کہے ہولے سے اس کا ہاتھ دبا کر اس نے اسے اعتماد دیا اور اس کا ذہن بٹانے کے لیے پوچھا۔

"آغا جان کہہ رہے تھے کہ زرک کا کا تمہاری شادی کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔"

"ہاں بابا نے ذکر تو کیا تھا۔" وہ افسردگی سے مسکرایا۔

"میں نے تو سمجھا تھا کہ تم نے کوئی میم پھانس لی ہوگی' بلکہ کسی میم نے تمہیں پھانس لیا ہوگا۔ سچ بتا کوئی ہے تو نہیں وہاں؟"

"ہاں ہے تو۔" وہ مسکرایا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ٹریسی آ گئی تھی۔ اس کی بادامی زلفیں' اس کی نیلی آنکھیں اور اس کی وہ والہانہ چاہت۔

"ٹریسی میری کلاس فیلو تھی اور ہمارے درمیان بہت انڈر اسٹینڈنگ بھی ہے' یقین کرو دوست بہت مخلص' بہت مہربان اور محبت کرنے والی لڑکی ہے۔ اگر میں بابا کے ساتھ کسی عہد کا پابند نہ ہوتا تو ضرور اسے اپنی زندگی میں شامل کر لیتا۔ تمہیں سچ بتاؤں اس کے بنا میں ادھوری زندگی گزاروں گا۔ آدھی' نامکمل زندگی۔"

"بابا کے ساتھ عہد!" ثمین نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "کیا وہ تمہاری شادی کسی عزیزہ سے کرنا چاہتے ہیں۔ تمہاری چچازاد یا تایازاد سے......"

"پتا نہیں۔" مقصود ابھی تک افسردہ تھا۔ "مجھے بابا نے کبھی نہیں بتایا' لیکن انہوں نے مجھے بہت پہلے سمجھا دیا تھا کہ مجھے کہیں اِدھر اُدھر نہیں دیکھنا۔ انہوں نے میرے لئے اپنے دل میں بہت پہلے سے کچھ طے کر رکھا ہے۔ جب وہ یہاں سے گئے تھے تب سے۔ وہ کون ہے؟ کیسی ہے؟ میں نے کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی۔ میرے لیے کچھ فرق نہیں پڑتا وہ کوئی بھی ہو۔ ٹریسی نہیں تو جو بھی ہو۔ محض ایک بندھن جسے نبھانا ہے میں نے۔"

اس کی خوبصورت آنکھوں میں اداسی اور جدائی کے رنگ گھل مل رہے تھے اور سامنے افق کے کنارے پر سورج غروب ہو گیا تھا۔ ہلکی سرخی تھی ثمین خان کو شام بہت اداس لگی۔

"تم اس سے بہت محبت کرنے لگے ہو ٹریسی سے؟"

"ہاں...... حالانکہ میں نے اس سے خود کو بہت روکا۔"

ثمین خان نے ہولے سے اس کا ہاتھ دبایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "چلو اٹھو اینڈ چیئر اپ ناؤ...... اور ہاں میں ہفتہ بھر اور ہوں یہاں۔ کل تم کھانا میرے ساتھ ہی کھانا۔ بڑے لالہ شکار کرنے جا رہے ہیں۔ میں اِدھر نہیں آ سکوں گا اور تمہارا پروگرام جب بنے واپسی کا تو مل کر جانا' بلکہ مجھے فون کر دینا لاہور' میں آ جاؤں گا۔"

"او کے۔" اس نے سر ہلا دیا۔

جب اس سے مصافحہ کر کے ثمین خان ٹیلے سے اتر کر اپنی حویلی کی طرف آ رہا تھا تو اچانک ہی تصور میں وہ چلی آئی۔ بے پروائی سے جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ثمین کی طرف دیکھتی...... ٹیلے پھلانگتی ہوئی...... بالوں کی سنہری لٹوں کو ہاتھوں سے پیچھے کرتی۔ گلابی لبوں کو دانتوں تلے دباتی۔ اتنی معصومیت' اتنا پاکیزہ حسن۔

ثمین خان کے دل کی دھڑکنوں میں ارتعاش سا پیدا ہوا۔ لمحہ بھر کو تو وہ خود بھی حیران رہ گیا تھا پھر ہولے سے سر کو جھٹک کر وہ اپنے راستے پر چل پڑا' لیکن ماہ نور نے اس کے دل کی دنیا میں کہیں ہنگامہ ضرور کر دیا تھا۔ رات بستر پر لیٹتے ہوئے اس نے بڑی شدت سے خواہش کی کہ وہ ایک بار اور اسے دیکھے۔ زیادہ دیر تک اور اسے دیکھے ہی نہ بلکہ اس کے حسن کلام سے بھی لطف اندوز ہو۔ کیسی خواہش تھی' ناممکن سی' لیکن کبھی کبھی ناممکن خواہشیں بھی اچانک پوری ہو جاتی ہیں۔

وہ مقصود سے ہی ملنے جا رہا تھا' کیونکہ صبح اسے واپس لاہور جانا تھا۔ ابھی سامان پیک کرنا تھا اور حویلی سے نکلتے ہوئے بی جی نے اسے تاکید کی تھی کہ وہ جلدی آئے کیونکہ لندن سے وسیط کا فون آنے والا تھا۔

"کل بھی اس نے فون کیا اور تم نہیں تھے۔"

"ابھی تو وہاں صبح کے آٹھ بجے ہوں گے میں گھنٹے تک آ جاتا ہوں مقصود سے مل کے۔"

بی جی کو بتا کر وہ حویلی سے نکل آیا تھا اور جلدی کے خیال سے اس نے شارٹ کٹ استعمال کیا تھا۔ وہ ٹیلوں کو پھلانگتا ہوا نیچے اترا۔ یہ ایک وسیع میدان تھا اور اس میدان میں بے ترتیبی سے درخت اور جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ ایک طرف چھوٹی سی پگڈنڈی تھی جو زرک خان کی اوطاق کی طرف جاتی تھی۔ وہ جھاڑیوں سے بچتا بچاتا تیز تیز چلا جا رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر سامنے والے درختوں پر پڑی۔ ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے ماہ نور بیٹھی تھی اور اس کے قریب ایزل پر لگے کینوس پر ایک نامکمل سا منظر تھا اور اس کے قریب ہی رنگ اور برش پڑے تھے۔ وہ بالکل غیرارادی طور پر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"السلام علیکم!" ماہ نور جو جانے کس سوچ میں تھی ایک دم چونک کر کھڑی ہو گئی اور کندھے سے ڈھلک جانے والی سیاہ چادر کو اس نے جلدی سے درست کیا اور نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ لمحہ بھر یونہی دیکھتی رہی، پھر نظریں جھکا لیں۔

"میں شین خان ہوں اس روز مقصود خان نے تعارف کروایا تھا۔"

"جی مقصود خان لالہ تو یہاں کی روایات نہیں جانتا تھا، لیکن آپ تو جانتے ہیں پھر یہاں آنے کا مقصد......؟" اس نے یورپ میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی تھی سو اس میں بلا کی خوداعتمادی تھی۔ شین خان مسکرا دیا۔

"کچھ باتیں زبان سے نہیں کہی جا سکتیں انہیں صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال آپ کی یہاں کی روایات سے آگاہی اچھی لگی۔ اپنی اس بے اختیاری پر معذرت خواہ ہوں۔"

وہ مڑا تو بے اختیار ہی ماہ نور کے لبوں پر نکلا۔ "پلیز مائنڈ مت کیجیے گا مجھے لالہ نے ہی سمجھایا ہے سب۔" کچھ دیر پہلے انتہائی بولڈ نظر آنے والی لڑکی اب بے حد معصوم اور سادہ لگ رہی تھی۔ شین خان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"تو کیا مقصود نے یہ نہیں بتایا کہ اس طرح گھر سے باہر نکل کر مت بیٹھا کریں۔ کوئی بھی اس راستے سے گزر سکتا ہے۔"

"وہ دراصل میں تو بہت سویرے آئی تھی اور یہ منظر پینٹ کرنا چاہ رہی تھی۔ یہاں سے یہ درختوں کا جھنڈ اور اس کے پیچھے سرمئی پہاڑ اور ان پر ابھرتا سورج۔ یہ منظر بہت فیسی نیٹ کرتا تھا مجھے، میرا خیال تھا میں جلدی جلدی ڈرا کر کے چلی جاؤں گی اتنے سویرے تو ادھر کوئی

نہیں آتا نا......مگر دیر ہو گئی۔"

"آپ پینٹنگ کرتی ہیں؟" اس نے ادھورے بنے منظر کو دیکھا۔

"ہاں مجھے شوق ہے، لیکن ابھی میں بہت اچھا کچھ بھی نہیں بنا سکتی۔ میں نے ابھی سال بھر پہلے ہی پینٹنگ کی کلاس لینی شروع کی تھی اور بابا جان یہاں آ گئے۔"

اس کے خوب صورت چہرے پر ملال سا دکھائی دیا اور وہ جھک کر اپنی چیزیں سمیٹنے لگی تو شین خان اللہ حافظ کہتا ہوا پگڈنڈی کی طرف بڑھ گیا اور موڑ مڑنے سے پہلے اس نے پلٹ کر دیکھا، وہ بھی اِدھر ہی دیکھ رہی تھی۔ دل میں عجیب سے احساسات لیے وہ آگے بڑھ گیا اور پھر لاہور آ کر بھی وہ ان احساسات سے پیچھا نہیں چھڑا سکا۔

آنکھیں بند کرتا تو اس کی شبیہ سامنے آ جاتی۔ کھولتا تو اس کا تصور ذہن کے پردے پر جھلملانے لگتا۔ پڑھنے بیٹھتا تو بھول جاتا کہ کیا پڑھنا ہے، لفظ گڈمڈ ہو جاتے۔

"اُف یہ کیا مصیبت ہے......؟" ایک روز اس نے کتاب اٹھا کر پھینک دی۔

"اسے مصیبت نہیں محبت کہتے ہیں۔" اس کا روم میٹ جو کئی روز سے اس کی کیفیات نوٹ کر رہا تھا، اپنے بیڈ سے اٹھ کر اس کے سامنے آ بیٹھا۔

"شٹ!" اس نے ناراضی سے اسے دیکھا۔ "یہ کیا بکواس ہے؟"

"یہ بکواس نہیں پیارے محبت ہے۔ اب بتاؤ کون محترمہ ہیں اور کیا حدود اربعہ ہے ان کا......"

اس کے لبوں پر بے اختیار ماہ نور کا نام آتے آتے رہ گیا۔ "تو کیا مجھے ماہ نور سے محبت ہو گئی ہے؟" اس نے بے حد حیران ہو کر سوچا۔

"یہ کیسے ممکن ہے بھلا محض دو بار دیکھنے سے اور وہ بھی ایک پندرہ سالہ کم عمر لڑکی سے۔" وہ تو بی جی سے اکثر کہا کرتا تھا کہ اسے اپنے سے دس سال چھوٹی ماموں زاد سے ہرگز شادی نہیں کرنی، بلکہ کسی اپنی ہم عمر میچور لڑکی سے شادی کروں گا اور ماہ نور دس سالہ نہ سہی چھ سات سال تو ضرور چھوٹی ہو گی اور اس کا دل کیا خواہش کرنے لگا تھا۔

"سب کچھ ممکن ہے میرے یار! دل تو گدھی پر آ جاتا ہے۔" اس کا دوست بھی ایک ہی کائیاں تھا۔

"فار گاڈ سیک ارسلان خالق یہ محاورہ اب تو بہت گھسا پٹا......اور پرانا ہو چکا ہے اور

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

میں اس سے سخت الرجک ہوں۔ کم از کم کسی انسان کا دل تو کسی گدھی پر ہرگز نہیں آ سکتا۔"

"یار! کیا وہ بہت حسین ہے؟" ارسلان خالق نے بائیں آنکھ کا کونا دبایا تو اس کا قبائلی خون یک دم جوش میں آ گیا اور بمشکل اس نے خود کو سنبھالا' لیکن خون کی حدت رخساروں پہ جھلک آئی تھی۔

"لیو دا ٹاپک! پلیز......"

ارسلان کو تو اس نے خاموش کرا دیا تھا' لیکن خود جتنے دن وہاں رہا تھا بے چین و مضطرب ہی رہا تھا اور اب جب سے حویلی آیا تھا۔ دو بار مقصود سے ملنے جا چکا تھا لیکن نہ تو مقصود ہی ملا تھا اور نہ ہی ماہ نور کہیں دکھائی دی تھی۔ مقصود تو اپنے ٹکٹ وغیرہ کنفرم کرانے کے چکر میں اسلام آباد گیا ہوا تھا اور ماہ نور...... پتا نہیں اب کبھی وہ اسے دیکھ بھی پائے گا یا نہیں۔

اس کے ہونٹوں پر بکھری مسکراہٹ ہولے ہولے معدوم ہو گئی اور اس نے تھوڑا سا جھک کر بی جی کا ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگایا۔ "بی جی میرے لیے خصوصی دعا کیا کریں۔"

"ارے بچے میں تو سب کے لیے ہی خصوصی دعا کرتی ہوں۔" بی جی نے ایک شفیق سی نظر اس پر ڈالی۔

"اس خصوصی دعا کا نام بھی بتا دو ثمین لالہ۔"

کشمالہ نے سرگوشی کی تھی' بی جی تو نہ سن سکیں' لیکن ثمین خان نے سن لیا اور مسکرا کر کشمالہ کی طرف دیکھا۔

"آپ سے تو میں آ کر بات کروں گا۔"

کشمالہ ہنس دی۔ شریر سی ہنسی اور وہ کشمالہ کی بات اور اس کی ہنسی پر غور کرتا ہوا باہر کی طرف بڑھ گیا۔

***

پھر وہی تاریک زندان تھا اور وہ تھی۔ گہری تاریکی اور گھٹن۔ وہ بے چینی سے اس بند تاریک تہہ خانے میں بھاگ رہی تھی۔ کوئی روزن' کوئی کھڑکی' کہیں سے روشنی کی کوئی کرن کوئی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا' مگر نہ کوئی روشنی تھی اور نہ ہی کہیں سے ہوا کا گزر ہو رہا تھا۔ نڈھال سی ہو کر وہ تہہ خانے کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گئی اور گھٹنوں میں چہرہ چھپا کر ہولے ہولے سسکنے لگی۔ لمحہ لمحہ اس کی سسکیوں میں اضافہ ہو رہا تھا' پھر وہ زور زور سے رونے لگی۔ تیز اور

تیز......

"اصبح...... اصبح......" اجی نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔

"کیا ہوا...... کیا ہوا ہے آنکھیں کھولو......؟"

"اجی جان!" وہ اپنے کمرے میں تھی اور اجی اس پر جھکی ہوئی تھیں اور وہ تاریک تہہ خانہ' اس نے رخساروں پر ہاتھ لگایا' جو گیلے ہو رہے تھے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ہزار دفعہ کہا ہے آیت الکرسی اور چاروں قل پڑھ کر سویا کرو۔" اجی نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر اس پر پھونکا۔

لیکن وہ انہیں کیا بتاتی کہ پڑھنے کے باوجود یہ خواب تو اسی طرح تواتر سے آتا رہتا تھا۔

"اچھا' اب سو جاؤ۔" اجی نے واپس اپنی چارپائی کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"اجی!" اس نے ہاتھوں کی پشت سے اپنے رخسار صاف کیے۔ "یہ...... یہ خواب بار بار کیوں آتا ہے مجھے' میں بہت ڈر جاتی ہوں اجی۔" اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ خواب مجھے نہ آیا کرے۔ کوئی علاج نہیں ہے اس کا۔"

"کہا تو ہے چاروں قل پڑھ کر سینے پر پھونک مار کر سویا کرو۔" لیکن اس نے جیسے ان کی بات سنی ہی نہیں۔

"اجی! آپ کو پتا ہے ہمارے خوابوں کا تعلق ہمارے ماضی یا مستقبل سے ہوتا ہے۔"

"محض پریشان خیالی ہے۔" اجی نے اسے تسلی دی۔ "خواب ذہن کی پریشانی کے سبب سے آتے ہیں۔"

"مگر اجی ایک ہی خواب بار بار آتا۔ وہی خواب جو بچپن سے دیکھتی آ رہی ہوں' تاریک زندان اور پیاس سے دم گھٹتا ہوا۔" اس نے اپنی چارپائی پر بیٹھی اجی کی طرف دیکھا۔

"اجی کہیں یہ مستقبل میں ہونے والے کسی واقعہ کی طرف تو اشارہ نہیں ہے۔" وہ زرد ہو رہی تھی۔

"مجھے اس لمحے سے بہت ڈر لگتا ہے جب میں کسی ایسے ہی تاریک زندان میں ڈال دی جاؤں گی اور پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤں گی...... لیکن اجی مجھے بھلا کوئی کیوں زندان میں ڈالے گا۔"

امی نے اپنے سوکھے لبوں پر زبان پھیری۔ ان کا رنگ بے حد سفید ہو رہا تھا اور آنکھوں کے پیالے پانیوں سے بھرے تھے۔

"میں نے کہا نا ایسے خواب محض پریشان خیالی ہوتے ہیں۔ سو جاؤ اب......" انہوں نے چارپائی پر لیٹ کر کروٹ بدل لی' لیکن اصبح نے ان کی آنکھوں میں چمکتے آنسو دیکھ لیے تھے' کیا امی رو رہی ہیں' اس نے بے حد پریشان ہو کر سوچا۔

بابا جان کے کچھ مہمان آئے ہوئے تھے پشاور سے اس لیے وہ باہر ہی ٹھہر گئے تھے اور وہ امی کے کمرے میں ہی سو گئی تھی۔ چند دن پہلے ہی وہ سیکنڈ ایئر کے ایگزام دے کر آئی تھی۔ صرف ایک ماہ کی چھٹی تھی۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ امی پہلے سے زیادہ کمزور ہو گئی ہیں اور چپ بھی۔

اور اب امی رو رہی تھیں۔ وہ اپنی چارپائی سے اٹھ کر ان کی چارپائی پر آ بیٹھی۔ یہ بڑا کمرہ پہلے بی جی کا ہوتا تھا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے پایوں والی چارپائیاں بچھی تھیں۔ جن پر رنگین کھیس بچھے تھے۔

"امی!" اس نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "آپ رو رہی ہیں؟"

"ہاں...... نہیں تو۔" انہوں نے جلدی سے ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کیے۔

"ادھر دیکھیں امی!" اس نے ان کا رخ اپنی طرف کیا۔

"میں آپ کی بیٹی ہوں نا...... پھر آپ مجھ سے کچھ کیوں چھپاتی ہیں۔ کیا آپ کو بابا جان سے کوئی شکایت ہے؟"

"نہیں...... نہیں تو ان سے بھلا کسے شکایت ہو سکتی ہے۔ وہ تو بہت اچھے ہیں۔"

"پھر آپ کیوں رو رہی تھیں؟"

"مجھے تمہارے خواب سے ڈر لگ رہا تھا۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ اصبح کا ہاتھ خود بخود ان کے کندھے سے ڈھلک کر بیڈ پر آ گیا۔

"کیوں امی......؟"

"بیٹیوں کی قسمت اور نصیب سے خوف آتا ہے۔"

"مگر ابھی تو آپ مجھے سمجھا رہی تھیں۔" اصبح ان کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"ہاں...... لیکن ماں ہوں نا پریشان ہو جاتی ہوں۔"

"امی!" اصبح کو ان پر بے حد پیار آیا۔ اس نے بے اختیار اپنی بانہیں ان کے گلے میں ڈال دیں۔

"امی! قبل از وقت کیا پریشان ہونا۔ بس دعا کیا کریں میرے لئے' اپنے لیے' بابا کے لیے اور سب کچھ خدا پر چھوڑ دیں۔" خواب کا خوف اب ختم ہو چکا تھا اور وہ امی کو تسلیاں دے رہی تھی۔

"دعا۔" ان کے لب ہلے اور جیسے انہوں نے زیر لب کہا۔ "دعائیں تو نہ جانے کب سے' نہ جانے کب سے کر رہی ہوں۔"

"جی امی دعا۔" اصبح مسکرائی۔

"ہونا تو وہی ہے نا امی! جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔ ہم تو بس دعا ہی کر سکتے ہیں۔"

"ہاں' ہم تو بس دعا ہی کر سکتے ہیں۔" امی نے آہستگی سے کہا اور سوچا۔ "کیا خبر کوئی معجزہ' کوئی انہونی ہو جائے اور......" ایک گہری سانس لے کر انہوں نے اصبح کی طرف دیکھا۔

"اچھا اب جا کر سو جاؤ۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔"

وہ اپنی چارپائی پر آ کر لیٹ گئی' لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ سمجھتی تھی پتا نہیں امی اور بابا جان کے بغیر وقت کیسے گزرے گا' لیکن دو سال گزر گئے تھے اور پہلے سال میں بھی اس نے بہت اچھے نمبروں کے ساتھ سارے پیپرز کلیئر کر لیے تھے اور اس سال بھی پیپر بہت اچھے ہوئے تھے' جبکہ ماریہ کی ایک پیپر میں سپلی لگ گئی تھی۔ حالانکہ بابا جان کی وجہ سے وہ بہت اپ سیٹ رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں اس کے دل میں یہ وہم بیٹھ گیا تھا کہ بابا جان کو ضرور کوئی خطرناک بیماری ہے۔ اس لیے تو اس نے ضد کی تھی کہ وہ کسی اسپیشلسٹ کو دکھائیں اور اپنے تمام ٹیسٹ کروائیں اور امی کو بھی کہا تھا کہ بابا جان اپنی بیماری چھپا رہے ہیں۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" امی کو حیرت ہوئی تھی۔

"وہ چھوٹے کاکا سے کچھ ایسی ہی بات کر رہے تھے کہ انہیں اس وقت شین خان کاکا کی اور ان کے سہارے کی ضرورت ہے۔" وہ بابا جان کے ساتھ ہی حویلی واپس آئی تھی اور امی کو کہہ رہی تھی کہ وہ بابا جان سے کہیں کہ وہ کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھائیں اور امی نے ایک

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

گہری سانس لے کر اسے دیکھا تھا۔

''شمین لالہ تمہیں کہاں ملے تھے؟''

''انکل صمد کے ہاں آئے تھے بابا سے ملنے اور میں بھی وہیں ہی تھی تب...... ویسے اجی شمین خان کاکا حویلی کیوں نہیں آتے؟'' اس نے اجی سے وہ بات پوچھ لی' جس نے عرصے سے اسے الجھا رکھا تھا۔

اجی نے ایک نظر اسے دیکھا۔ ''دراصل شروع میں آغا جان اس سے ناراض تھے کہ اس نے اپنی پسند سے شادی کر لی ہے۔ بعد میں ان کی ناراضی ختم بھی ہو گئی' لیکن شمین خان ایسا گیا کہ پھر نہیں آیا۔''

''میرا بھی کچھ ایسا ہی خیال تھا۔'' اس نے خیال ظاہر کیا اور بات ایک بار پھر وسیلہ خان کی بیماری تک جا پہنچی اور پھر اس کی بے حد ضد پر جب وسیط خان اسے چھوڑنے گئے تو انہوں نے ایک سپیشلسٹ سے چیک اپ کروایا۔ کچھ ٹیسٹ جو ڈاکٹر نے لکھ کر دیئے تھے کروائے اور سب ہی رپورٹیں کلیئر آئیں۔ ان کی طرف سے مطمئن ہو کر وہ پھر سے پڑھائی میں جت گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اچھے نمبروں میں کامیاب ہو اور بابا جان کو مایوسی نہ ہو۔ آخر انہوں نے سب کی مخالفت مول لے کر اسے یہاں بھیجا تھا۔ آغا جان اور کاکا جان تو اب بھی اسے کچھ ناراض ناراض ہی لگتے تھے۔ اب بھی جب وہ آئی تھی تو آغا جان کا موڈ اسے خاصہ خراب لگا تھا اور انہوں نے بابا جان سے پوچھا تھا۔

''کب ختم ہو گی اس کی پڑھائی؟''

''ابھی تو تین سال تقریباً اور لگ جائیں گے۔''

بابا نے آہستگی سے کہا تھا اور آغا جان کی بڑبڑاہٹ اس نے صاف سنی تھی' وہ کہہ رہے تھے۔

''پتا نہیں وسیط خان تو کیوں پڑھا رہا ہے اسے اور کس لیے۔ جتنا پڑھے گی اتنی آگاہی ملے گی اور آگاہی نرا عذاب ہوتی ہے پاگل خانیاں!''

''آگہی کا عذاب جانتا ہوں آغا جان لیکن ڈاکٹر بننا اس کی خواہش ہے اور میں اس کی ہر خواہش پوری کرنا چاہتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں آغا جان۔''

بابا جان اور اجی سے دور یہاں ہاسٹل میں کبھی کبھی اس کا دل بہت گھبراتا تھا' لیکن

اسے تو بابا جان کی خواہش پوری کرنا تھی۔ انہوں نے بچپن میں اس کے منہ سے نکلی آرزو کو پورا کرنے کے لیے آغا جان تک کی ناراضگی مول لے لی تھی۔

اس روز بھی وہ پڑھتے پڑھتے تھک گئی تھی اور ذرا سی دیر کو ریلیکس ہونے کے لیے اس نے دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندی ہی تھیں کہ دھڑ سے دروازہ کھولتی ہوئی ماریہ اندر آ گئی۔

''تمہارے مہمان آئے ہیں اصبح۔''

''کون؟'' اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

ستارہ کے ساتھ کوئی تھا۔ گندمی رنگت کے بوٹے سے قد کی خاتون مسکرا کر اسے دیکھ رہی تھیں۔ ان کے ساتھ دو بچے بھی تھے' گیارہ بارہ سال کی عمروں کے ہوں گے۔ ایک جیسے قد ایک جیسے نقوش بس ایک کی آنکھیں نیلی تھیں اور ایک کی سیاہ۔

''ارے ستارہ تم!'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

صبح کالج میں تو ملاقات ہوئی تھی' لیکن ستارہ نے شام کو آنے کا نہیں کہا تھا۔

''اصبح بھلا پہچانو تو کون ہیں یہ؟'' ستارہ نے ساتھ آنے والی خاتون کی طرف اشارہ کیا تو لحہ بھر وہ متذبذب سی انہیں دیکھتی رہی۔ ان کے لبوں پر اب بھی دلکش سی مسکراہٹ تھی۔ جس میں اپنائیت تھی۔ خاتون کے نقوش میں بلا کی جاذبیت تھی' گو رنگ گندمی تھا اور آنکھیں بہت بڑی نہ تھیں' لیکن آنکھوں میں بہت چمک تھی۔ نگاہیں خاتون کے چہرے سے ہٹ کر بچوں پر رکیں اور بچوں سے ایک خاص قسم کی اپنائیت محسوس کی اس نے۔ وہ اسے ذرا بھی اجنبی نہ لگے۔ حالانکہ اپنی گوری رنگت اور نیلی آنکھوں اور بھورے بالوں کی وجہ سے وہ بالکل فارنر ہی لگ رہے تھے۔

''شمین خان کاکا کی وائف اور بچے۔'' بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔

''دیکھا' میں نے کہا تھا نا اصبح پہچان لے گی آپ کو۔'' ستارہ نے اجنبی خاتون کی طرف دیکھا اور پھر اس کا تعارف کرایا۔

''یہ طاہرہ آنٹی ہیں شمین انکل کی بیوی۔'' انہوں نے آگے بڑھ کر اصبح کو گلے لگایا' اس کی پیشانی چومی۔

''تم میرے تصور سے کہیں زیادہ پیاری ہو اصبح۔''

وہ حیران سی انہیں دیکھ رہی تھی' ستارہ نے اس کی حیرانی بھانپ لی۔

''آنٹی آج ہمارے ہاں آئیں انہیں تم سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا' سو ان کے اصرار پر ملانے لے آئی ہوں۔''

''بیٹھیں نا پلیز.....'' وہ چونکی انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور دونوں بچوں کو اپنے پاس اکٹھے بلایا۔

''یہ کامران اور رضوان ہیں جڑواں۔'' طاہرہ نے بتایا۔

اس روز وہ کافی دیر بیٹھی تھیں۔ اسے طاہرہ آنٹی بہت اچھی لگی تھیں۔ بہت مخلص اور محبت کرنے والی اور بچے بھی بہت پیارے اور سلجھے ہوئے تھے اور بار بار اصرار کر رہے تھے کہ وہ ان کے گھر آئے۔ طاہرہ آنٹی نے بھی بہت اصرار کیا تھا کہ ویک اینڈ پر وہ ان کے گھر آ جایا کرے۔ اس نے وعدہ بھی کر لیا لیکن وہ نہ جا سکی تھی' ہاں طاہرہ آنٹی اور بچے ہی دو تین بار بعد میں بھی اسے ملنے آئے تھے۔ ہر بار ہی کچھ نہ کچھ لے کر آئے تھے۔ جوس کے پیکٹ روسٹ' اسکواش کی بوتل' فروٹ وغیرہ...... البتہ ثمین خان کاکا سے اس کی پھر ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔

اس کا بہت جی چاہتا تھا کہ وہ ثمین خان کاکا سے ملے اور ان سے ڈھیر ساری باتیں کرے۔ ستارہ اور بچوں کی باتوں سے اس نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ بہت نرم خو ہیں اور بچوں کے ساتھ بالکل دوستوں کی طرح ٹریٹ کرتے ہیں۔ پھر جب ایک ویک اینڈ پر بابا جان اسے ملنے آئے تو اس نے انہیں طاہرہ آنٹی کے متعلق بتایا تھا۔

''تو پھر تم گئیں ادھر؟''

''نہیں۔'' اس نے ان کی طرف دیکھا۔

''آپ کی اجازت کے بغیر کیسے جاتی بابا جان' حالانکہ ثمین خان کاکا سے میرا بہت جی چاہتا ہے ملنے کو۔''

انہوں نے ایک شفیق اور اطمینان بھری نظر اس پر ڈالی ''چلی جاتیں تمہارے کاکا کا گھر ہے۔''

''اور آغا جان...... کہیں وہ ناراض نہ ہو جائیں؟''

''نہیں' وہ ناراض نہیں ہوں گے۔'' بابا جان نے اسے یقین دلایا ''کسی ویک اینڈ پر

چلی جانا ستارہ کیساتھ ان کی طرف۔''

''بابا جان طاہرہ آنٹی بہت اچھی ہیں۔ بہت محبت کرنے والی ہیں۔ آپ کبھی ملے ان سے۔''

''ہاں...... پچھلی بار جب آیا تھا تو گیا تھا ادھر۔''

''تو پھر آغا جان سے سفارش کر دیں نا ان کی۔ وہ انہیں معاف کر دیں۔ وہ ہمارے قبیلے کی نہیں ہیں نا لیکن بہت اچھی ہیں۔''

''آغا جان خفا نہیں ہیں ان سے۔''

بابا جان نے کہا تھا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور وہ پوچھ ہی نہیں سکی تھی کہ جب وہ خفا نہیں ہیں تو ثمین خان کاکا اور طاہرہ آنٹی حویلی کیوں نہیں آتے۔ حالانکہ اب تو وہ پاکستان سیٹل بھی ہو چکے ہیں اور یہاں آنے سے پہلے وہ ستارہ کے ساتھ ثمین خان کاکا کے گھر گئی تھی۔ کتنا خوبصورت گھر تھا۔ ہر چیز سے صاحب خانہ کے ذوق اور نفاست کا پتا چلتا تھا۔ بچے اور طاہرہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے۔

''سسرالی عزیزوں میں سے دوسری بار کوئی ہمارے گھر آیا ہے' پہلے وسیط لالہ آئے اور اب تم۔'' طاہرہ نے کہا تو وہ بے اختیا انہیں حویلی آنے کی دعوت دے آئی تھی۔

''آپ حویلی ضرور آیئے گا آنٹی' آغا جان اب آپ سے ناراض نہیں ہیں۔''

انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ضرور حویلی آئیں گی۔'' بچوں کو بھی شوق ہے اپنے دادا اور دوسرے عزیزوں سے ملنے کا۔''

اس روز ثمین کاکا سے اس کی ملاقات نہیں ہو سکی تھی' وہ گھر پر نہیں تھے اور ان کے آنے سے پہلے وہ واپس آ گئی تھی۔

اور اگر آغا جان نے طاہرہ آنٹی کو حویلی میں نہ گھسنے دیا تو...... اس نے آنکھیں موندے موندے سوچا۔ شاید ثمین کاکا بھی اس لئے حویلی نہیں آتے کہ آغا جان نے انہیں تو حویلی آنے کی اجازت دے رکھی ہے لیکن ان کی بیوی کو نہیں۔

''اجی۔'' اس نے پریشان ہو کر انہیں آواز دی۔

''کیا ہے؟'' اجی نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

''اجی میں سوچ رہی ہوں اگر طاہرہ آنٹی اور ثمین کاکا آئے اور آغا جان نے آنٹی کو

گھر سے نکال دیا تو...... میں نے آپ کو بتایا تھا نا میں نے طاہرہ آنٹی سے کہا تھا حویلی آ۔ کو۔"

"آغا جان ایسا کچھ نہیں کریں گے...... اور تم فضول باتیں سوچ سوچ کر اپنا دما خراب نہ کرو...... اور نہ ہی مجھے پریشان کرو۔ ذرا آنکھ لگ رہی تھی کہ تم نے جگا دیا۔"

"سوری اجی' میں نے سمجھا آپ جاگ رہی ہیں۔"

"اچھا اب سو جاؤ اور مجھے آواز مت دینا' جو پوچھنا ہے صبح پوچھ لینا۔" وہ دوبا آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

● ● ●

تین سالہ امان اللہ کو دائیں پہلو سے بائیں پہلو پر منتقل کرتے ہوئے کشمالہ نے ہا میں پکڑا اللہ وشین خان کے منہ میں ڈال دیا۔

"ارے...... ارے یہ کیا بھابی جان؟"

"وسیط خان کے گھر ایک گڑیا آئی ہے۔"

"ارے سچ!" شین خان جو کچھ دیر پہلے ہی لاہور سے آیا تھا۔ خوشی سے اچھل پڑا۔

"ہاں رات ہی فون آیا تھا لندن سے۔"

"اور لالہ نے آنے کا کچھ نہیں بتایا؟" کشمالہ سے امان اللہ کو لیتے ہوئے شین۔ پوچھا۔

"نہیں' فی الحال تو آنے کا ارادہ نہیں...... کہہ رہے ہیں ابھی دو تین سال تک جب تا بچی سمجھ دار نہیں ہوتی وہ وہاں رہ سکتے ہیں......"

"دو تین سال مزید۔" شین نے امان اللہ کو اوپر اچھال کر پکڑا" اور یہاں میرا کیا ہوجائے گا تین سالوں میں۔"

"آخر ایسا کون سا مسئلہ اٹکا ہوا ہے تمہارا شین خان' جس کے سلجھانے کے لیے تمہ لالہ کا انتظار ہے؟"

"ہے ایک ایسا مسئلہ۔" اس نے ایک گہری نظر کشمالہ پر ڈالی' جس کی آنکھوں شرارت تھی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ......

کیا کشمالہ بھابی جانتی ہیں میرے دل کا حال۔

"کہو تو تمہارے بڑے لالہ سے کہوں تمہارا مسئلہ حل کروانے کو؟" وہ ابھی تک آنکھوں میں شرارت بھرے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"آپ کو کیا خبر میرے مسئلے کی۔" وہ امان اللہ کو لے کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"اگر بتا دوں تو......؟"

"تو......"

اس نے امان اللہ کو گدگداتے ہوئے پھر ایک نظر کشمالہ پر ڈالی۔ کشمالہ جسے پشاور سے بیاہ کر لایا گیا تھا۔ ذہین بھی تھی اور خوش اخلاق بھی۔ بہت جلد وہ سب کے ساتھ گھل مل گئی تھی۔ یہاں کی لڑکیوں کے مقابلے میں اس میں خوداعتمادی اور بولڈنیس تھی۔ انٹر تک تعلیم حاصل کی تھی اس نے اور بلا کی ذہین تھی۔

"تو مجھے کیا ملے گا؟"

"جو مانگیں گی۔"

"اچھا!" اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"ہمارے چھوٹے سے شین لالہ کا دل زرک خان کی ماہ نور میں اٹک گیا ہے اور وہ وسیط لالہ کے توسط سے انہیں اپنا حال دل سنا کر اپنا معاملہ آغا جان کے سامنے رکھنا چاہ رہے ہیں۔"

"ارے' آپ نے کیسے جانا؟" شین خان کو سچ مچ حیرت ہوئی۔

"جان لیا بس!"

"مگر کیسے؟"

"مقصود خان ہالینڈ واپس بھی چلے گئے اور ہمارے لالہ پھر بھی بھاگ بھاگ کر زرک خان کی حویلی میں جاتے ہیں تو' دلی دلچسپی ہوگی نا وہاں۔ سو جان لیا کہ زرک خان کی حویلی میں شین خان کے لیے کیا اٹریکشن ہوسکتی ہے۔"

"اوہ......" شین خان پریشان ہوگیا۔ اگر کشمالہ کو اندازہ ہوسکتا ہے تو کوئی اور بھی۔

"میں تو زرک خان کاکا سے ملنے جاتا ہوں۔ ان سے گفتگو کر کے مجھے خوشی ہوتی ہے' جیسے کوئی ہم زبان مل جائے اور آپ کی اطلاع کے لیے ماہ نور کاکا کے حجرے میں نہیں آتی۔ اندر حویلی میں ہوتی ہے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"تو میں نے کب کہا کہ تم ماہ نور سے ملتے ہو۔"

کشمالہ کھلکھلائی "میرا مطلب تو یہ تھا کہ تم زرک کاکا کا دل مٹھی میں لینے کے لیے کوششیں کر رہے ہو......"

اس نے ایک گہری اطمینان بھری سانس لی "یہ محض آپ کا اندازہ ہے۔" وہ رخ موڑ کر پھر سے امان اللہ خان کو گدگدانے لگا۔

"اچھا تو ٹھیک ہے پھر میں بی جان سے کہہ دیتی ہوں کہ وہ آغا جان کو بتا دیں کہ ثمین خان نے منع کر دیا ہے۔ زرک کاکا کے ہاں ماہ نور کے لیے رشتہ دینے کو۔"

"کیا......کیا......؟" وہ یک دم پلٹا۔

"کچھ نہیں۔" کشمالہ نے جھک کر امان اللہ کو اٹھایا۔

"اب تم برسرروزگار ہو۔ بی جان نے مجھے کہا تھا کہ آغا جان کا خیال ہے کہ وہ زرک خان کاکا سے تمہارا رشتہ مانگیں۔ اس طرح تعلق مضبوط ہوگا اور شاید فیروز خان وغیرہ بھی اپنے دل صاف کرلیں' لیکن تمہاری مرضی تو ضروری ہے نا۔ بی جان کو ڈر تھا کہ کہیں تم نے ادھر لاہور میں ہی کسی کو پسند نہ کر رکھا ہو......" وہ جانے کے لیے پلٹی۔

"ارے ارے' رکیں کہاں جا رہی ہیں۔ میں نے کب کہا ہے کہ مجھے یہ رشتہ منظور نہیں ہے۔ ظاہر ہے آغا جان کی اور بی جان کی جو خواہش ہے وہی میری۔" اس نے بظاہر سنجیدگی سے کہا' لیکن اندر کہیں پھلجھڑیاں سی چھوٹ رہی تھیں۔ رنگ بکھر رہے تھے جیسے ہولی مچی ہو۔

"سب جانتی ہوں لالہ' اتنے فرمانبردار نہیں ہو۔" وہ ہنستے ہوئے کمرے سے چلی گئیں تو اس کا جی چاہا وہ پورے کمرے میں ناچتا پھرے دھمال ڈالے۔

کیا آرزوئیں اور خواہشیں یوں بھی پوری ہوتی ہیں۔ ماہ نور کب اس کے دل کی آرزو بنی اسے خبر نہیں ہوئی تھی' لیکن اس کی صبحیں اور شامیں اسی کے تصور میں گزرتی تھیں۔ وہ لاہور جاتا تو گھر آنے کے لیے بے چین رہتا تھا اور گھر آتے ہی زرک خان کی حویلی جانے کو مضطرب ہو جاتا کہ شاید کہیں کوئی جھلک نظر آجائے' گو اس روز کے بعد ایسا ممکن نہ ہو سکا تھا۔ حتیٰ کہ مقصود واپس چلا گیا۔

زرک خان نے مقصود کے لیے جو سوچا تھا وہ ممکن نہیں ہو سکا تھا۔ زرک خان کا خیال تھا کہ وہ مقصود کا رشتہ ولی خان والوں میں کریں گے اور اس طرح برسوں پرانی دشمنی ختم ہو جائے

گی' لیکن ان کی ان مخلصانہ کوششوں کا نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلا...... الٹا ولی خان والوں نے ان کا مذاق اڑایا تھا۔ علاقے کی روایات کے مطابق گو انہوں نے زرک خان کو عزت سے حجرے میں بٹھایا کہ گھر آنے والے مہمانوں کی عزت کرنا بہرحال ان کی روایت تھی' لیکن رشتے کی بات سن کر صاف انکار کر دیا تھا۔ زرک خان افسردہ تھے۔

وہ ماہ نور کا رشتہ لینے کو تیار تھے' لیکن اپنی بیٹی کا رشتہ دینے کے لیے تیار نہ تھے اور یہ بات زرک خان کو منظور نہ تھی' کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس طرح دشمن کے گھر بیٹی دے کر وہ اس کی زندگی عذاب بنا دیں گے۔

مقصود خوش تھا۔ اب وہ زرک خان کے ساتھ کیے گئے عہد سے آزاد ہو گیا تھا۔ ٹریسی کے ساتھ زندگی گزارنے کا خیال بہت خوش کن تھا۔

زرک خان نے ثمین خان سے بطور خاص کہا تھا "ثمین خان مقصود کے جانے کے بعد کہیں ادھر کا رستہ ہی نہ بھول جانا آتے رہنا۔ تم سے بات کر کے اچھا لگتا ہے۔"

"ضرور کاکا جان' میں آتا رہوں گا' خود مجھے آپ سے گفتگو کر کے بہت کچھ حاصل ہوتا ہے۔"

یوں مقصود کے جانے کے بعد بھی وہ زرک خان کے پاس جاتا رہتا تھا' کبھی آغا جان کے ساتھ' کبھی اکیلے۔

تعلیم مکمل کر کے اس نے وہیں ایک کالج میں نوکری کر لی تھی۔ گو آغا جان چاہتے تھے کہ اس نے تعلیم حاصل کر لی ہے تو اب حویلی آجائے اور امید خان کے ساتھ زمینوں کا کام دیکھے...... لیکن پڑھانا اس کا شوق تھا۔ یوں ہی تین سال بیت گئے تھے' ان تین سالوں میں ماہ نور سے اس کی صرف دو ملاقاتیں ہوئی تھیں۔

زرک خان نے اپنے چچا زاد اور تایا زاد بھائیوں کی مخالفت کے باوجود ماہ نور کو پشاور کالج میں داخل کروا دیا تھا۔ کالج میں داخلے سے پہلے اس نے پرائیویٹ طور پر میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔

اس روز وہ پشاور جانے کے لیے گھر سے نکلا تھا کہ زرک خان کی جیپ نظر آئی۔

اس کے قریب آکر زرک خان نے جیپ روک لی۔

"ارے' آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"ماہ نور کو ہاسٹل چھوڑنے جا رہا ہوں اور تم......؟"
"میں بھی پشاور جانے کے لیے نکلا ہوں۔"
"تو ہمارے ساتھ چلو۔"
"آپ کے ساتھ......!" وہ جھجکا اور غیر ارادی طور پر اس کی نظر پچھلی سیٹ کی طرف اٹھی۔ ماہ نور بھی ادھر ہی دیکھ رہی تھی۔ نظریں ملنے پر ایک مدھم سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھر کر معدوم ہوگئی اور اس نے جلدی سے چہرہ اپنی سیاہ چادر میں چھپالیا۔
"ہاں یار' تکلف مت کرو آجاؤ' راستے میں باتیں کرتے چلیں گے۔" انہوں نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھلوا دیا تھا وہ جھجکتے ہوئے بیٹھ گیا اور پھر پشاور تک کا سفر عجب خواب کے سے عالم میں گزرا۔ وہ دشمن جاں پیچھے بیٹھی تھی' جسے دیکھنے کے لیے وہ بار بار لاہور سے گھر آتا تھا اور اس کے یوں بار بار گھر آنے پر کشمالہ تبصرہ کرتی۔
"چل چکی تمہاری نوکری' دیکھ لینا لالہ کچھ دنوں بعد آپ کو لیٹر ملے گا کہ پلیز آپ کے لیے بہتر ہے کہ آپ مستقل اپنے گھر میں آرام کریں۔"
ایک جگہ جیپ روک کر زرک خان اترے "تم یہاں ہی بیٹھو' میں چند منٹ میں آتا ہوں' گل خان سے مجھے کچھ رقم لینی ہے۔ یہ سامنے ہی اس کی دکان ہے' پھر ماہ نور کو چھوڑ کر تمہیں تمہاری مطلوبہ جگہ پر چھوڑ دوں گا۔"
"یا رب العالمین تو کتنا رحیم و کریم ہے۔" اس نے دل ہی دل میں سوچا اور مڑ کر پیچھے دیکھا۔
"کیسی ہیں آپ ماہ نور!" اس کی پرشوق نظریں اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔
"اچھی ہوں۔" ماہ نور نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھائیں۔ وہ ہاتھ گود میں رکھے بیگ پر نگاہیں جمائے بیٹھی تھی۔
"یہ آپ نے اچھا کیا کہ ایڈمیشن لے لیا۔"
"ہاں لیکن فیروز خان کاکا بہت ناراض ہیں۔ مجھے ان سے بہت ڈر لگتا ہے' مگر بابا جان نے کہا ہے کہ وہ مجھے کم از کم انٹر تک تو ضرور پڑھانا چاہتے ہیں۔"
"اور آپ؟" شین خان نے یونہی بات جاری رکھنے کے لیے پوچھا۔
"ظاہر ہے میں...... میں بھی پڑھنا چاہتی ہوں۔"

اس نے پھر ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کر اسے دیکھا "میرے اختیار میں ہو تو میں مصور بنوں۔"
"اور کبھی آپ کا اختیار مجھے ملا تو بخدا میں آپ کی یہ خواہش ضرور پوری کروں گا۔" بے اختیار ہی شین کے لبوں سے نکلا تھا اور پھر ایک دم گھبرا کر اس نے ماہ نور کی طرف دیکھا' جس کی نظروں میں حیرت تھی' پھر جیسے اس کی بات کا مفہوم سمجھتے ہوئے اس کے رخساروں کا گلابی پن گہرا ہوگیا۔ دلکش آنکھوں میں حجاب کے رنگ جھلملائے اور پلکوں کی جھالر نے گر کر ان رنگوں کو شین خان سے چھپالیا۔ شین خان جیپ سے اتر کر باہر کھڑا ہوگیا۔
اس رات اسے نیند نہ آئی۔ "کیا دنیا میں اتنا حسن ہے۔" وہ حیران ہو کر سوچتا رہا۔ پتا نہیں پھر کبھی وہ ماہ نور کو دیکھ بھی سکے گا یا نہیں۔ کاش کسی طرح یہ پتا چل جاتا کہ ماہ نور کا دل بھی اس کے لیے دھڑکتا ہے۔ کیا اس کی بے اختیاری میں کہی گئی بات نے اس کے دل میں بھی ہلچل مچائی تھی اور پھر بہت جلد ہی یہ موقع مل گیا تھا۔
اس روز وہ ٹیلے پر بیٹھا بانسری بجا رہا تھا اور سورج ڈوبنے کی تیاری میں تھا۔ دلبر بہت خوبصورت بانسری بجاتا تھا اور اس نے بھی دلبر سے ہی بانسری بجانی سیکھی تھی' لیکن ابھی اس کا سانس ٹوٹ جاتا تھا' پھر بھی وہ بجا لیتا تھا۔ اس وقت وہ آنکھیں بند کیے ہونٹوں سے بانسری لگائے بیٹھا تھا کہ ماہ نور چھوٹے چھوٹے ٹیلے پھلانگتی ہوئی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔
آہٹ پر اس نے آنکھیں کھول دیں اور ماہ نور کو دیکھ کر ایک دم کھڑا ہوگیا۔
"آپ!"
"ہاں' میں ادھر پیچھے گھوم رہی تھی' یونہی' بانسری کی آواز سن کر ادھر آگئی۔ میں سمجھی دلبر ہے۔"
شین خان کی نظروں نے اس کے دمکتے چہرے کا بے تابی سے طواف کیا اور پھر جھک گئیں۔
اس نے سر سے سرکتی چادر کو درست کیا "مجھے بانسری بجانے کا بہت شوق ہے۔"
"میں سکھا دوں گا اگر کبھی اتنا اختیار رہا تو......!" لبوں سے پھر غیر ارادی طور پر پھسلا تھا۔
"اس سے پہلے بھی آپ ایک ایسا ہی وعدہ کر چکے ہیں' یاد رکھیے گا۔" وہ کھلکھلائی تو اس

پاکسوسائٹی ڈاٹ کام

کے سفید موتیوں جیسے دانت شین کو بہت بھلے لگے۔

"تم سرتاپا حسین ہو ماہ نور۔" اس نے دل ہی دل میں کہا۔

"میں وعدہ کر کے بھولتا نہیں۔" شین خان نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور اس کی پلکیں جھک گئیں۔ رخساروں کی رنگت شفق رنگ ہوگئی۔

"بس' یاد رکھیے گا۔"

وہ یک دم مڑی اور تیز تیز چلتی پیچھے کی طرف اتر گئی۔ شین خان کو لگا جیسے اب اسے کسی اور شے کی آرزو نہیں رہی' جیسے کائنات کی ہر شے رقص میں ہو۔ ہر چیز وجد میں ہو...... اور جب بھی وہ مایوس ہونے لگتا' ماہ نور کے کہے گئے یہ دو جملے اس کے دل میں نئی توانائیاں بھر دیتے۔ تو ماہ نور بھی...... ماہ نور بھی......

اس کے بعد پھر کبھی کوئی ایسا اتفاق نہ ہوا کہ وہ ماہ نور کو دیکھ پاتا۔ اسے وسیط خان کا انتظار تھا کہ وسیط آئے اور وہ دل کی بات اسے بتا کر آغا جان تک اپنی آرزو پہنچائے۔ حالانکہ گھر میں اس کی جاب کے ساتھ ہی بی جی نے اس کی شادی کا ذکر کرنا شروع کر دیا تھا اور اب کشمالہ کہہ رہی کہ بی جی اور آغا جان...... اوہ خدایا! تو کتنا مہربان ہے اور کتنا رحیم۔

"اب آ بھی چکو لالہ' بی جان انتظار کر رہی ہیں۔"

کشمالہ نے کمرے میں اندر جھانکا' وہ کشمالہ کے پیچھے ہی باہر نکل آیا۔ بی جان اس کی منتظر تھیں' اس کی پیشانی چومتے ہوئے انہوں نے شکوہ کیا۔

"آتے ہی کہاں غائب ہوگئے تھے۔ تمہیں آئے ہوئے کتنی دیر ہوگئی۔"

"کہیں نہیں بی جان اپنے کمرے میں تھا۔" شین خان نے ان کے پاس ہی بیٹھتے ہوئے کہا "پہلے آپ ہی کی طرف آیا تھا' آپ نماز پڑھ رہی تھیں۔ قدرے توقف کے بعد اس نے پوچھا "لالہ کا فون آیا تھا' انہوں نے ننھی گڑیا کا کوئی نام رکھا؟"

بی جان مسکرائیں "ہاں' اصبح نام رکھا ہے تمہارے لالہ نے اس کا کہہ رہا تھا۔ اس کا مطلب ہے خوبصورت۔"

"لالہ نے آنے کا کچھ نہیں کہا؟" شین نے لاڈ سے ان کی گود میں سر رکھ دیا۔

"نہ' کچھ نہیں کہا۔ ابھی اس کا ارادہ نہیں لگتا۔" بی جان بھی اداس ہوگئیں۔

"میں لالہ کے لیے بہت اداس ہوگیا ہوں بی جان!"

"تو کیا میں اداس نہیں ہوں' صبح شام یاد کرتی ہوں اسے۔ خیر میں نے بھی تمہارے آغا جان سے کہا ہے کہ بس اب شین خاناں کی شادی کرو بھائی کی شادی پر تو آنا ہی پڑے گا نا۔"

"میری شادی!" اس نے انجان بنتے ہوئے پوچھا "کیا میرے لئے ولور (دلہن) دیکھ لی آپ نے؟"

"دیکھنا کیا تمہارے آغا جان نے تو فیصلہ بھی کر لیا ہے۔ زرک خان کی بیٹی ماہ نور کو مانگنے کیلئے...... ویسے اللہ میاں نے اسے جیسے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے بہت پیاری بچی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔" انہوں نے ایک نظر اسے دیکھا' جس کی آنکھوں میں ستارے چمک رہے تھے اور ہونٹوں پر دلفریب سی مسکراہٹ تھی۔

"ارے بی جان اگر وہ پیاری نہ بھی ہو تو جو آغا جان اور آپ کی خواہش ہو میں اس سے انکار کر سکتا ہوں بھلا۔"

"جیتے رہو' اپنے آغا جان سے ملے۔" بی جان ایک دم خوش ہوگئیں۔

"نہیں ابھی تو نہیں۔ شاید باہر حجرے میں ہوں گے۔"

"ہاں' شاید مہمان آئے ہوئے تھے مردان سے۔ تم باہر جاؤ تو...... اچھا خیر رہنے دو' میں خود ہی بات کر لوں گی۔"

"تو میں آغا جان سے مل لوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"چائے تو پی لو۔ کشمالہ بنوا رہی تھی اور کھانا کیا اب کھاؤ گے۔"

"نہیں' کھانا تو رات میں ہی کھاؤں گا' ہاں چائے باہر ہی بھجوا دیں۔" وہ بی جان کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگا کر باہر نکل آیا۔ آغا جان اسے باہر ہی مل گئے۔ اسے دیکھا اور بے اختیار دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف بڑھے۔

"ارے' شین خان کب آیا؟"

"کچھ دیر پہلے ہی آیا تھا۔"

انہوں نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ "کدھر چلے تھے آتے ہی۔"

"آپ ہی کی طرف آرہا تھا۔ لیکن آپ کہاں جا رہے تھے؟"

"زرک خان کی طرف چلا تھا۔ تین چار دن سے ادھر بارشیں ہو رہی تھیں' ملاقات نہیں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ہو سکی۔تم چلو گے۔"

"دل تو چاہ رہا ہے لیکن میں نے چائے بھجوانے کو کہا تھا۔"

"چائے اپنے زرک خان کے پاس ہی جا کر پیتے ہیں یارا"

جب وہ آغا جان کے ساتھ زرک خان کی اوطاق میں آیا تو زرک خان نے بڑی گرمجوشی اور محبت سے اسے گلے لگایا۔

"میں تو تمہارے لئے بہت اداس ہو گیا تھا ثمین خان بہت دن لگا دیئے۔"

"بس کاکا نئی نئی جاب ہے تو چھٹی کا مسئلہ ہوتا ہے۔مقصود کا کیا حال ہے؟"

"وہ ٹھیک ہے مست ہے۔سوچتا ہوں جو اولاد مغرب کی ہواؤں میں پلتی ہے۔اسے پھر مشرق کی ہوائیں راس نہیں آتیں۔اپنا مقصود بھی لگتا ہے وہیں دل لگا بیٹھا ہے۔میں تو چاہتا تھا ادھر اپنے ملک میں ہی کام شام کرے' پر اس کے پاس ہزاروں بہانے ہیں۔" ان کے لہجے میں ہلکی سی اداسی کے رنگ جھلکے تو اس نے قہقہہ لگایا۔

"ارے ثمین خان تم نے مجھے ایسا الجھایا کہ میں لالہ کی طرف دیکھ ہی نہیں پایا۔"

ثمین خان کو بیٹھنے کا اشارہ کر کے زرک خان نے آگے بڑھ کر آغا جان کو گلے لگایا۔

"آج آپ نہ آتے لالہ تو میں آجاتا' آپ سے ملنے میری بی جان کیسی ہیں۔"

"ٹھیک ہے' دعائیں دیتی ہے تمہیں" آغا جان بھی بیٹھ گئے۔

"کاکا میں آپ کے لیے آپ کی پسند کی کچھ کتابیں لایا ہوں۔اس وقت تو آغا جان سے ملنے باہر نکلا تھا تو پھر انہی کے ساتھ چلا آیا۔پھر آؤں گا تو لیتا آؤں گا۔"

"لالہ آپ کے اس بیٹے سے بات کر کے بڑا لطف آتا ہے مجھے...... جی چاہتا ہے اسے تو میں لے لوں۔"

"تمہارا ہی بیٹا ہے زرک خان' اپنا ہی سمجھو بلکہ اسے اپنا بیٹا ہی بنا لو۔میں تو بہت دنوں سے سوچ رہا تھا تم سے بات کروں' پوچھوں تم سے میرا ثمین خان تمہیں کیسا لگتا ہے۔پسند ہے تو اسے اپنی ماہ نور کے لیے قبول کر لو۔"

"لالہ!" زرک خان لمحہ بھر کو بالکل خاموش ہو گئے اور ثمین خان کو لگا جیسے اس کا دل سینے کے اندر ہی کہیں دھڑک کر خاموش ہو جائے گا۔آغا جان بھی اسے دیکھ رہے تھے۔

دوسرے ہی لمحے زرک خان نے اٹھ کر آغا جان کو دونوں بازوؤں میں لیتے ہوئے گھما ڈالا۔

"لالہ...... لالہ میں کیسے' کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں۔آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی۔میری ماہ نور کے لیے ثمین خان سے بہتر کوئی نہیں ہو سکتا' لالہ کوئی نہیں۔"

ثمین خان سر جھکائے اپنی بے ترتیب دھڑکنوں کو سن رہا تھا۔اس نے ماہ نور کو دیکھا تھا۔دل نے اس کی چاہ کی تھی اور ماہ نور اس کی ہونے جا رہی تھی۔نہ کوئی ظالم سماج درمیان میں آیا تھا اور نہ ہی کوئی اور مسئلہ کھڑا ہوا تھا۔اپنی دلکش آنکھوں میں سینکڑوں جگنوؤں کی جگمگاہٹ لئے مسکراتی ہوئی ماہ نور چھم سے اس کے تصور میں چلی آئی۔

"اپنا وعدہ یاد رکھیے گا۔"

"مجھے اپنا وعدہ یاد ہے ماہ نور!" اس نے دل ہی دل میں کہا اور پھر زرک خان کی طرف متوجہ ہو گیا جو آغا جان سے باتیں کر رہے تھے۔

"پتا نہیں کیا بات تھی لالہ کہ روز اوّل ہی تمہارے اس بیٹے نے میری توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی اور پہلی بار اسے دیکھتے ہی میں نے سوچا تھا اگر...... اگر ثمین خان اور ماہ نور کا بیاہ ہو جائے تو کتنا اچھا ہو۔شاید وہ کوئی لمحہ شنید تھا۔"

"بالکل یہی بات میں نے سوچی تھی کہ اگر ثمین خان کو تمہارا بیٹا بنا دوں تو ہمارا رشتہ اور مستحکم ہو جائے گا۔تمہارے چچا زاد اور تایا زاد جو تھوڑا بہت بغض مجھ سے کشمالہ کی وجہ سے رکھتے ہیں' وہ ختم ہو جائے گا اس رشتے داری سے۔" انہوں نے زرک خان کا ہاتھ دبایا۔

"ہاں لالہ فیروز خان لالہ تو اس بات پر بہت ناراض ہیں آپ سے۔"

"لیکن زرک خان یقین کرو مجھے ہرگز علم نہ تھا کہ امید خان کی دلور کی ولی خان والوں سے کچھ رشتے داری ہے۔فیروز خان نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ امید کشمالہ کو طلاق دے دے' لیکن تم خود ہی بتاؤ زرک خان اسے بے چاری کا کیا قصور ہے' کس جرم کی سزا دی جائے اسے جبکہ وہ بہت اچھی ہے' خدمت گزار اور محبت کرنے والی ہے۔امید خان کے دو بیٹوں کی ماں...... میں نے کہہ دیا میں یہ ظلم نہیں کر سکتا' تب سے فیروز خان مجھ سے ذرا ادکھا ہی بولتا ہے۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔یہ نئی رشتے داری سب میل دھو دے گی۔" زرک خان نے انہیں تسلی دی۔

لیکن زرک خان کا خیال غلط تھا' وہ اپنے چچا زاد اور تایا زاد بھائیوں کی فطرت کا صحیح

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

اندازہ نہیں کر سکتے تھے۔ فطرتاً وہ سادہ دل تھے' اس لئے دوسروں کو بھی سادہ دل ہی سمجھتے تھے' جب شین خان کا باقاعدہ رشتہ بھیجا گیا تو فیروز خان اور اس کے بھائیوں نے سخت اعتراض کیا۔

"تو کیا میں ماہ نور کو ساری عمر گھر بٹھائے رکھوں لالہ؟"

"یہ کس نے کہا ہے' میرے بیٹے اکبر خان سے اسے بیاہ دو۔"

"اکبر خان سے......!" زرک خان کو حیرت ہوئی۔ اکبر خان چھ بچوں کا باپ تھا۔ ساتویں بچے کی پیدائش پر اس کی بیوی مر گئی تھی۔

"لالہ آپ نے یہ بات کیسے کہہ دی۔ بھلا اکبر خان اور ماہ نور......"

"دشمن کے ہاں بیٹی دینے سے تو بہتر ہے۔"

"وہ ہمارے دشمن نہیں ہیں اور پھر امید خان کی شادی کا احوال آپ جانتے ہیں۔ یوں بھی میں اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتا اور میں نے افروز خان کو زبان دے دی ہے۔ دو سال تک رخصتی کر دوں گا۔" زرک خان نے بات ختم کر دی' لیکن فیروز خان نے ناگواری سے انہیں دیکھا۔

"زرک خان انگریزوں کے ملک میں رہ کر تمہاری غیرت مر چکی ہے تو ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔"

زرک خان نے بمشکل فیروز خان کی بات برداشت کی' ضبط کی کوشش میں ان کا رنگ سرخ پڑ گیا تھا اور آنکھیں خون رنگ ہو گئی تھیں۔

"میں نہ بے غیرت تھا نہ بے غیرت ہوں لالہ لیکن میرے نزدیک غیرت کے وہ معنی نہیں ہے جو آپ کے نزدیک ہیں۔"

فیروز خان طنز سے مسکرائے اور مزید کوئی بات کئے بغیر اٹھ کر چلے گئے۔ گو زرک خان کچھ اپ سیٹ ہو گئے تھے' لیکن مقصود سے مشورہ کرنے کے بعد انہوں نے شین خان اور ماہ نور کا نکاح کر دیا تاکہ بعد میں مسائل نہ اٹھیں البتہ رخصتی ماہ نور کے گریجویشن کرنے اور مقصود کے آنے پر طے پائی۔

شین خان حیران بھی تھا اور خوش بھی۔ بھلا خواہشیں یوں بھی اس طرح بھی پوری ہوتی ہیں۔ اس کے دل نے ماہ نور کا ساتھ چاہا تھا اور ماہ نور اس کی ذات کا حصہ بن گئی تھی۔ اس کا

دل چاہتا تھا وقت کو پر لگ جائیں اور دو سال کا عرصہ پلک جھپکتے میں گزر جائے۔ وسیط خان نے اس کی شادی پر آنے کا وعدہ کیا تھا۔

"اپنا وعدہ یاد رکھیے گا!"

"یاد رہے گا۔" وسیط خان ہنسے تھے "بلکہ شاید میں پھر واپس انگلینڈ نہ آؤں۔"

"سچ لالہ!"

"ہاں سچ...... لیکن ابھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے مستقل طور پر وہاں سیٹل ہونے میں کچھ مزید وقت لگ جائے' لیکن تمہاری شادی پر آنا پکا ہے۔"

یہ اتنی ساری خوشیاں اسے مل رہی تھیں تو کبھی کبھی وہ ڈر جاتا کہیں ان خوشیوں کو نظر ہی نہ لگ جائے۔

"بی جان نظر کی دعا پڑھتی رہا کریں۔" وہ ان کی گود میں سر رکھے آنکھیں موندے کہتا "خدا ہماری خوشیوں کو قائم رکھے' کسی کی نظر نہ لگے۔"

"الٹی سیدھی باتیں نہ سوچا کر۔" بی جان اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر پھونکنے لگتیں اور اس کے دل میں سکون سا اتر آتا۔

* * *

دونوں ہاتھ گھٹنوں کے گرد حمائل کئے گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے اصبح اپنے بیڈ پر بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ کپڑے استری کرتے ہوئے ماریہ نے دو تین بار اس کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے صبی کیا سوچ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں۔" اصبح نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"کچھ تو ہے اصبح خان' پچھلے آدھے گھنٹے سے تم اسی کیفیت میں بیٹھی ہو۔ میں نے اپنے دو سوٹ استری کر لئے ہیں اور تم ہنوز یونہی گم ہو۔"

"کچھ خاص نہیں۔" ایک گہری سانس لے کر وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"اچھا تو عام ہی بتا دو۔" وہ سوئچ آف کر کے استری کو اسٹینڈ پر رکھ کر اس کے قریب ہی آ کر اس کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"کہیں دال میں کچھ کالا تو نہیں؟" اس کی آنکھوں میں شرارت تھی اور وہ بہت غور سے اصبح کو دیکھ رہی تھی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"نہ کالا نہ پیلا۔" اصبح مسکرائی۔

"تو کیا پھر سرخ......" ماریہ ہنوز شرارت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"یار کیا ہوا ہے تمہیں' لگتا ہے زرمین اور شمائل کا اثر ہوگیا ہے۔ جنہیں ہر طرف رومانس ہی رومانس نظر آتا ہے۔"

"ویسے ایک بات ہے اصبح۔" ماریہ نے جیسے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔ "وہ احمر بلال ہے نا وہ تم میں بہت انٹرسٹڈ دکھائی دیتا ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں تمہارے لئے پسندیدگی دیکھی ہے۔ کیا تم نے محسوس نہیں کیا؟"

"ربش باتیں مت کیا کرو ماریہ' میں یہاں پڑھنے آئی ہوں۔ کسی کی آنکھوں میں جھانکنے کے لیے نہیں آئی۔" اصبح کی پیشانی پر شکنیں تھیں اور لہجے سے ناگواری کا اظہار ہو رہا تھا۔

"سوری اصبح' تمہیں برا لگا' لیکن میرا خیال تھا کہ تم اس کی اس وارفتگی کو نظرانداز نہ کرسکو گی۔"

"امی نے کہا تھا' اصبح ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہ بھولنا کہ تمہاری روایات کیا ہیں' مجھے نہ احمر بلال سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ کسی اور سے۔ مجھے ایسا کچھ نہیں کرنا ماریہ جو آگے چل کر میرے والدین کے سامنے میرا سر جھکا دے۔" وہ یک دم سنجیدہ ہوگئی تھی۔

"میرا مقصد ڈاکٹر بننا ہے' کیونکہ یہ میرے بابا جان کی خواہش ہے اور اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے اپنے پیاروں کی ناراضگی مول لی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے بابا جان کا سر کبھی آغا جان اور کاکا جان کے سامنے جھکے۔"

"دیکھو ماریہ پلیز' مجھ سے اس طرح کی باتیں مت کیا کرو۔ اگر میں احمر بلال کو غور سے دیکھوں گی اور مجھے اس کی آنکھوں میں کچھ نظر آیا۔ کوئی جذبہ' کوئی احساس تو ممکن ہے میرے دل میں بھی کوئی ایسا ہی جذبہ لودے اٹھے۔ یہ ایک جال ہے' ایک طلسم ہے۔ جو بندے کو ہولے ہولے جکڑ لیتا ہے اور پھر آدمی کہیں کا نہیں رہتا۔ سارے عہد و پیمان ریت کے ذروں کی طرح بکھر جاتے ہیں۔ سو ہمیں ایسی نظروں کو نظرانداز کرنا چاہئے ماریہ' یہی بہتر ہے۔"

"اوکے تم ٹھیک کہتی ہو۔" ماریہ اٹھی اور اپنے کپڑے اٹھا کر واش روم کی طرف بڑھ گئی۔

"اور کیا اسفند یار کو بھی تم نے نظرانداز کردیا ہے اصبح۔" اس کے اندر سے آواز آئی تو اس نے گھبرا کر واش روم کے بند دروازے کو دیکھا۔

اسفند یار اور اس کی آنکھوں میں لودیتے جذبے۔ جب اس کی نظریں اصبح کی طرف اٹھتیں تو پھر جھکنا بھول جاتیں اور اس کی گمبھیر آواز اور جذبے کی حدت سے دہکتا لہجہ۔

پہلی بار اسفند اسے عبدالصمد خان کے ہاں ملا تھا۔ وہ تیسرے سال کے پیپرز دے کر فارغ ہوئی تھی کہ ستارہ خان ضد کر کے اسے اپنے ساتھ ہی گھر لے گئی تھی۔

"یہ چند دن ہی تو ہیں' جن میں ہم ذرا ریلیکس ہو جائیں گے' پھر چند دنوں بعد وہی ہم ہوں گے اور وہی میڈیکل کی موٹی موٹی کتابیں......"

"لیکن مجھے گھر جانا ہے آج بابا جان کو فون کروں گی۔ وہ کل تک لے جائیں گے۔"

"میں خود انکل کو فون کروں گی کہ دو تین دن بعد آئیں لینے۔ رہ لینا ہفتہ بھر وہاں بھی۔ میرے تایا جان کی فیملی آئی ہوئی ہے۔ سچی سب اتنے جولی ہیں نا کہ کیا بتاؤں میری کزنز بہت اچھی ہیں۔ بڑی کزن نے معاشیات میں ماسٹر کیا ہے اور اس کی شادی ہونے والی ہے کسی بینکر سے۔ سب شام کو اکٹھے ہوتے ہیں تو سچی میں تو جلتی کڑھتی رہتی تھی کہ زیادہ دیر تک ان کی کمپنی انجوائے نہیں کرسکتی۔ خدا خدا کر کے اب پیپرز ختم ہوئے ہیں۔"

"مگر تمہارے گھر اتنے مہمان ہیں ایسے میں میرا جانا مناسب نہیں ہے۔"

"میرے گھر میں کہاں بابا انکل تو اپنے گھر میں ہوتے ہیں بس شام کو اکٹھے ہوتے ہیں اور بس اب میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔"

یوں وہ ستارہ کے ساتھ ہی اس کے گھر آ گئی تھی اور ہمیشہ کی طرح گھر کے ہر فرد نے اس کے آنے پر بے حد خوشی کا اظہار کیا تھا۔ اس کی تینوں کزن واقعی بہت بے تکلف تھیں۔ منٹوں میں اس سے یوں بے تکلف ہوگئیں' جیسے برسوں سے جانتی ہوں۔ تینوں نے ہی اس کے حسن کی دل کھول کے تعریف کی تھی۔ اسی شام وہ سب لاؤنج میں بیٹھے تھے اور سب ہی ستارہ کی کزن ازکی کے ہونے والے دولہا کا دل کھول کر مذاق اڑا رہے تھے۔

"یار ازکی اپنے جہیز میں چھ سات وگیں بھی لے جانا۔ بے چارے دولہا بھائی کے سر پہ دو تین بال ہیں وہ بھی یقیناً چند دنوں میں غائب ہوجائیں گے' اس لئے وگوں کی ضرورت پڑے گی۔"

اصبح بالکل سامنے بیٹھی تھی' جب اسفندیار نے اندر قدم رکھا تھا اور پھر اس کی نظریں اس پر ٹھہری گئی تھیں۔

''اتنا مکمل حسن!'' اس نے زیر لب کہا تھا اور پھر چند قدم آگے بڑھ کر عین اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

''ارے اسفی بھائی آپ!'' ازکی نے مڑ کر اسے دیکھا تھا۔

''یہ اصبح ہیں وسیط انکل کی بیٹی...... اور صبی یہ ہمارے اکلوتے بھائی ہیں اسفندیار۔''

''آپ......'' اسفندیار نے ایک بہت گہری نظر اس پر ڈالی اور اصبح کو یوں لگا جیسے اس کا دل اس کے جسم کے ہر حصے میں دھڑک رہا ہو۔ اس نے نگاہیں جھکا لیں اور رخساروں پر سرخی پھیل گئی۔ اسفند نے بے حد دلچسپی سے اسے دیکھا اور نظریں اس کے چہرے سے ہٹا لیں۔

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔''

اصبح خاموش رہی۔

''کیا آپ کو نہیں ہوئی؟''

''جی!'' اصبح نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھائیں۔

''یعنی کہ نہیں ہوئی۔'' اب اسفند کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

''یعنی کہ ایک ہستی ایسی بھی ہے جسے آپ سے مل کر خوشی نہیں ہو سکتی۔ ویری سیڈ اسفی بھائی!'' سمیر خان نے اندر آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پھر اصبح کی طرف دیکھا۔

''ڈیئر سسٹر یہ جو ہمارے اسفند بھائی ہیں انہیں بڑی خوش فہمی تھی کہ لوگ ان سے مل کر بہت خوش ہوتے ہیں...... لیکن آج ان کی یہ خوش فہمی دور ہو گئی۔''

''لوگوں سے مراد صنف نازک!'' ازکی کی چھوٹی بہن اقصیٰ نے ٹکڑا لگایا۔

''بالکل!'' سمیر چہکا ''ویسے حوصلہ رکھیں بھائی پہلی ملاقات میں کسی کو جانے بغیر کیسے خوش ہو سکتا ہے' ممکن ہے دوسری ملاقات میں اصبح بھی آپ سے مل کر خوش ہو۔ کیوں ہمشیرہ صحیح کہہ رہا ہوں نا۔''

اصبح نے اپنی پیشانی سے پسینے کے قطرے صاف کئے اور ان سب کی طرف دیکھا جو شریر نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے اور اپنے دھڑکتے دل کو سنبھالتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''صحیح سمیر بھائی پہلی بار ملتے ہوئے خوشی کا اظہار محض رسمی ہی ہوتا ہے۔ ورنہ ایک اجنبی سے مل کر کوئی کیسے خوش ہو سکتا ہے۔'' اسفند کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

''بجا فرمایا آپ نے' لیکن جب اجنبی اپنے بن جائیں تو پھر تو یقیناً خوشی ہوتی ہے نا!''

اصبح لاجواب سی ہو گئی تو اقصیٰ نے' جو تینوں بہن بھائیوں سے چھوٹی تھی اسفند سے پوچھا۔

''لیکن بھائی وہ جو کتابوں میں لکھا ہوتا ہے۔ پہلی نظر میں محبت ہو گئی' پھر وہ کیا ہوتا ہے؟''

''بیوقوف' یہاں محبت کی نہیں خوشی کی بات ہو رہی ہے۔'' سمیر نے اسے سرزنش کی۔

''خوشی نہیں تو محبت تو ہو سکتی ہے نا پہلی نظر میں؟''

اسفند تھوڑا سا اس کی طرف جھکا۔ ایک بھرپور نظر اس پر ڈالی اور پھر سیدھا ہو گیا۔

''آخر کتابوں میں لکھا ہے اور کتابوں میں لکھی باتیں صدیوں کے تجربوں کا نچوڑ ہوتی ہیں۔''

''شاید۔'' گو اصبح اب اپنے کلاس فیلو لڑکوں سے بات کرتے ہوئے گھبراتی نہ تھی لیکن اس وقت خود کو مسلسل اسفند کی نگاہوں کے حصار میں پا کر گھبرا رہی تھی ''مجھے اس کا تجربہ نہیں ہے۔''

''کیا اب بھی نہیں؟'' اسفند نے جیسے سرگوشی سی کی اور پھر یک دم مڑ گیا اور ازکی کے قریب جا کر اس کے سر کے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے بکھیرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

''میں تمہیں لینے آیا ہوں ڈیڈی نیچے گاڑی میں انتظار کر رہے ہیں۔ جیولر کے ہاں جانا ہے۔''

''اوہ......!'' ازکی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''آپ نے آتے ہی کیوں نہیں بتایا۔ ڈیڈی خفا ہوں گے دیر کرنے پر۔''

''کچھ نہیں کہیں گے۔ پرائی جو ہونے والی ہو...... چلو۔'' جاتے جاتے اس نے ایک بھرپور نظر اس پر ڈالی تھی اور اس نے سہم کر سوچا تھا۔

''اگر آغا جان کو پتا چل جائے کہ میں یوں کھلے چہرے کے ساتھ اور اتنی بے تکلفی کے ساتھ اس طرح بیٹھی ہوں تو وہ کتنے خفا ہوں گے۔'' ستارہ نے شاید اس کے چہرے سے اس

کی کیفیت محسوس کرلی تھی۔

"تم کچھ ان ایزی فیل کر رہی ہو صبی' یار یہ سب اپنے ہیں۔ ریلیکس ہو جاؤ۔"

"اصبح آپی آپ نے ازکی باجی کی شادی کی ساری تقریبات میں حصہ لینا ہے۔" اُس کو وہ بہت اچھی لگی تھی۔

"میں...... شاید نہ آسکوں۔"

"تم بے فکر رہو اقصیٰ' یہ شادی میں آئے گی اور میں انکل وسیط سے خود اجازت لوں گی۔"

اور ایسا ہی ہوا تھا بابا جان نے اسے اجازت دے دی تھی "ہاں ہاں کیوں نہیں' لے ہاسٹل سے تم اسے۔"

وہ بابا جان کو دیکھ کر رہ گئی تھی۔ بابا جان جو حویلی میں تو بہت خاموش اور چپ چپ رہتے تھے' لیکن یہاں انکل صمد خان کے ہاں آکر وہ مسکراتے بھی' بات بھی کرتے اور ... بھی تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کچھ دیر کے لیے ان کے چہرے سے سنجیدگی کا نقاب اتر جاتا ... وہ اس کے فون کرنے پر اسے لینے آئے تھے۔ اسے ستارہ کے ہاں آئے دو دن ہو گئے ... اور وہ امی کے لیے بہت اداس ہو رہی تھی۔ ابھی اس کے پاس چند دن تھے' پھر اگلے سال پڑھائی شروع ہو جاتی تھی اور وہ یہ چند دن امی کے پاس گزارنا چاہتی تھی' پھر جانے کب ہوتا۔

حویلی میں بھی اسفند کی کچھ کہتی نظریں اسے کئی دن تک ڈسٹرب کیے رہیں۔ امی دو تین بار بہت غور سے اسے دیکھا تھا اور وہ دل ہی دل میں شرمندہ سی ہو گئی تھی کہ کہیں ا... اس کے دل کا چور جان نہ لیں۔ کہیں انہیں اس کے چہرے پر اسفند کا کوئی عکس دکھائی نہ د... جائے' لیکن امی نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ وہ مطمئن سی ہو گئی اور اس نے دل بہلانے کی کوشش بھی کی تھی۔

یہ ایک نیچرل بات ہے کہ کسی وجیہہ مرد کے لبوں سے نکلے ایسے الفاظ کسی بھی عور... کے دل کی دنیا کو اتھل پتھل کر سکتے ہیں اور میں بھی ایک کمزور عورت ہوں' لیکن وہ چند کمز... لمحے تھے جو گزر گئے اور اب ایسا کچھ نہیں ہے' لیکن رات کو جب وہ بستر پر لیٹتی تو ... اسفند یار کانوں میں سرگوشی کرنے لگتا۔ "کیا اب بھی نہیں۔"

اور اس کا دل نارمل سے زیادہ رفتار میں دھڑکنے لگتا۔ تو کیا...... تو کیا اسے میری آنکھوں میں کچھ ایسا نظر آیا تھا کہ وہ سمجھنے لگا کہ میں اس سے پہلی ہی نظر میں محبت کرنے لگی ہوں۔ "اوہ نان سینس' اٹس امپاسیبل بھلا پہلی نظر میں کوئی کیسے کسی کی محبت میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ محبت تو ہولے ہولے دل کے اندر اترتی ہے اور اپنی جگہ بناتی ہے۔ چاند کی سبک و نرم چاندنی کی طرح دھیرے دھیرے۔" اور اس کے دل میں بھی محبت ہولے ہولے چاند کی سبک و نرم چاندنی کی طرح جگہ بنا رہی تھی اور یہی بات اسے پریشان کر رہی تھی۔

ازکی کی شادی میں کتنی ہی بار اس کا اسفند یار سے سامنا ہوا تھا اور ہر بار ہی اسفند یار کی کچھ کہتی نظروں نے اس کی دھڑکنیں بے ترتیب کر دی تھیں۔

مہندی والے دن وہ اپنا ستاروں بھرا آنچل سنبھالتی ستارہ کے ساتھ ان کے گیٹ سے نکل رہی تھی کہ اندر آتا اسفند یک دم ٹھٹک کر رک گیا تھا۔

"یقین نہیں آتا کہ آپ اسی دنیا کی مخلوق ہیں۔ سچ بتائیں کہیں آپ آسمان سے تو نہیں اتریں۔" اس کے لبوں پر دلکش اور شریر سی مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں لو دیتے جذبے۔

وہ یک دم گھبرا گئی تھی اور اس نے گھبرا کر ستارہ کو دیکھا۔ پتا نہیں ستارہ کیا سوچے گی' لیکن ستارہ بھی مسکرا رہی تھی۔

"ہاں لالہ مجھی تو لگتا ہے سچ مچ آسمان سے ہی اتری ہے۔" اور ایک بے حد گہری نظر اس پر ڈال کر اسفند نے نظریں اس کے چہرے سے ہٹائی تھیں۔

لیکن پھر سارا وقت اس کا کہا یہ جملہ اس کی سماعتوں میں گونجتا رہا۔ دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوتیں اور رخساروں پر گلابیاں بکھر جاتیں۔

"یہ...... یہ اسفند یار اس طرح کیوں دیکھتا ہے مجھے...... اور کیوں بات کرتا ہے ایسے......"

وہ اس کی نظروں کے حصار سے جتنا بچنا چاہتی تھی اتنا ہی اس کی نظریں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔

شادی میں اس نے بہت انجوائے کیا۔ ازکی کی شادی پنجاب کے ایک زمیندار گھرانے میں ہو رہی تھی۔ سو سرحد اور پنجاب کی ملی جلی رسمیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ اتنا

زیادہ خوش اور ریلیکس اس نے کبھی زندگی میں خود کو محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ پوری طرح اس
شادی کو انجوائے کر رہی تھی' لیکن اسفند یار اسے ڈسٹرب کیے ہوئے تھا۔

وسیط خان صرف ولیمے میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ وہ ستارہ کے کمرے میں اس
کے کپڑے پریس کر رہی تھی کہ ستارہ نے اسے آ کر ان کی آمد کی اطلاع دی۔

''بابا جان آ گئے۔'' وہ یک دم خوش ہو گئی۔ وہ ان کے آنے پر ہمیشہ ایسے ہی خوش ہوا
تھی۔

''میں ذرا ان سے مل آؤں تارہ میں نے کل ولیمے میں پہننے کے لیے تمہارے کپڑے
پریس کر کے ہینگ کر دیئے ہیں۔ یہ ابھی کے لیے ہیں۔ شرٹ رہ گئی ہے خود کر لو۔''

''بابا جان یہاں ہی ہیں اور کل رات ولیمے میں شرکت کر کے پرسوں صبح واپس جائیں
گے۔ سو اطمینان سے میری شرٹ استری کرو۔ یوں بھی ابھی وہ انکل کی طرف ڈیڈی کے
ساتھ مبارکباد دینے گئے ہیں اور میں نے تمہاری یہاں موجودگی کی انہیں اطلاع دے دی
ہے۔''

''ایک شرٹ خود استری نہیں کر سکتیں!'' وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ بابا جان سے ملنے کی خوشی میں
اس سے اب کوئی کام نہیں ہو پا رہا تھا۔

''یار کہا تو ہے وہ انکل کی طرف گئے ہیں۔ کم از کم گھنٹے دو گھنٹے بعد لوٹیں گے۔''

''لیکن تارہ اب مجھ سے یہ کام نہیں ہوگا۔ میرے احساسات میرے اختیار میں نہیں
ہیں۔ جل گئی تو مجھے الزام نہ دینا۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھی۔

''بیٹھ جاؤ' مجھے اپنی شرٹ جلوانی نہیں ہے' لیکن ایک بات بتاؤ۔ تم ہمیشہ بابا جان سے
ملنے کے لیے اتنی ایکسائیٹڈ ہو جاتی ہو۔ حالانکہ جہاں تک مجھے علم ہے تم کبھی ان سے الگ
نہیں رہی ہو۔ ہاں بس اب یہ پڑھائی کے لیے جو یہاں رہنا پڑ رہا ہے' لیکن تمہارے بابا
جان مہینے میں دو چکر تو ضرور لگاتے ہیں۔ یار جب تمہاری شادی ہو جائے گی تو کیا بنے گا
تمہارا؟''

''پتا نہیں۔'' وہ افسردہ سی ہو گئی۔

''مجھے پتا نہیں ایسا کیوں لگتا ہے تارہ جیسے مجھے ایک دن بابا جان سے بچھڑ جانا ہے۔
وہاں گھر میں بھی بابا جان ڈیرے پر یا حجرے سے آتے ہیں تو مجھے لگتا جیسے میں صدیوں بعد

ان سے مل رہی ہوں۔ پتا نہیں تارہ میری پیاس کیوں نہیں بجھتی۔ اگر بابا جان کی خواہش نہ
ہوتی تو میں کبھی امی جان کو اور بابا جان کو چھوڑ کر یہاں نہ آتی۔ میرا دل چاہتا ہے میں
ہر وقت ان کے پاس رہوں' ان کے قریب' انہیں دیکھتی رہوں' سنتی رہوں۔''

''شاید تم اکلوتی ہو' اس لئے' لیکن ڈیئر ہر لڑکی کو ایک دن اپنے والدین سے بچھڑ جانا ہوتا
ہے۔'' ستارہ نے شرٹ تہہ کر کے ایک طرف رکھی تب ہی اسفند یار دستک دے کر اندر آ گیا۔

''ارے آپ!''

''ہاں بی بی۔'' اسفند نے ایک اچٹتی سی نظر اصبح پر ڈالی جو اس کے آنے پر سنبھل کر بیٹھ
گئی تھی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور وہ کارپٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ تم لڑکیوں کو اتنا بننے سنورنے کا شوق کیوں ہوتا ہے۔ ایک
دن کے لیے اتنا خرچ کرتی ہو۔ اب وہ ازکی بی بی مری جا رہی ہیں کہ پتا نہیں پارلر سے کیا
ٹائم لیا ہے۔ کس وقت جانا ہے یہ نہ ہو دیر ہو جائے' وغیرہ۔ لہٰذا وہ تمہیں بلا رہی ہیں۔ تاکہ تم
نے جو بات محترمہ پارلر والی سے کی ہے اس کے گوش گزار کر کے اسے تسلی دے سکو اور جو
ہدایات خاتون ازکی نے تمہیں دی تھیں آیا تم نے وہ بعینہٖ محترمہ کو پہنچا دی ہیں یا نہیں۔''

''یہ ایک دن ہی تو بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔'' ستارہ نے اسفند کی طرف دیکھا۔

''حالانکہ سارا ملمع صبح تک اتر جانا ہوتا ہے' ویسے یہ پارلر والی کمال کرتی ہیں۔ چھوٹی
آنکھیں بڑی ہو جاتی ہیں۔ ہونٹ خمار ہو جاتے ہیں۔ تنگ پیشانی کشادہ نظر آنے لگتی ہے۔''

''خیر' اتنا بھی مبالغہ نہ کریں۔''

''کیا یہ مبالغہ ہے مس اصبح خان؟'' اسفند نے براہ راست اس کی طرف دیکھا۔

''پتا نہیں' میں نے اس طرح پارلر سے تیار ہوئی دلہن کبھی نہیں دیکھی اس سے پہلے۔''
اس نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر نگاہیں جھکا لیں۔

''خیر اب دیکھ لیجئے گا۔ اگر آپ نے ازکی کو پہچان لیا تو مان جائیں گے آپ کو......
ایک یکسر بدلی ہوئی خاتون آئیں گی واپس پارلر سے۔'' وہ بات کرتے کرتے اچانک ستارہ
کی طرف مڑا ''تو تم چل رہی ہو میرے ساتھ۔''

''جی اسفند بھائی آپ کچھ دیر رکیں میں چینج کر کے اور ماما کو بتا کے آتی ہوں۔ اصبح تم
اتنے میں اپنے کپڑے وغیرہ پریس کر لو' میں آدھے گھنٹے میں آ رہی ہوں۔''

اس نے اسٹینڈ سے کپڑے اٹھائے اور باہر چلی گئی۔ اسفند یار نے نظریں اٹھا کر ا
دیکھا۔ گہری اندر تک اترتی نظریں۔

''آپ...... آپ اس طرح کیوں دیکھتے ہیں مجھے؟''

''بتادوں!'' اسفند کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی ''کوئی کسی کو اس طرح کیوں د
ہے اصبح؟''

اصبح نے نظریں نہیں اٹھائیں ''آپ...... آپ پلیز اس طرح نہ دیکھا کریں مجھے۔''

''تو کیسے دیکھا کروں؟'' اسفند کی نظریں اسی پر تھیں۔

''وہ...... پلیز آپ لاؤنج میں جا کر بیٹھیں۔ یہاں اس طرح اکیلے۔ اچھا نہیں لگ
مجھے۔''

''اوکے!'' اسفند ایک دم کھڑا ہو گیا۔

''آئی ایم سوری' مجھے خیال نہیں رہا' لیکن اصبح اس روز اقصیٰ نے کہا تھا پہلی نظر کی مح
تو صحیح کہا تھا اس نے۔ میں آپ کے لیے اپنے دل میں کچھ ایسا ہی محسوس کرتا ہوں۔ مجھے
لمبے لمبے ڈائیلاگ نہیں آتے' میں بہت پریکٹیکل آدمی ہوں' لیکن اصبح میں آپ سے شا
کرنا چاہتا ہوں' آپ کو اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا۔ میرا خیال ہے کہ میں آپ
بہت...... بہت محبت کرنے لگا ہوں۔''

اصبح کو اس دم یوں لگا جیسے اس کا دل دھڑک دھڑک کر بند ہو جائے گا۔ اس سے نظر
نہ اٹھائی گئیں۔

اسفند نے ایک نظر اس کی جھکی پلکوں کو دیکھا' اس کے چہرے پر پھیلتے رنگوں کو
مسکرایا ''اوکے' میں چلتا ہوں اصبح لیکن مجھے سوچیے گا ضرور۔''

وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا اور اصبح وہیں...... ساکت بیٹھی رہ گئی۔ ہاتھ گود میں ر
اپنے دھڑ دھڑ کرتے دل کو بمشکل سنبھالے' حیران اور پریشان سی وہ اسے سوچنے کا کہہ گیا!
اور وہ اسے سوچ رہی تھی۔ آج ہاسٹل واپس آئے بھی اسے ہفتہ بھر ہو گیا تھا' لیکن اسفند یار
خیال' اس کا تصور ذہن سے جیسے چپک گیا تھا۔

''میں...... آپ سے بہت محبت کرنے لگا ہوں اصبح۔'' سماعتوں میں جیسے یہ الفاظ محفو
ہو گئے تھے اور دل تھا کہ بغاوت پر آمادہ تھا۔ اکسا رہا تھا کہ اقرار کر لو اصبح خان کہ تم بھی....

تم بھی اسفند یار کے لیے اپنے دل میں کچھ محسوس کر رہی ہو۔ کوئی بہت کومل سا جذبہ کوئی بہت
خوبصورت احساس لیکن وہ بار بار اس کی نفی کر دیتی تھی۔

''نہیں' ایسا کچھ نہیں ہے بس وہ دلکش اور وجیہہ شخص ہے اس لئے......''

پورے ایک ہفتے سے وہ صحیح طرح سے اسٹڈی نہیں کر سکی تھی۔

''ایسے کیسے چلے گا اصبح خان۔'' اس نے خود کو تنبیہہ کی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

آج سنڈے تھا' اس لئے ابھی تک وہ بستر میں گھسی بیٹھی تھی۔ شیلف سے کتابیں اٹھا
کر اس نے بیڈ پر رکھیں۔ تب ہی بالوں کو تولیے سے پونچھتی ہوئی ماریہ واش روم سے باہر نکلی۔

''تو پڑھائی ہونے لگی ہے؟''

''ہاں۔''

''میرا تو دل ہی اچاٹ ہو گیا ہے پڑھائی سے' جب سے ماما نے یہ منگنی کا شوشا چھوڑا
ہے۔ خوامخواہ ذہن جنید کی طرف چلا جاتا ہے۔ حالانکہ کزن ہے میرا بچپن سے' دیکھا بھالا
ہے لیکن رشتے بدل جائیں تو ہر بات کے معنی اور مفہوم بدل جاتے ہیں۔ اس نے انگلی میں
پہنی منگنی کی رنگ کو اتار کر پھر پہنا۔

''اب دیکھو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ حضرت امریکہ میں کیا کرتے پھرتے
ہیں۔ اب خوامخواہ خیال آ جاتا ہے کہ کہیں کسی لیزا یا میری کی بانہوں میں بانہیں ڈالے نہ گھوم
رہے ہوں۔ ہر وقت ٹینشن سی رہنے لگی ہے اور دل میں عجیب عجیب سے احساسات پیدا
ہوتے ہیں۔'' اس نے ٹیبل سے برش اٹھایا۔

''یہ تو ہے!'' اصبح مسکرائی۔

''تمہارے ساتھ تو ایسا نہیں ہے نا۔ کہیں تمہاری ایجی جان بھی تمہاری منگنی کا تو نہیں
سوچ رہیں۔ ویسے وہ تمہارے کزن شاہ زر اور امان اللہ خان دونوں ہی زبردست پرسنیلٹی
کے مالک ہیں' کوئی خیال وغیرہ تو نہیں ہے ادھر؟''

''پتا نہیں۔'' اس کا دل جیسے ڈوب کر ابھرا ''کبھی ایجی جان نے ذکر نہیں کیا۔''

''میں...... میں آپ سے محبت کرنے لگا ہوں اصبح......'' سماعتوں میں اسفند یار نے
سرگوشی کی تو اس کا دل جیسے پھر پاتال میں گرنے لگا۔

''بھلا یہ کیوں...... کیا میں...... میں بھی چاہتی ہوں کہ اسفند یار۔''

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"تمہیں دونوں بھائیوں میں سے کون اچھا لگتا ہے صبی؟"

"پتا نہیں ماریہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ میں نے کبھی ان کے لیے ایسا نہیں سوچا۔ مجھے بھائیوں جیسے ہی لگتے ہیں۔"

"ہائے میں نے بھی کبھی جنید بدتمیز کے بارے میں ایسا نہیں سوچا تھا۔ ویسے وہ دونو تو میرا مطلب ہے ان میں سے کبھی کسی نے کچھ تم سے اس طرح کی کوئی بات کی۔"

"نہیں۔" اس نے الجھ کر ماریہ کو دیکھا "فار گاڈ سیک ماریہ......! یہ کیا فضول باتیں رہی ہو تم صبح سے۔ منگنی نے تمہارے اعصاب پر برا اثر ڈالا ہے۔"

"ویسے تمہارے کزن ہیں بہت بدذوق۔ میں اگر تمہارا کزن ہوتی تو اب تک تمھ اسیر کر چکی ہوتی۔" وہ ہنسی اور بالوں میں برش کرنے لگی۔ "ہاں یار۔" برش کر کے اس ٹیبل پر رکھا "تمہارے بابا جان کب آ رہے ہیں لاہور۔"

"شاید کچھ دنوں تک ابھی تو گھر پسند کیا ہے۔ آغا جان سے بات کرنی ہے انہیں ا پھر وہ انکل کو بتائیں گے گھر لینا ہے یا نہیں۔"

"میں تو بہت اداس ہو جاؤں گی تمہارے بغیر۔"

"تم میرے ساتھ ہی چلنا ماریہ میرے گھر میں رہنا۔ وہاں کون ہوگا بھلا امی' بابا جا اور میں۔ امی تم کو بہت اچھی لگیں گی اور بابا جان سے تو تم مل ہی چکی ہو۔"

"سوچوں گی دل نہ لگا تو آ جاؤں گی تمہارے دورائے۔"

اور کتنی عجیب بات ہوئی تھی۔ بابا جان ازکی کی شادی پر آئے تو ہمیشہ کی طرح جیسے انہوں نے اس کے دل کی بات جان لی تھی۔ اس کے ساتھ ہاسٹل آتے ہوئے انہوں نے بتایا تھا۔

"میں نے ثمین خان سے کہا ہے یہاں لاہور میں گھر دیکھے ہمارے لئے۔ تمہاری امی جان تمہارے بنا بہت اداس رہتی ہیں۔ جب تک تم یہاں ہو تو ہم یہاں رہیں گے تمہارے پاس۔"

"بابا جان آپ ہمیشہ ہی میرے دل کی بات جان لیتے ہیں کیسے؟"

"تم اپنے بابا جان کے دل میں جو رہتی ہو اصبح!" بابا جان نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔

"پچی بابا جان' میں نے کل شام ہی ستارہ سے کہا تھا کہ کیا ہی اچھا ہوتا جو بابا جان بھی

یہاں ہی رہتے اور میں بھی تمہاری طرح کالج سے ہاسٹل جانے کے بجائے گھر جایا کرتی۔ مجھے امی بہت یاد آتی ہیں اور باقی سب بھی۔"

"ابھی یہ تمہارا فائنل ایئر ہے پھر ہاؤس جاب۔ ایک دو سال تو لگ ہی جائیں گے اور پھر تو تمہیں جانا ہی ہے۔"

"کہاں بابا جان؟"

"بیٹیوں کو ایک دن والدین کا گھر تو چھوڑنا ہی ہوتا ہے اصبح بچے۔" بابا جان اداس ہو گئے تھے' اسے لگا جیسے ان کی آنکھیں گیلی ہو گئی ہوں۔

"اور تمہیں بھی......" انہوں نے مسکرانے کی کوشش کی تھی" اس لئے ہم نے سوچا۔ یہ جو ایک دو سال ہیں تمہارے ساتھ ہی رہیں۔"

"اصبح تمہارے کاکا ثمین خان آئے ہیں ملنے۔" ساتھ والے روم کی آصفہ صدف نے کمرے میں جھانک کر اسے بتایا۔

"ثمین کاکا!" وہ ایک دم اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

ثمین کاکا کبھی بھی ہاسٹل میں ملنے نہیں آئے تھے' ہاں طاہرہ آنٹی اور بچے آتے رہتے تھے۔ اس نے محسوس کیا تھا بالکل امی کی طرح ثمین کاکا بھی اس کی طرف کم ہی دیکھتے تھے۔ وہ جب کبھی ان کے ہاں جاتی تو عموماً وہ اپنی اسٹڈی میں رہتے یا اس کے آنے کے کچھ دیر بعد گھر سے چلے جاتے تھے اور بہت ہی کم اس سے مخاطب ہوتے تھے اور آج وہ اس سے ملنے آئے تھے۔

"لو بھئی تمہاری تو عید ہو گئی' لگتا ہے تمہارے انکل تمہیں لینے آئے ہیں' اب مزے سے سنڈے گزارو جا کر اپنے کزنز اور آنٹی کے ساتھ اور مزے کے کھانے کھاؤ۔ ہم یہاں اس سڑا ایسا آلو گوشت کھائیں گے' مع بگھار والے چاولوں کے۔"

"تم بھی چلنا میرے ساتھ آنٹی خوش ہوں گی۔" جلدی سے پاؤں میں چپل گھسیڑ کر اور سر پر چادر اوڑھ کر ماریہ کو آفر کرتے ہوئے وہ کمرے سے نکل گئی۔

● ● ●

وحشتو' نفرتو' چاہتو!

آؤ گریہ کریں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

خوابِ ہستی کے کوچوں میں پھرتے ہوئے
زرد چہروں پہ آنکھوں کا صحرا لئے
اور کالی عباؤں میں لپٹے ہوئے پیکرو!
آؤ گریہ کریں
وحشتو' نفرتو' چاہتو!
آؤ گریہ کریں

آہستہ آہستہ ثمین خان نے سر اٹھا کر سامنے بیٹھے وسیط خان کو دیکھا۔ شدت گریہ سے سرخ خون ٹپکاتی آنکھیں بڑھی ہوئی شیو' وحشت زدہ چہرہ۔

"یہ...... یہ سب کیسے ہوا ثمین خان؟"

"یہ سب......" اس نے پتھر ہوتی آنکھوں سے وسیط خان کو دیکھا اور اپنے ہاتھ پھیلا کر انہیں دیکھا" یہ ہاتھ...... نازک نازک لانبی انگلیوں والے آرٹسٹک ہاتھ......"

"آپ کے ہاتھ تو بالکل فنکاروں جیسے ہیں۔" ایک بار ماہ نور نے نکاح کے بعد ٹیلے پر اسے بانسری بجاتے دیکھ کر کہا تھا۔

"تو پھر تمہارے ساتھ میں بھی این سی اے میں داخلہ لے لوں گا' کیا خبر میرے اندر چھپا مصور زندہ ہو جائے۔"

"یہ ہاتھ لالہ...... یہ ہاتھ آپ کو کسی قاتل کے ہاتھ لگتے ہیں لالہ میں...... میں تو کسی پرندے کو بھی قتل نہیں کر سکتا چہ جائیکہ انسان لیکن میں نے کیا لالہ میں نے قتل کیا۔" وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگا۔

وسیط خان کے تنے ہوئے اعصاب ہلکے سے نرم ہوئے اور انہوں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

"لالہ!" وہ ایک دم ان کے سینے سے لگ گیا۔ وسیط خان نے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔

"مجھے بتاؤ ثمین خان ایک ایک بات شروع سے لے کر آخر تک۔" اپنے سے الگ کرتے ہوئے وسیط خان نے پوچھا" شام کو جرگہ بیٹھے گا اور میں اس سے پہلے سب جاننا چاہتا ہوں لفظ بلفظ۔"

"لالہ۔"

ثمین خان کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ وسیط خان کا دل چاہا وہ اپنے اس نازک دل والے بھائی کو اپنے اندر چھپا لیں۔ ہر بلا سے محفوظ کر لیں۔ کسی کی نظر اس پر نہ پڑنے دیں۔ جرگے کے فیصلے سے اس قبیلے سے ان ہواؤں سے دور لے جائیں اسے۔ اس سے بچھڑے کتنے برس بیت گئے تھے۔ وہ اس کے بے چین اور جدائی سے بھرے خط وہ اس کے فون اور آنے پر اصرار......

"یار لگتا ہے تو میری محبوبہ ہے تیرے خط کے نیچے اگر ثمین خان کے بجائے ثمینہ خان لکھ دوں تو......" وہ ہنستے لیکن خود بھی انہیں ثمین خان سے بہت پیار تھا۔

وہ تو اس کی شادی میں آنے کی تیاری کر رہے تھے۔ عذرا نے کتنی ڈھیر ساری شاپنگ کر ڈالی تھی اور ننھی اصبح کے تو ڈھیروں فراک اور ڈریسز خرید ڈالے تھے۔

"بھئی اپنے چاچو کی برات پر تو یہ اپنا روایتی قبائلی لباس پہنے گی اور وہ بی جان وہاں بنوائیں گی۔" اس کی شاپنگ دیکھ کر انہوں نے تبصرہ کیا تھا۔

سب تیاری مکمل تھی' بس سیٹ کنفرم کروانا تھی کہ آغا جان کا فون آ گیا۔

"وسیط فوراً آ جاؤ' ثمین کے ہاتھوں قتل ہو گیا ہے...... اور مجھے تمہاری ضرورت ہے یہاں۔"

"نہیں۔" انہیں یقین نہیں آیا تھا" بھلا ثمین اور قتل۔" انہیں یاد تھا کہ ایک بار جب وہ اسے غلیل کا نشانہ لگانا سکھا رہے تھے تو اس نے اچانک غلیل پھینک دی تھی۔

"نہیں لالہ' میں کسی پرندے کو نہیں مار سکتا۔ یہ چڑیا جو ابھی آپ نے ماری ہے۔ کچھ دیر پہلے یہاں پھدک رہی تھی اور کیا پتا اس کے گھونسلے میں اس کے بچے اس کا انتظار کر رہے ہوں۔"

"ایسا ہی ہے وسیط خان...... لیکن ثمین خاموش ہے کچھ نہیں کہتا۔ تم آؤ وسیط خان' سب یہاں آ کر ہی پتا چلے گا تمہیں۔"

آغا جان نے انہیں تفصیل نہیں بتائی تھی اور پھر وہ افراتفری میں عذرا اور دو سالہ اصبح کو لے کر وطن پہنچے تھے۔

"لالہ اس روز......" ثمین خان کی آواز پر وہ چونکے اور سنبھل کر اسے دیکھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

''میں ٹیلے پر بیٹھا سورج کو غروب ہوتے دیکھ رہا تھا کہ اچانک مجھے جھاڑیوں کے پیچھے ندی کی طرف ایک چیخ سنائی دی اور پھر یوں لگا جیسے کسی نے چیخنے والے کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ میں ٹیلے پھلانگتا ہوا نیچے کی طرف بھاگا جھاڑیوں کے پیچھے سے گھٹی گھٹی سی آواز آ رہی تھی۔ میں جھاڑیاں ہٹاتا ہوا تیزی سے آگے بڑھا اور میں نے دیکھا۔ میں نے دیکھا لالہ اکبر خان...... وہ درندہ لالہ' وہ درندہ ماہ نور کے منہ پر ایک ہاتھ رکھے تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے بال کھینچ رہا تھا۔ ماہ نور کو اس نے زمین پر گرا رکھا تھا۔ پتا نہیں اس کا کیا ارادہ تھا۔ شاید وہ اسے مارنا چاہتا تھا۔ شاید......'' تمکین خان کی آواز بھرا گئی۔

''میری نظر اچانک ہی ذرا فاصلے پر پڑے اس کے ہولسٹر پر پڑی تھی اور میں نے اس کا ماؤزر نکال لیا اور دھاڑا ''اکبر خان چھوڑ دو اسے ورنہ......''

''اکبر خان نے ماہ نور کو چھوڑ کر مجھے دیکھا اور عجیب طرح سے ہنسا۔ میری نظر ماہ نور پر پڑی تھی ننگے سر' پھٹے گریبان کے ساتھ وہ وحشت بھری نظروں سے مجھے اور اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ میری بیوی تھی۔ میری عزت تھی لالہ میں نے ساری گولیاں اکبر خان کے سینے میں اتار دیں۔ میں نے ایک انسان کو مار دیا لالہ...... ایک انسان کو لیکن میں کیا کرتا...... کیا کرتا۔

''میں نے ماہ نور سے ایک لفظ بھی نہیں پوچھا۔ لالہ اپنی چادر اتار کر اس کی طرف پھینکی اور اسے گھر جانے کو کہا۔ وہ وہاں سے جانا نہیں چاہتی تھی' لیکن میں نے اسے بھیج دیا۔ ابھی اندھیرا گہرا نہیں ہوا تھا۔ میں اکبر خان کی لاش کے پاس کھڑا تھا کہ وہ آ گئے۔ فیروز خان کاکا اور ان کے بھائی۔

''میں نے ساری بات بتائی۔ اپنے جرم کا اعتراف بھی کر لیا' لیکن انہوں نے میری بات نہیں مانی۔ انہوں نے کہا میں نے بلاجواز اکبر خان کو قتل کیا ہے کہ کہیں زرک خان کا دل مجھ سے پھر نہ جائے اور وہ ماہ نور کا رشتہ اکبر خان سے نہ کر دیں۔ بھلا اب جبکہ میرا نکاح ہو چکا تھا' میں ایسا کیوں سوچتا لالہ۔

''فیروز خان کاکا نے کہا۔ میں ابھی تمہارے سینے میں گولیاں اتار کر اپنا کلیجا ٹھنڈا کر سکتا ہوں' لیکن فیصلہ جرگہ کرے گا۔ جرگہ کیا فیصلہ کرے گا میں نہیں جانتا' لیکن لالہ......'' آنسو اس کے رخساروں پر لڑھک آئے۔

''اس نے جو فیصلہ کیا' وہ صحیح نہیں کیا۔ میں نے تو اس سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا

لالہ۔ ایک ملامت بھری نظر بھی نہیں ڈالی تھی۔ کیا میں نہیں جانتا تھا لالہ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اکبر خان اسے چھیڑتا ہے۔ فقرے کستا ہے' اس کی نظر اچھی نہیں ہے۔ نکاح کے بعد دو تین بار وہ مجھے ملی تھی۔ اس دلبر کی بانسری اچھی لگتی تھی۔

''وہ ندی کے کنارے بیٹھ کر تصویریں بناتی تھی اور دو تین بار دلبر کی بانسری کی آواز سن کر ادھر آ گئی تھی۔ میں بھی دلبر کے ساتھ تھا ٹیلے پر اور تب ہی اس نے بتایا تھا مجھے کہ اکبر خان اچھا آدمی نہیں ہے۔ میں نے اس سے کہا تھا وہ زرک کاکا کو بتا دے۔ تو اس نے مجھے کہا تھا ڈیڈی کہتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ جھگڑوں کا اندیشہ ہے ان کے پاس ایک ہی حل ہے کہ وہ میرے گریجویشن کا انتظار کیے بغیر میری شادی کر دیں اور انہوں نے ایسا ہی کیا تھا اور اب تو صرف ایک ہفتے کی بات تھی۔ ہماری شادی ہو جاتی۔ ہم کہیں چلے جاتے لاہور یا کہیں اور' پھر اس نے ایسا کیوں کیا لالہ! کیوں ندی میں چھلانگ لگا دی۔ نہیں لالہ وہ ایسا نہیں کر سکتی' ضرور اسے کسی نے دھکا دیا ہے ندی میں۔ ضرور لالہ! کسی نے اسے قتل کیا ہے۔ میں جاتا ہوں' جا کر زرک کاکا سے کہتا ہوں کہ وہ جرگے میں اس کے قتل کا مقدمہ بھی رکھیں۔''

اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن وسیط خان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔

''بیٹھ جاؤ تمکین' ریلیکس ہو جاؤ۔'' انہوں نے اس کے ہاتھ تھپتھپائے' لیکن خود ان کی پیشانی پر لاتعداد سلوٹیں ان کے اندرونی خلفشار کا پتا دے رہی تھیں۔ جرگہ کیا فیصلے کرے گا۔ انہیں معلوم نہ تھا' لیکن وہ اندازہ تو کر سکتے تھے۔ اپنا بچپن اور اپنی جوانی کا بہت سا وقت انہوں نے یہاں اسی زمین پر گزارا تھا۔

''لالہ...... لالہ پلیز مجھے جانے دیں۔ مجھے زرک خان کاکا سے بات کرنے دیں۔ نہیں تو میں خود لالہ اپنی بیوی کا مقدمہ جرگے میں رکھوں گا۔ وہ میری بیوی تھی اور اسے قتل کیا گیا ہے۔ میرا دل کہتا ہے لالہ......''

اس نے بے بسی سے وسیط خان کی طرف دیکھا۔ اس کی حالت نہایت دگرگوں ہو رہی تھی۔ پتا نہیں کتنی راتوں سے سویا نہیں تھا۔ وسیط خان نے اپنے لاڈلے بھائی کو ایک نظر دیکھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔

''آؤ۔'' اور اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے اندر حویلی میں چلے آئے۔ سامنے ہی عذرا ٹرے ہاتھوں میں اٹھائے ستے ہوئے چہرے کے ساتھ کچن کی طرف جا رہی تھی۔

''امی۔'' انہوں نے اسے ہولے سے آواز دی تو عذرا نے مڑ کر انہیں دیکھا۔

''شمین کے لیے گرم دودھ اور ایک ویلیم لے آؤ۔''

پھر امبح کی طرف جو ماں کی گود سے ان کی گود میں آنے کے لیے ہمک رہی تھی د
بغیر شمین خان کا ہاتھ پکڑے وہ اپنے کمرے میں چلے آئے اور اسے بیڈ پر بٹھا کر خود سا
صوفے پر بیٹھ گئے۔

کچھ دیر بعد عذرا گرم دودھ لے آئیں تو انہوں نے زبردستی شمین خان کو دودھ اور و
دی۔

''لالہ' ماہ نور نے ایسا کیوں کیا بتائیں نا؟ وہ میری عزت تھی' میری بیوی تھی کیا کرتا ا
میں بتائیں نا۔''

تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ پوچھتا تو وسیط خان بے بسی سے اسے دیکھتے ''لیٹ ج
تم بہت دنوں سے نہیں سوئے۔''

''مجھے نیند نہیں آئے گی لالہ' مجھے نیند نہیں آتی۔''

''آجائے گی یارا۔'' انہوں نے اس کے کندھوں پر دباؤ ڈالتے ہوئے اسے لٹا دیا ا
کمبل کھول کر اسے اوڑھا دیا۔

''اب آنکھیں بند کرلو اچھے بچوں کی طرح۔''

''لالہ وہ ماہ نور......''

''بس اب کوئی بات نہیں۔''

''انہوں نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور کچھ دیر بعد وہ سو گیا۔ وہ سامنے کرسی پ
بیٹھے متفکر اور پرسوچ نظروں سے دیکھتے رہے۔ سوتے میں بھی اس کے چہرے پر کرب کی
لکیریں تھیں۔

کیا ہو گیا تھا اور کیا ہونے والا تھا۔ انہوں نے ایک گہری سانس لی اور اٹھ کھڑے
ہوئے۔

باہر برآمدے میں عذرا امبح کے سامنے کھلونے رکھے تخت پر بیٹھی تھیں اور قریب ہی
کشمالہ بیٹھی تھیں۔ دونوں چپ تھیں۔

''بابا...... با......با۔'' امبح نے ہاتھ اونچے کر کے پکارا تو کشمالہ نے چونک کر انہیں

دیکھا۔

''لالہ چائے بنواؤں؟'' انہوں نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا۔

''ہاں بنوا لو' لالہ اور آغا جان کہاں ہیں؟''

''اندر بی جان کے کمرے میں......'' کشمالہ نے اٹھتے ہوئے بتایا۔

''با......با......با......با......''

امبح پھر اچھلی تو انہوں نے جھک کر اس کے رخساروں کو انگلی سے چھوا تو وہ کھل کھل کر کے ہنس پڑی اور دونوں ہاتھ اونچے کیے تاکہ وہ اسے اٹھا لیں' لیکن وہ اسے نظرانداز کر کے عذرا خانم سے نظریں چرائے بی جان کے کمرے کی طرف مڑے' لیکن عذرا نے انہیں پکارا۔

''وسیط...... خان کیا ہونے والا ہے۔ کیوں نہیں نظریں ملا رہے ہیں آپ مجھ سے' کیوں صبی کو اگنور کر رہے ہیں؟''

ان کے اندر کا کوئی خوف جیسے زبان پر آ گیا ''کچھ نہیں امی۔ تم جانتی ہو ہم سب پریشان ہیں۔''

''کیا...... کیا فیصلہ کرے گا جرگہ کچھ اندازہ تو ہو گا آپ کو؟''

''پتا نہیں امی قبل از وقت کیا کہا جا سکتا ہے؟ انہوں نے پھر ان سے نظریں چرا لیں اور تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے بی جان کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

● ● ●

"کیا بات بی جان؟"

"وسیط خان تم جانتے ہونا اپنے علاقے کی روایات۔"

"جی جی لالہ!"

"وسیط خان نے اکبر خان کو قتل کر دیا ہے، قتل کا بدلہ قتل ہے۔"

"قصاص میں رقم بھی تو دی جا سکتی ہے۔" وسیط خان نے کہا۔

"ہاں، لیکن بات تو مدعی کی ہے کہ وہ اس پر تیار ہوتا ہے کہ نہیں۔" امید خان نے پرسوچ انداز میں کہا۔

"اور دوسری صورت ہے کہ......"

"دوسری صورت؟" ان کا دل دھڑکا۔

"ہاں سوارہ!" امید خان کی آواز آہستہ تھی۔ "میری کوئی بیٹی نہیں اور نہ ہی ہماری کوئی بہن ہے جسے بدلے کے طور پر......"

"نہیں......نہیں......" ان کا دل جیسے پاتال میں گرتا چلا گیا، ایسا نہیں ہو سکتا۔ اصبح...... صبی......نہیں......" ان کے اندر سے مسلسل تکرار ہو رہی تھی' لیکن ان کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست تھے۔

"خیر...... ابھی کیا فیصلہ ہوتا ہے۔" آغا جان نے امید خان کی طرف دیکھا۔ "کیا خبر وہ رقم لے لیں قصاص میں۔"

ان کا لہجہ تسلسل دیتا ہوا تھا لیکن وسیط خان کو لگ رہا تھا، جیسے لمحے لمحے ان کا دل ڈوبتا جا رہا ہو، نیچے ہی نیچے گہرائیوں میں...... جیسے اندر کہیں کسی یقین نے پنجے گاڑ لیے تھے کہ یہی

ہوگا، یہی ہونا ہے پھر آغا جان نے کیا کہا، امید خان کیا کہہ رہے تھے۔ انہوں نے کچھ سنا نہیں۔ ان کا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ پتا نہیں کب کشمالہ نے انہیں چائے دی تھی، کب انہوں نے چائے ختم کی تھی اور کب امید خان نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں اٹھنے کے لیے کہا تھا۔ وہ جیسے سوئی سوئی سی کیفیت میں تھے۔

"وسیط خان!" بی جان کی آواز میں جانے کیا تھا کہ وہ چونکے اور انہوں نے جاتے جاتے مڑ کر بی جان کی طرف دیکھا۔ ان کے بوڑھے جھریوں بھرے چہرے پر آنسو خاموشی سے بہہ رہے تھے اور لب کپکپا رہے تھے، جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہوں۔

وہ یک دم بی جان کی نظروں سے نظریں بچا کر مڑے اور تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے آغا جان کے قریب ہو گئے، جو تخت پر خاموش بیٹھی، عذرا کے پاس رک گئے تھے، اصبح اس کی گود میں سو رہی تھی۔ آغا جان نے جانے عذرا سے کیا کہا تھا اور وہ کیا کہہ رہی تھی، انہوں نے دھیان نہیں دیا۔

"چلیے آغا جان دیر ہو رہی ہے۔" انہیں خود اپنی آواز بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"ہاں چلو۔" آغا جان نے اپنی اسٹک پر ہلکا سا بوجھ ڈالا۔ وہ عذرا کی طرف دیکھے بغیر تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے برآمدے اور پھر صحن پار کر کے گیٹ سے باہر نکل گئے اور عذرا ان کی پیٹھ پر نظریں جمائے سوچ رہی تھی۔

"یہ وہ وسیط خان تو نہیں ہے، جسے پچھلے سات آٹھ سالوں میں سے میں جانتی ہوں مہربان، ہمدرد دوست، چاہنے والا۔ یہ سچ ہے کہ یہ لمحے بہت مشکل ہیں پھر بھی وہ اپنا دکھ اس سے شیئر کر سکتا ہے لیکن کتنا اجنبی اور پرایا لگ رہا ہے۔" یورپ کی فضاؤں میں پلنے والی عذرا خانم کو اپنی روایات سے نا آشنا تو نہ تھیں پھر بھی وہ اندازہ نہیں کر پا رہی تھیں کہ کیا ہونے والا ہے اور جو کچھ ہوا، اس نے جیسے ان کے اعصاب چٹخا کر رکھ دیئے۔

"نہیں۔" وہ زور سے چیخی تھیں۔ "دلبر تمہارا دماغ خراب ہے تم فضول بولتے ہو۔"

"میں صحیح کہہ رہا ہوں، اجی جان۔"

عذرا خانم کی چیخ سن کر بی جان تسبیح ہاتھ میں لیے اپنے کمرے سے باہر نکل آئی تھیں، وہ ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"فیروز خان نے اکبر خان کے قتل کے بدلے میں شمین خان یا سوارہ کا مطالبہ کیا۔ وہ کسی بھی طرح کی رقم قصاص میں لینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ آغا جان نے انہیں بہت آفر کی، مگر اس نے کہا کہ اسے اپنے بیٹے کی زندگی کا سودا نہیں کرنا۔ جان کے بدلے جا سوارہ۔"

"اور جو کچھ اکبر خان نے کیا۔ وہ جو ماہ نور کو گھسیٹ کر لے جا رہا تھا۔" بی جان کی لرز رہی تھی۔ "اس کے متعلق جرگے نے کچھ نہیں کہا؟"

"فیروز خان نے کہا یہ جھوٹ ہے۔ قتل کا جھوٹا جواز پیدا کیا ہے شمین خان نے۔"

"اور جو گواہ تھی اسے انہوں نے مار دیا۔" کشمالہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ شمین کے حوالے سے اسے ماہ نور بہت عزیز ہو گئی تھی۔ اکبر خان کے قتل کے دوسرے روز ہی کے اندر چھلانگ لگا کر ماہ نور نے خودکشی کر لی تھی اور نیچے پتھروں سے اس کا سر ٹکرا کر گیا تھا۔ اس کے جوتے اور ایک کتاب ندی کے کنارے پڑی تھی۔

"زرک خان لالہ بھی تھے جرگے میں۔" دلبر نے بتایا۔ "انہوں نے گواہی دی تھی کہ نور نے انہیں بتایا تھا کہ وہ ندی کے کنارے تصویر بنا رہی تھی کہ اکبر خان آ گیا اور اسے سے پکڑ کر جھاڑیوں کی طرف گھسیٹنے لگا اور اس کی چیخ سن کر ٹیلے پر بیٹھا شمین خان آ گیا اور نے گولی چلائی اور......" لیکن فیروز خان نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ شمین خان کو بچانا چاہتا ہے، کیونکہ وہ اس کی رشتے کی بہن کا بیٹا ہے اور پھر افروز خان اس دوست ہے۔ زرک خان نے کہا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا اور اسے یہ بھی شک ہے کہ کسی جان بوجھ کر ماہ نور کو ندی میں گرایا ہے۔ سر پر پتھر مار کر تا کہ وہ جرگے میں گواہی نہ د سکے۔ اسے خودکشی کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ ہم نے واپس ہالینڈ جانے کا فیصلہ کر لیا لیکن......"

"ماہ نور یورپ کی تہذیب میں پلی بڑھی تھی، وہ آزاد خیال تھی، وہ شمین خان کی منگ ہونے کے باوجود محبت خان سے ملتی تھی۔" فیروز خان نے الزام لگایا۔ "اور اکبر خان اسے کرتا تھا۔"

"یہ جھوٹ ہے، میری بیٹی پر جھوٹا الزام ہے۔" زرک خان نے بہت کہا، لیکن مح خان نے جھوٹی گواہی دی کہ فیروز خان صحیح کہتا ہے، وہ اس سے ملتی تھی اور دونوں میں...

زرک خان تو شاید محبت خان کو قتل ہی کر دیتا لیکن سب نے زرک خان کو سنبھال لیا۔"

"دلبر!" بہت ضبط سے سنتے ہوئے بی جان نے اسے ٹوکا۔ "آخری فیصلہ بتاؤ۔"

"آغا جان نے کہا، انہیں جرگے کا فیصلہ منظور ہے۔" تخت پر بیٹھی عذرا خانم نے غیر ارادی طور پر گود میں سوئی امیح کے گرد اپنے بازوؤں کی گرفت سخت کر لی۔ شاید اندر کہیں ادراک ہوا تھا کسی انہونی کا۔ بی جان اس کے قریب ہی تخت پر بیٹھ گئیں۔ تب ہی سر جھکائے آگے پیچھے افروز خان، امید خان اور وسیط خان داخل ہوئے۔

"جرگے نے فیصلہ کر دیا۔" بی جان کی آواز پھٹی ہوئی تھی۔

"ہاں۔" افروز خان کی نظریں عذرا خانم کی گود میں لیٹی امیح پر پڑیں۔

"جرگے کے فیصلے کے مطابق اکبر خان کے قتل کے بدلے میں ہم اکبر خان کے بیٹے کو اپنے خاندان کی بیٹی کا رشتہ دیں گے۔ پرسوں شام اکبر خان کے بیٹے کا نکاح امیح سے کر دیا جائے گا اور پھر اس کے جوان ہونے کے بعد رخصتی ہو گی۔ تب تک امیح اس گھر میں اکبر خان کے بیٹے رحمت خان کی امانت ہے۔" افروز خان بات مکمل کر کے مڑے تو جیسے عذرا خانم ہوش میں آ کر چیخی تھیں۔

"نہیں آغا جان نہیں، سب کچھ دے دیجیے، یہ حویلی، یہ گھر، یہ جائیداد، سب کچھ دے دیجیے...... لیکن میری بیٹی کو میری امیح کو سوارہ مت بنائیے...... پلیز آغا جان آپ کو اللہ کا واسطہ......!" وہ رو رہی تھیں۔ آغا جان لب بھینچے خاموش کھڑے تھے۔ دائیں ہاتھ کا دباؤ اسٹک پر ڈالے ساکت۔

"وسیط خان!" وہ ایک دم امیح کو تخت پر لٹا کر کھڑی ہو گئیں۔ "آپ نے یہ فیصلہ قبول کر لیا خاموشی سے...... چپ چاپ اپنی بیٹی قربان کرنے کا۔" انہوں نے خاموش نگاہیں جھکائے کھڑے وسیط خان کو جھنجوڑا۔

"نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گی، خان ہرگز نہیں۔ ہم یہاں نہیں رہیں گے وسیط خان۔ چلیں، واپس انگلینڈ چلیں۔ مجھے جرگے کا فیصلہ قبول نہیں ہے، چلیں۔"

وہ انہیں بازو سے پکڑے جھنجوڑ رہی تھیں اور وہ ضبط کی انتہائی منزلوں سے گزر رہے تھے۔

"بولیں...... بولتے کیوں نہیں؟"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"ٹھیک ہے...... اوکے...... اٹس اوکے ناؤ ریلیکس۔ تم جو چاہو گی ایسا ہی ہوگا۔" اولاد کی محبت شاید ہر جذبے پر غالب آگئی تھی۔

بی جان تڑپ کر وسیط خان کو دیکھا۔ "تو کیا بھائی کی زندگی کی تمہاری نظروں میں کوئی اہمیت نہیں وسیط خان...... کیا تم...... نہیں وسیط خان، تمہیں اللہ کا واسطہ میرے بچے کو بچالو۔"

بی جان نے یک دم ہی سیدھے کھڑے وسیط خان کے قدموں پر دوپٹا رکھتے ہوئے اپنے ہاتھ ان کے پاؤں کے پر رکھ دیئے تھے۔

"وسیط خان، میرا شمین خان......" وسیط خان نے تڑپ کر اپنے پاؤں پیچھے ہٹا لیے اور جھک کر بی جان کو بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا "مجھے گنہگار مت کریں بی جان۔" اور انہیں سہارا دے کر تخت پر بٹھا کر وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے، جہاں شمین خان ولیم کے زیر اثر ان کے بیڈ پر ابھی تک گہری نیند میں تھا۔

"شمین خاناں یہ تم نے کیا کیا!" انہوں نے جھک کر اس کی پیشانی چومی اور صوفہ چیئر پر نیم دراز ہوتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ باہر سے ابھی تک عذرا خانم کے رونے کی آواز آ رہی تھی، پھر ہولے ہولے یہ آواز مدھم ہوگئی، وہ یونہی آنکھیں موندے لیٹے رہے، جانے کتنی دیر گزر گئی۔ انہیں خبر نہ ہوئی، پھر آہستہ سے دروازہ کھلا۔

"وسیط لالہ!" کشمالہ دروازے میں کھڑی تھیں۔ انہوں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں "لالہ اجی کو سمجھائیں۔ ان کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں لگتی۔" ذہنی حالت تو ان کی بھی ٹھیک نہ تھی۔ وہ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ عذرا خانم تخت پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھیں۔ اجاڑ ویران سی رخسار آنسوؤں سے تر تھے، آنکھیں سوجی ہوئی اور وہ جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھیں۔

"ہم کیوں آئے تھے یہاں؟ کیا ضرورت تھی یہاں آنے کی...... نہ آتے تو اچھا تھا، نہ آتے...... پر اب تو آ گئے ہیں، آگئے ہیں تو جا بھی تو سکتے ہیں۔"

"اجی۔" ان کے قریب بیٹھتے ہوئے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر نرمی سے وسیط خان نے کہا۔

"وہ لے گئے...... لے گئے میری اصبح کو زندہ دفن کرنے کے لیے اور کہاں تھے آپ...... کہاں تھے خان آپ......" آنسو زیادہ روانی سے بہنے لگے۔

"میں یہیں تھا اجی!" انہیں اپنا دل کٹتا ہوا سا محسوس ہوا "اور صبی کو کچھ نہیں ہوا یہاں ہی ہے۔"

"کہاں؟" عذرا نے نظریں اٹھائیں اور وسیط خان کا دل جیسے پگھل کر پانی ہونے لگا۔

"وہ بی جان کے پاس ہے، کھیل رہی ہے، لے آؤں۔" کشمالہ نے جواب دیا۔

"نہیں۔" عذرا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"چلو اٹھو، اپنے کمرے میں چل کر آرام کرلو...... پلیز گرم چائے یا دودھ لے آئیں۔" انہوں نے کشمالہ کی طرف دیکھا۔ "اور اگر کوئی ٹرانکولائیزر ہے، آپ کے پاس تو......"

"میرے پاس ولیم ہے نا، میں دیتی ہوں۔" عذرا اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں لاتی ہوں، آپ کو چاہیے۔"

وہ تیز تیز چلتے ہوئے اپنے کمرے میں بڑھ گئیں۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے وسیط خان لالہ، جیسے اجی کو کچھ ہو گیا ہے۔" کشمالہ نے جو ابھی تک وہاں ہی کھڑی تھی کہا۔

"مینٹلی ڈسٹرب ہو گئی ہے، ایک پرسکون نیند لے لے گی، تو ٹھیک ہو جائے گی۔" وسیط خان ضبط کا پیکر بنے کھڑے تھے۔ کشمالہ نے حیرت بھری نظر ان پر ڈالی۔ تب ہی شمین خان کا ہاتھ تھامے تقریباً انہیں کھینچتی ہوئی عذرا کمرے سے باہر آئیں۔

"یہ...... یہ پوچھو اپنے لالہ سے کیا ہوا ہے۔" ہولے سے انہوں نے شمین خان کو وسیط خان کی طرف دھکیلا۔ ولیم کے زیر اثر گہری نیند سویا ہوا شمین خان ابھی تک عذرا کی کوئی بات نہیں سمجھ سکا تھا۔ اپنے بیڈ پر اسے لیٹے دیکھ کر عذرا نے یک دم ہی اسے جھنجوڑ کر جگا دیا تھا۔

"تم یہاں آرام سے سوئے ہوئے شمین خان اور وہاں تمہاری زندگی کے عوض میری بیٹی کا سودا کر دیا گیا ہے۔"

"یہ...... یہ اجی کیا کہہ رہی ہے لالہ؟"

"کچھ نہیں شمین خان، تم آرام کرو۔" وسیط ان نے ہولے سے اس کے کندھے تھپکے اور کشمالہ کو اشارہ کیا کہ وہ عذرا کو کمرے میں لے جائے۔

"لیکن یہ اجی کیا کہہ رہی تھیں، کس نے کس کو قتل کر دیا؟"

"کسی نے نہیں، تم سو جاؤ، جا کر ابھی نیند پوری نہیں ہوئی تمہاری۔"

"ہاں، لیکن اب نہیں سونا مجھے۔" وہ تخت پر بیٹھ گیا اور اس کا سویا ہوا ذہن بیدار ہو نگا۔ "یہ...... یہ ابھی کیا کہا تھا اجی نے۔" سب ہی انہیں اجی کہنے لگے تھے۔

وہ چونکا اور عذرا کی طرف دیکھا۔ "میں نے کہا تھا۔" عذرا نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ کشمالہ نے اس کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔

"میں نے کہا تھا کہ اکبر خان کے قتل کے بدلے میں اصبح کو سوارہ بنا دیا جائے گا۔ یہ اصبح اسی لیے پاکستان آئی تھی، ثمین خان کہ وہ تمہاری غلطی کا کفارہ بن جائے۔"

"نہیں۔" ثمین خان اٹھ کھڑا ہوا۔ "یہ نہیں ہو سکتا لالہ، کبھی نہیں...... مجھے ایسی زندگی نہیں چاہیے۔ نہیں چاہیے لالہ! میں جا رہا ہوں، فیروز خان کاکا کے پاس۔ مجھے جرگے کا فیصلہ قبول نہیں ہے لالہ۔ کسی صورت بھی نہیں، جان کے بدلے جان چاہیے نا!"

"پاگل ہو گئے ہو ثمین خان!" وسیط خان نے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھاما۔

"چھوڑ دیجیے لالہ مجھے، نہیں چاہیے مجھے ایسی زندگی۔ موت اس زندگی سے بہت افضل ہے لالہ!" وہ ان کے بازوؤں میں مچل رہا تھا۔ وسیط خان کی گرفت سخت تھی۔

"تم لوگ عدالتوں میں کیوں نہیں جاتے ہو، وہاں جا کر فیصلہ کرواؤ۔ جن کے ہاتھوں میں تم نے ترازو تھما رکھا ہے، وہ منصف نہیں ہیں؟" عذرا کی آواز بلند تھی۔

"اجی۔" ثمین خان کو بازوؤں میں لیے لیے وسیط خان نے اونچی آواز میں کہا۔

"اپنے کمرے میں جاؤ اور مت تماشا بناؤ، اپنا اور میرا۔"

عذرا کی آنکھوں میں لمحہ بھر کو حیرت اتری، وسیط خان نے کبھی اتنی اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی۔ نرم اور دھیمے لہجے میں بولنے والے وسیط خان کی اونچی آواز میں جانے کیا تھا کہ وہ جیسے ایک دم ہوش میں آ گئیں اور کشمالہ کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر تقریباً بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

"لالہ مجھے جانے دیجیے۔ پلیز لالہ مجھے مت روکیے۔ میرے جرم، میرے گناہ کی سزا آپ کیوں بھگتیں، اصبح کیوں جھیلے۔ مجھے اپنی سزا خود ہی بھگتنے دیں لالہ!" وہ ہاتھ جوڑ رہا تھا، منتیں کر رہا تھا۔

وسیط خان کا دل کٹنے لگا لیکن وہ اسے مضبوطی سے تھامے رہے۔ تب ہی امید خان اور

بی جان ایک ساتھ ہی اس کی آوازیں سن کر کمرے سے نکلے۔

"ثمین خاناں کیا چاہتا ہے، ماں کو زندہ درگور کرنا چاہتا ہے۔ جانے سے پہلے مار دے مجھے۔"

"بی جان، بی جان ایک میری زندگی کس کس کو مار دے گی، آپ نے سوچا۔ اجی کو، لالہ کو، اصبح کو۔"

"وسیط خان اسی زمین کا بیٹا ہے، ثمین خان، وہ جانتا ہے، اپنے علاقے کی روایات کو...... اور عذرا وہ بھی اسی زمین کی بیٹی ہے، گو اس کی پرورش یہاں نہیں ہوئی، لیکن اس کے باپ نے کہا تھا مجھ سے کہ اس نے اپنی بیٹی کو اپنی ہر روایت سے روشناس کرایا ہے، یہ وقت ہم سب کے لیے بہت مشکل ہے، ثمین خان اور ہم سب نے ہی مل کر اسے کاٹنا ہے اور مجھے یقین ہے عذرا اس مشکل وقت میں خود کو اس علاقے کی بیٹی ثابت کرے گی۔"

"دروازے کی دہلیز پکڑے کھڑی عذرا کا رنگ سفید پڑ گیا، بی جان کی مضبوط آواز نے اسے یقین دلایا تھا کہ اب کوئی معجزہ نہیں ہوگا، کچھ نہیں ہو سکتا۔

"لیکن بی جان میں...... میں جی کر کیا کروں گا۔ وہ بھی تو مر گئی ہے بی جان...... میرے لیے کیا رہ گیا ہے اب۔"

"ہم سب...... ہم سب ہیں تمہارے ثمین خان۔"

"لیکن میں اس طرح نہیں جی پاؤں گا۔ میں خود کو ختم کر لوں گا۔"

اس نے خود کو وسیط خان کے بازوؤں سے چھڑا کر دیوار سے زور سے سر مارا۔ امید خان نے دوڑ کر اسے پکڑا اور اسی طرح پکڑے ہوئے کمرے میں لے گئے اور جاتے جاتے اکبر کو ڈاکٹر لانے کے لیے کہہ گئے۔

تین دن اور تین راتیں ثمین خان نیند کے انجکشن کے زیر اثر کبھی سوتے اور کبھی جاگتے رہے، عذرا کو بھی ویلیم دے دے کر پر سکون رکھنے کی کوشش کرتے رہے لیکن خود نیند وسیط خان کی آنکھوں سے روٹھ گئی تھی۔ مسلسل تین راتیں جاگ کر بھی کچھ سمجھ نہیں آیا تھا۔

"دل بڑا کرو وسیط خان۔" بی جان کہتیں۔

"جی بی جان!"

"بہادر بنو یارا!" امید خان ہمت بڑھاتے۔ "میری کوئی بیٹی ہوتی...... میں تو ثمین خان

کی زندگی کی خاطر جرگے کا فیصلہ مان لیتا۔"

"جی لالہ۔"

"تمہیں یہ قربانی دینی ہے وسیط خان۔" آغا خان التجا کرتے۔

"کیا خبر، کیا پتا اصبح کی زندگی اچھی ہی گزرے۔ آخر بیٹیاں ایک دن رخصت ہوتی ہیں۔"

وہ تڑپ کر انہیں دیکھتے۔ کیا وہ نہیں جانتے تھے کہ سوارہ بن کر جانے والی لڑکی کی حیثیت اور کیا مقام ہوتا ہے۔ دشمن کی بیٹی کوئی کیسے قبول کرتا ہے۔ اکبر خان کا بیٹا اپنے باپ کے قاتل کی بھتیجی کے ساتھ کیا سلوک کرے گا، کیا وہ نہیں جانتے تھے لیکن ان کے پاس کوئی راستہ بھی تو نہ تھا۔ ایک طرف جوان لاڈلا بھائی تھا۔ ماں، باپ تھے، بڑے بھائی تھے۔ دوسری طرف عزیز از جان بیوی کی آنکھوں کی خاموش التجائیں تھیں، معصوم اصبح کی ہنسی تھی۔

"امی معاف کر دینا۔" رات بھر سگریٹ پی پی کر ان کا گلا بھاری ہو رہا تھا۔ بیٹھے ساکت بیٹھے امی سے انہوں نے آہستہ سے کہا اور پھر نگاہیں جھکا لیں۔ باہر امید خان آ... دے رہے تھے۔

"وسیط خان، اصبح کو لے آؤ۔" اور اس شام اصبح کا نکاح اکبر خان کے اٹھارہ سالہ ... سے کر دیا گیا۔ اصبح کے ولی آغا خان تھے۔ روایت کے مطابق اصبح اب سوارہ تھی اور اسے ... وقت تک ہی اپنے باپ کے گھر رہنا تھا، جب تک وہ جوان نہ ہو جاتی۔ اس علاقے ... روایت تھی کہ اگر کوئی قتل ہو جاتا تھا تو قاتل کی بہن یا بیٹی بدلے میں مقتول کے خاندان ... حوالے کر دی جاتی، لیکن اگر قاتل کے خاندان میں کوئی جوان لڑکی نہ ہو تو پھر کسی چھوٹی ... سے ہی نکاح کر دیا جاتا۔ بھلے وہ چند دن کی ہی کیوں نہ ہو اور ایسی بچی کو سورہ (سوارہ) ... جاتا ہے اور جوان ہونے تک وہ والدین کے گھر میں ہی رہ سکتی ہے اور والدین اسے جوا... ہونے پر ان کے حوالے کرنے کے پابند ہوتے ہیں۔

ثمین خان سنبھلا تو سب کچھ بدل چکا تھا، امی خاموش تھیں اور وسیط خان چپ۔

زرک خان وطن چھوڑ کر واپس ہالینڈ چلے گئے تھے۔ وہ اپنی زمین میں دفن ہونے کیلئے آئے تھے لیکن لاڈلی بیٹی کو اس زمین کے حوالے کر کے واپس چلے گئے تھے۔ وہ پرانی دشمنیاں ختم کرنا چاہتے تھے، لیکن نئی دشمنیاں جنم لے چکی تھیں، فیروز خان اور دوسرے اپنی سازش

میں کامیاب ہو گئے تھے، وہ حویلی، زمین سب کچھ اپنے چچا زاد اور تایا زاد بھائیوں کے لیے چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلے گئے تھے۔

"اب کبھی لوٹ کر نہیں آؤں گا، افروز خان لالہ!" روتی ہوئی آواز کے ساتھ انہوں نے افروز خان سے رخصت ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"ان سب نے میرے ساتھ، میری بیٹی کے ساتھ اچھا نہیں کیا، تم بھی یہ زمین چھوڑ دو۔" لیکن افروز خان ایسا نہیں کر سکتے تھے اور اب تو بالکل بھی نہیں۔

"لالہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟" ثمین خان کے پاس ایک ہی سوال تھا "نہ کر دیتے، مت دیتے، یہ قربانی...... یہ آپ کی بیٹی ہے، کون آپ کو مجبور کر سکتا تھا، چلے جاتے آپ واپس لندن اپنی اصبح کو لے کر۔" اور وسیط خان کے پاس ایک چپ تھی۔

"میں کیا کروں گا اب لالہ، کیا میں آپ سے امی سے نظریں ملا کر بات کر سکوں گا کبھی...... کیا اصبح بڑی ہو گی تو اسے...... اس کا سامنا کر سکوں گا۔"

وسیط خان چپ چاپ اسے دیکھتے رہے۔ کیا کہتے وہ۔ انہیں جہاں اپنے ہاں کی کچھ روایات پسند تھیں۔ وہاں کچھ ناپسند بھی تھیں، جن میں ایک سوارہ بھی تھی۔ وہ کتنا اس رسم کے خلاف بولتے تھے اور کیا پتا تھا، انہیں کہ وہ خود اس کا شکار ہو جائیں گے، انہیں بہت پہلے کی اپنے ایک دوست کی بات یاد آئی تھی، جس کی بہن اس رسم کی بھینٹ چڑھ کر پندرہ سال کی عمر میں ستر سالہ بوڑھے کے حوالے کر دی گئی تھی۔ اس نے کہا تھا۔

"وسیط خان تم کتنا بھی اس کے خلاف تقریریں کر لو، لیکن خدا نہ کرے کہ کبھی تم پر ایسی آزمائش آئی، تو تم بھی میرے ماں باپ کی طرح مجبور ہو جاؤ گے وسیط خان! جوان بیٹے کی زندگی کا پلڑا بہت بھاری ہو جاتا ہے، بیٹی کے آنسو تب نظر نہیں آتے۔"

اور کتنا صحیح کہا تھا اس نے۔ آزمائش کی گھڑی آئی تھی تو وہ بھی ہار گئے تھے، ثمین خان کی زندگی کی خاطر۔

"نہیں لالہ، میں یہ شرمندگی دل میں لے کر نہیں جی سکتا۔"

"کوئی حماقت مت کرنا ثمین خان تمہیں خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واسطہ۔ تم نے کچھ کیا تو میں بھی...... نہیں تم ہماری قربانی کو رائیگاں مت کرو۔"

"تو لالہ میں کیا کروں، اتنی بڑی قسم اتنا بڑا واسطہ کیوں دیا، آپ نے مجھے۔" اس کی

آنکھوں میں آنسو تھے اور ضبط کی کوشش میں اس کا دل جیسے پھٹ جانے کو تھا، پھر اس نے گھ
چھوڑ دینے کا فیصلہ کرلیا۔

"میں یہاں نہیں رہ سکتا، میں ہر روز اجی اور لالہ کے سامنے جب آتا ہوں، تو میرا دل
پھٹنے لگتا ہے۔ آغا جان مجھے یہاں سے جانے دیں، نہیں تو میرا دل پھٹ جائے گا، یہ ندامت
مجھے مار ڈالے گی۔"

آغا جان کو تو شمین خان کی زندگی چاہیے تھی، انہوں نے اسے اجازت دے دی
"ہولے ہولے سنبھل جائے گا، تو لوٹ آئے گا۔" انہوں نے بی جان کو تسلی دی تھی، لیکن شمین
خان تو ایسا گیا کہ پھر لوٹ کر ہی نہیں آیا۔ ہاں فون پر رابطہ تھا، سالوں بعد فون کر لیتا تھا۔ ہاں
آغا جان فون کرتے رہتے، پھر بی جان کی وفات پر وہ سالوں بعد آیا تھا اور صرف چند دن رہ
کر چلا گیا۔ وہ ہالینڈ میں تھا۔ زرک خان اسے اپنے بیٹوں کی طرح ہی سمجھتے تھے، دونوں کا
دکھ سانجھا تھا، دونوں کے خیالات ایک سے تھے، وہ دل کی ہر بات زرک خان سے کر لیتا تھا،
زرک خان کو بھی اصبح کا دکھ تھا۔

دونوں مل کر روتے تھے، دونوں کے درمیان اب بھی ماہ نور کا تعلق جڑا ہوا تھا، سو زندگی
گزر رہی تھی، پھر زرک خان اصرار کرنے لگے کہ وہ شادی کر لے۔

"نہیں کاکا، کیا کروں گا، یوں ہی ٹھیک ہے۔" مگر زرک خان کا اصرار جاری رہا۔
مقصود ٹریسی کے ساتھ شادی کر کے امریکہ جا بسا تھا، دونوں چھوٹے بھی وہاں ہی چلے
گئے تھے، کبھی کبھار فون پر بات چیت ہو جاتی تھی اور بس زرک خان اجنبی دیار میں خالی ہاتھ
رہ گئے تھے۔

پھر ایک دن وہ زرک خان کے سامنے ہار گیا۔ طاہرہ کا تعلق سیالکوٹ کے ایک پنجابی
خاندان سے تھا۔ سہمی ہوئی یہ لڑکی شمین خان کو بھی اچھی لگی تھی، یوں زرک خان کے اصرار پر
وہ اس کی زندگی میں شامل ہوگئی، پھر جڑواں بیٹے بھی ہو گئے، تو زرک خان اسے وطن لوٹ
جانے پر اصرار کرنے لگے۔

"نہیں کاکا، میں نہیں جاؤں گا۔"

"اس زمین نے پناہ تو دی، مجھے شمین خان لیکن مجھ سے اس پناہ کے عوض میرے بیٹے
چھین لیے، میں وہاں سے اپنی جاہلانہ رسموں کی وجہ سے آیا تھا، لیکن میرے دل میں ہمیشہ

دھڑک رہی، اپنی زمین کی۔ میں یہاں کبھی خوش نہیں رہا، اس لیے لوٹ گیا تھا، لیکن پھر ظالموں
نے ماہ نور کو چھین لیا، یہ کیسا قانون ہے، اندھا کہ ایک کو تو قتل کی سزا دیتا ہے اور دوسرے کو
معاف کر دیتا ہے۔ میری بیٹی کے قاتل میری جائیداد پر عیش کر رہے ہیں، میں یہاں چلا آیا،
لیکن سچ بتاؤں میرا دل اب بھی تڑپتا ہے، اپنے وطن اور زمین کے لیے۔ تم چلے جانا، یہاں
سے اپنے علاقے میں بھلے نہ جاؤ۔ لاہور، کراچی کہیں بھی...... یہاں سے چلے جاؤ۔ شمین
خان اس سے پہلے کہ بچے باشعور ہوں، انہیں یہاں کی فضائیں اسیر کر لیں۔"

اور یوں شمین خان ایک طویل عرصے کے بعد وطن لوٹ آیا تھا، مگر اس نے لاہور میں
رہائش اختیار کی تھی، جہاں طاہرہ کے ایک بھائی بھی رہتے تھے، شمین خان لاہور آ کر بھی حویلی
نہیں گئے تھے۔ ہاں آغا جان سے بات ہوتی رہتی تھی۔

اور اب تو وسیط خان سے بھی ملاقات ہوتی رہتی تھی، وہ جب بھی لاہور آتے، شمین خان
سے ملنے ضرور جاتے، لیکن شمین خان کی نظریں جھکی رہتیں۔ ان کے دل کو جیسے کوئی کچوکے لگاتا
رہتا۔

وسیط خان کی ہنسی کو چھیننے والا میں ہوں۔

ان کے دل کو دکھ دینے والا میں ہوں۔

اور اجی کا سامنا کرنے کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے سب کے بے حد
اصرار پر ایک بار طاہرہ اور بچوں کو حویلی بھیجا بھی لیکن خود نہیں گئے۔

"یہ سب نصیب میں لکھا تھا، شمین خان، اب بھول جاؤ اسے۔"

آغا جان اسے ملنے آئے، تو سمجھایا لیکن وہ کیا کرتے اپنے دل کا جو سمجھتا ہی نہیں تھا۔

اصبح کو عبدالصمد خان کے ہاں دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گئے تھے، ان کا بہت دل چاہا تھا
کہ اسے اپنے سینے میں چھپا لیں لیکن وہ ضبط کیے اسے دیکھتے رہے۔ ان کی نگاہوں کے
سامنے اکبر خان آ رہا تھا، اسکے بچے آ رہے تھے، جب بی جان کی وفات پر وہ آئے تھے، تو
انہوں نے رحمت خان کو دیکھا تھا، محبت کے کندھے پر ہاتھ مار کر ہنستا ہوا، نسوار کی چٹکی منہ
میں ڈالتا۔ دل پذیر خان کی دکان کے تھڑے پر بیٹھا وہ اسے انتہائی برا لگا تھا اور اب اصبح کو
دیکھ کر تو جیسے اس کا دل کٹنے لگا تھا، تب ہی تو وہ اصبح کا سامنا کرنے سے گھبراتا تھا، جس روز
اصبح ان کے گھر آتی، وہ پوری رات جاگ کر گزارتے۔ ایش ٹرے سگریٹوں سے بھر جاتی تھی،

وہ اسے دیکھ کر اتنا اپ سیٹ ہوتے کہ موت کی تمنا کرنے لگتے۔ کیا تھا اگر...... میں خود کو
میں رکھتا۔ کیا تھا اگر میرے جرم کی سزا اسے بھگتنی ہے۔ یہ سوچ ہی از حد اپ سیٹ کر
تھی۔

گو وہ وسیط خان سے باتیں بھی کرتے، ان سے ملتے بھی، لیکن ان کی نظریں
رہتیں، ایک شرمندہ کر دینے والا احساس گھبراہٹ طاری کر دیتا، وہ بار بار پسینہ پونچھتے۔
موضوع پر بھائی سے باتیں کرنے کے باوجود وہ ان سے اصبح کے متعلق کوئی سوال نہیں کر
تے۔ حالانکہ اصبح کو یہاں میڈیکل کالج میں پڑھتے دیکھ کر کئی بار ان کے دل میں خیال آیا
کہ کیا رحمت خان نے اسے آزاد کر دیا ہے۔

اگر آزاد نہیں کیا تو پھر ابھی تک فیروز خان کے گھر سے اصبح کے لیے مطالبہ کیوں نہ
کیا گیا اور کیا...... کوئی معجزہ، کوئی انہونی ہو گئی ہے، لیکن یہ وہ سوال تھا جو وہ بھائی سے نہ
پوچھ سکتے تھے۔

یہ سوال کیسے زخموں سے ٹانکے ادھیڑے گا، اور وہ کسی تکلیف رگ و جاں میں اتر
گی، وہ جانتے تھے۔ سو بھائی کے سامنے نگاہیں جھکائے بیٹھے تھوڑی دیر بعد پیشانی
پسینے کے قطرے صاف کرتے رہتے تھے اور جب بات کرتے کرتے اچانک وسیط خان ا
کھڑے ہوتے۔

"آؤ ثمین اصبح سے مل کر آئیں۔" تو وہ نگاہیں چرا لیتے وہ تو آج تک طاہرہ
ساتھ بھی ایک بار بھی اصبح سے ملنے نہیں گئے تھے۔

"مجھے تو ایک کام سے جانا ہے۔ یوں کریں آپ ڈرائیور کو لے جائیں۔"

اور وسیط خان ایک نظر ان پر ڈالتے اور ایک مدھم سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر ابھر کر
معدوم ہو جاتی۔ ایسی جس میں ہزاروں آنسوؤں کی نمی ہوتی۔ وہ ان کا گریز سمجھتے تھے۔

"تم تقدیر کا فیصلہ قبول کیوں نہیں کر لیتے، ثمین خان۔" وہ جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں
کہتے۔

"کیسے لالہ...... کس طرح؟" ثمین خان تڑپ کر انہیں دیکھتے اور پھر نگاہیں جھکا لیتے
اور وسیط خان اکیلے ہی اصبح سے ملنے چلے جاتے۔

مگر آج جب وسیط خان نے ان کے ڈرائنگ روم میں میرون اور بلیک کیمی نیشن

والے صوفے کی بیک پر سر رکھتے ہوئے کہا "ثمین خان! اصبح کو لے آؤ یار!"

تو وہ بنا کچھ کہے اٹھ کھڑے ہوئے "آپ رات ٹھہریں گے نا۔" جاتے جاتے انہوں
نے پوچھا۔

وسیط خان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"لیکن ابھی اجی کے آنے کا مت بتانا۔ ایک دم اجی کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہو گی اور
میں اس خوشی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

مسکراہٹ نے پھر ان کے لبوں کو چھوا...... وہی ہزاروں آنسوؤں کی نمی لیے مسکراہٹ
اور اس نمی نے ثمین خان کے دل کو بھگو دیا، ہمیشہ کی طرح...... ثمین خان اصبح کو ہاسٹل سے
لانے کے لیے تیزی سے باہر نکل گئے اور وسیط خان نے آنکھیں موند لیں۔

● ● ●

گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھی ہوئی اصبح نے کئی بار سر اٹھا کر ثمین خان کی طرف دیکھا۔
ثمین خان کی آمد حیران کن تو تھی اس کے لیے لیکن ان کا یہ کہنا کہ وہ اسے لینے آئے ہیں اور
بھی حیران کن تھا۔ ان سارے سالوں میں وہ ایک بار بھی تو اسے لینے یا ملنے نہیں آئے تھے۔
ہاں طاہرہ آنٹی ہی آتی تھیں، بچوں کے ساتھ اور اسے ضد کر کے ویک اینڈ پر لے جاتی
تھیں۔ ڈھیروں چیزیں بناتی اور منتیں کر کے کھلاتی تھیں۔

"یہ لو...... صبی یہ چکھو۔ یہ دیکھو یہ میں نے تمہارے لیے بنائی ہیں۔" اور وہ طاہرہ آنٹی
کی اس درجہ محبت پر بہت حیران ہوتی۔

"آنٹی تو خیریت سے ہیں نا؟" اس نے قدرے پریشان ہو کر پوچھا۔

"ہاں۔"

ثمین خان کے ہونٹوں پر ایک لمحہ مسکراہٹ ابھری، اس مسکراہٹ نے ان کے پورے
چہرے کو روشن کر دیا، لیکن دوسرے ہی لمحے آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی اور کسی اذیت ناک
خیال نے جیسے دل میں چٹکی لے کر پورے چہرے پر زردی سی مل دی اور وہ جو انہی کی طرف
دیکھ رہی تھی، ان کے چہرے کے بدلتے رنگ سے گھبرا گئی۔

"مگر وہ...... وہ نہیں آئیں۔"

"ہاں...... میں جو آ گیا ہوں" وہ کچھ بتاتے بتاتے رک سے گئے "لالہ آئے ہوئے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ہیں، انہوں نے بھیجا ہے تمہیں لانے کو۔" شین خان نے اس کی حیرت کو دور کرنے کے لیے بتایا۔

"بابا آئے ہیں!" اس کے چہرے پر خوشی کے رنگ شین خان کو بہت بھلے لگے۔

"اور کیا میری بیٹی بھی مجھ سے اتنی ہی محبت کرے گی، جتنی اصبح لالہ سے کرتی ہے۔

پتا نہیں، کیوں انہیں یقین نہیں تھا کہ اللہ انہیں اب کے بیٹی کی رحمت سے نواز اور انہوں نے دن رات دعائیں کی تھیں، ایک بیٹی کے لیے جب سے انہوں نے صم کے ہاں اصبح کو دیکھا تھا، تب سے...... کیا ان کا اللہ انہیں مایوس کرے گا۔ دس سال پہلے ج طاہرہ نے انہیں خوش خبری سنائی تھی تو بے اختیار انہوں نے دعا کی تھی۔

"یا رب العالمین مجھے کسی آزمائش میں نہ ڈالنا۔ بیٹیاں تیری رحمت ہوتی ہیں یا ر العالمین، بہت پیاری ہوتی ہیں، لیکن رب مجھے ڈر لگتا ہے، خوف آتا ہے، ان رسموں جنہوں نے لالہ کے دل کو کھنڈر بنا دیا ہے اور اجی کو سولی پر لٹکا دیا ہے، وہ ہر روز صلیب چڑھنے کی اذیت سہتی ہیں۔ میری مولا مجھ میں لالہ جتنا حوصلہ نہیں ہے" خدا نے انہیں بیٹا سے نواز اور پھر اتنے سالوں بعد اصبح کو دیکھ کر جانے دل میں کیا خیال آیا تھا کہ وہ اللہ بیٹی کی آرزو کر بیٹھے تھے اور نوازنے والے نے ان کی دعا سن لی تھی، طاہرہ حیران تھیں او مطمئن۔

"بابا ٹھیک تو ہیں نا؟" خوشی کی رنگوں میں تشویش کے رنگ بھی شامل ہو گئے۔ "وہ کیوں نہیں آئے۔"

"سفر کی تھکان تھی۔"

شین خان کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ ابھری، تسلی دیتی ہوئی اور شین خان کے سا چلتی ہوئی اس تسلی بھری مسکراہٹ کے باوجود بھی وہ کچھ متفکر سی لگ رہی تھی اور پھر گاڑی پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے اس نے کتنی ہی بار کچھ پوچھنے کے لیے منہ کھولا اور پھر خاموش گئی۔ تھوڑا سا راستہ جیسے بے حد لمبا ہو گیا تھا۔ گو بابا سے ملے زیادہ عرصہ تو نہیں ہوا تھا لیکن اس کا دل چاہ رہا تھا، بس پلک جھپکنے میں بابا کے پاس پہنچ جائے اور وسیط خان کے لیے بھ وقت گزارنا مشکل ہو گیا تھا۔ جب ہی تو بے حد تھکان کے باوجود وہ اٹھ کر پورچ میں آ گ تھے اور گاڑی سے اترتے ہی وہ بے چینی سے ان کی طرف لپکی تھی۔

"بابا جان۔" انہوں نے دایاں بازو پھیلا کر اسے ساتھ لگاتے ہوئے اس کے سر پر پیار کیا۔

"کیسی ہے میری بیٹی؟"

"اچھی ہوں بابا جان؟ آپ کیسے ہیں اور اجی...... اجی ٹھیک ہیں نا۔ آپ انہیں بھی لے آتے بابا۔" ہمیشہ کی طرح اس نے کہا تو وسیط خان نے ہمیشہ والا جواب نہیں دیا کہ ہاں پھر آؤں گا تو لے آؤں گا بلکہ مسکرائے۔

"ہاں...... تمہاری اجی بھی آئی ہیں۔"

"ریئلی بابا!" اس نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

انہوں نے سر ہلا دیا، تو وہ تیزی سے اندر کی طرف لپکی۔

شین خان کچھ فاصلے پر کھڑے دونوں کو دیکھ رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں دھندسی پھیلتی جا رہی تھی۔

"شین خان وہاں کیوں رک گئے ہو، آؤ۔" وسیط خان اتنے فاصلے پر کھڑے بھی جیسے ان کی سوچیں پڑھ رہے تھے۔

"کم آن یار، اتنا مت سوچا کرو، فلسفی لگنے لگے ہو۔" وسیط خان نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو ایک افسردہ سی مسکراہٹ شین خان کے ہونٹوں پر بکھری۔ وہ چند قدم چل کے وسیط خان کے برابر آ گئے۔

"لالہ آپ......"

"شین خان اس وقت کچھ مت پوچھنا۔ میں اس وقت اپنی بیٹی سے ملنی کی خوشی انجوائے کرنا چاہتا ہوں۔" وہ جیسے جان گئے تھے کہ شین خان کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔

شین خان کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے اور پیشانی پر لکیریں سی ابھر آئیں۔

"شین خاناں۔" انہوں نے شین خان کا ہاتھ ہاتھوں میں لیتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"وقت تیزی سے گزر رہا ہے، بھیک میں مانگے ہوئے لمحے بھی تیزی سے وقت کے تھال میں گرتے جا رہے ہیں، میں ان موجود لمحوں کے ایک ایک تار میں خوشی کے ہزاروں موتی پرونا چاہتا ہوں، لیکن شین خاناں پتا نہیں کیوں......" ان کی آواز بوجھل ہو گئی۔ "پتا نہیں کیوں خوشی

کے ان موتیوں کے رنگ لمحے بھر بعد ہی پھیکے پڑ جاتے ہیں۔"

ثمین خان کے دل کو جیسے کسی تیز دھار آلے نے کاٹ دیا ہو۔ انہوں نے وسیط
کے ہاتھ کو ہولے سے دبا کر جیسے ان کا حوصلہ بحال کیا لیکن جب وہ بولے تو ان کی اپنی آ
ان سے زیادہ بوجھل تھی۔

"لالہ......" تب ہی ٹی وی لاؤنج میں کھڑی اصبح نے پکارا۔

"بابا، اجی کہاں ہیں اور آنٹی بھی نہیں ہیں۔"

"وہ اسپتال میں ہیں۔" وسیط خان صوفے پر بیٹھ گئے۔

"کیوں......کیا ہوا؟" وہ بے چین ہو گئی۔

"کچھ نہیں، تمہاری آنٹی کے پاس ہیں۔"

ابھی وہ مزید کچھ پوچھنا ہی چاہتی تھی کہ ثمین خان کے موبائل کی بیپ ہوئی۔

انہوں نے کچھ دوسری طرف کی بات سن کر کہا۔

"او کے میں آرہا ہوں۔"

وسیط خان نے اسے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"بیٹی ہوئی ہے۔" ثمین خان کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے جگنو چمکے اور پھر بجھ گئے۔

"میں جاتا ہوں۔"

"میں چلوں آپ کے ساتھ۔" اصبح اٹھ کھڑی ہوئی، اسے اجی سے ملنے کی بے تا
تھی۔

"نہیں۔" ثمین خان نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا" ہم کچھ دیر تک آ جائیں گے تمہار
آنٹی اور اجی کو لے کر۔"

طاہرہ عبدالصمد خان کے اسپتال میں تھی، سو وہ بے فکر تھے اور ان کے کہنے پر ہی وسی
خان کے ساتھ گھر آئے تھے، کیونکہ بچے گھر میں اکیلے تھے۔

"ڈاکٹر فردوس ہیں یہاں اور بھر بھابی بھی ہیں، تم بے فکر ہو کر جاؤ۔" سو وہ وسیط خا
کو گھر لے کر آ گئے تھے۔

وسیط خان اور اجی اچانک ہی آئے تھے، وہ طاہرہ کو لے کر اسپتال لے جا رہے تھے
اجی اور وسیط خان بھی ان کے ساتھ ہو لیے تھے، کتنے سالوں کے بعد انہوں نے اجی کو دیکھ

ا اور دل کو اذیت دیتی ندامت نے انہیں گھیرے میں لے لیا تھا، ان کی نظریں جھک گئی
تھیں، جیسے کسی نے پپوٹوں پر منوں بوجھ رکھ دیا ہو۔

"کیسے ہو ثمین خان؟" اجی کی آواز میں ٹھہراؤ تھا اور چہرے پر گہری سنجیدگی۔ پتھریلی
ورتہ جمے ہوئے کہر کی طرح۔

ثمین خان کی پلکیں اٹھ نہ سکیں، ان کے کانوں میں انیس سال پہلے کی آوازیں گونجنے
لگیں اور وہ سارا منظر جیسے زندہ ہو گیا۔ روتی ہوئی ہاتھ جوڑتی ہوئی اجی "میری اصبح کو سوارہ
مت بناؤ۔" باوقار سی بی جان اس کی زندگی کے لیے التجا کرتی، اپنی روایات کی پاسداری کا
ل دیتی اور اجی کو سمجھاتے ہوئے وسیط خان۔

"تمہیں اس آزمائش میں پورا اترنا ہے اجی، تمہیں دل بڑا کرنا ہے۔"

"کتنا بڑا؟" معصومیت سے ان سے پوچھتی۔

"بہت بڑا۔"

"لیکن یہ دکھ تو اس بہت بڑے دل میں بھی سمانے والا نہیں خان۔"

"یہ خود ساختہ جلاوطنی کب تک ثمین خان میں تمہیں لینے آئی ہوں۔ آغا جان بہت یاد
تے ہیں تمہیں۔" ثمین ان نے بمشکل پلکیں اٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔

یہ وہ اجی تو نہیں تھیں، جن کی تصویریں دیکھ کر اس نے سوچا تھا" یہ تو اپنے قبیلے کی لگتی
فس مکھ اور باتونی سی۔ فون پر ڈھیروں باتیں کرتی، شوخ سی یہ لڑکی جو ان کی ماموں زاد
ی تھی، اور جان سے پیارے بھائی کی دلہن بھی، سپاٹ چہرہ، پتھریلا سا تاثر دیتا، آنکھوں
ں بھی عجب سخت سا تاثر اور پورا وجود تھکا تھکا سا۔ اندر دل میں گڑی ندامت نے جیسے اپنے
ے نجے انہیں چھوئے تو ان کی پلکیں پھر جھک گئیں۔

"تقدیر سے لڑا نہیں جا سکتا ثمین خان۔" اب جب وہ بولیں تو ان کی آواز میں نرمی تھی
کی چبھن۔ "تم خود کو کس جرم کی سزا دے رہے ہو، جو تمہارا نہیں ہے، یہ صدیوں پر
ط جہالت کی کوکھ سے پیدا ہونے والی ناانصافی ہے، یہ قصور ان کا بھی ہے، جنہوں نے نا
لوں کے ہاتھوں میں انصاف کا ترازو تھما رکھا ہے۔ ثمین خاناں تم اب اپنی اس خود ساختہ
ختم کرو۔"

یط خان نے اس وقت کا اجی کو بہت حیرت سے دیکھا تھا۔ جنہوں نے برسوں سے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

اتنی لمبی اور طویل بات نہیں کی تھی۔

"ہاں، شاید اب یہ سزا ختم ہو جائے۔" شمین خان کے ہونٹوں پر ایک پر اسرار مسکراہٹ ایک لمحے کو ابھر کر معدوم ہو گئی تھی۔

طاہرہ کو لیبر روم میں لے جایا گیا تھا اور وہ تینوں باہر بیٹھے تھے۔

"لالہ، آپ نے آنے کی اطلاع بھی نہیں دی۔"

شمین خان ابی سے نظریں چرائے وسیط خان کو دیکھ رہے تھے۔

"میرا تو پروگرام ہمیشہ ہی اچانک بنتا ہے۔ میں چاہ رہا تھا کہ مکان کا سودا کر... کی ادائیگی کر کے رجسٹری وغیرہ ہو جائے تو ہم جلد ہی آ جائیں، لیکن آغا جان کی طبیعت ناساز تھی اور وہ تمہارے لئے بہت بے چین تھے۔ سو ابی نے کہا آغا جان سے کہ وہ خود لے کر آئے گی۔"

"لالہ۔" شمین خان نے بے بسی سے انہیں دیکھا۔

"بس بہت ہو گئی شمین خان۔" وسیط خان نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے...

"کوئی اس طرح بھی کرتا ہے ظالما، مجھے تو تمہاری ضرورت تھی، ہر لحظہ تمہارے سہارے... تم چلے گئے اور اب...... اب تو اور بھی ضرورت ہو گی شمین خاناں" ان کی آواز ڈھے گئی۔

شمین خان کے لبوں پر وہ سوال آتے آتے رہ گیا جو جب سے وہ پاکستان آئے... ان کے ذہن و دل کو الجھاتا تھا۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر فردوس نے باہر آ کر کہا تھا۔

"ابھی کچھ دیر ہے، ہم انہیں روم میں لا رہے ہیں۔"

ٹھیک ہے میں ذرا لالہ کو اور ابی کو گھر چھوڑ کر آتا ہوں۔"

"او کے۔" ڈاکٹر فردوس چلی گئیں تو انہوں نے وسیط خان کی طرف دیکھا۔

"آیئے لالہ اور ابی آپ بھی۔"

"نہیں تم جاؤ شمین خان اور اپنے لالہ کو بھی لے جاؤ، میں یہاں رہوں گی، طاہرہ کے پاس۔" ان کے لہجے میں یکایک نرمی در آئی تھی۔

"لیکن آپ نے اتنا لمبا سفر کیا ہے، تھک گئی ہوں گی۔"

"نہیں، میں نہیں تھکی، تم جاؤ۔"

وسیط خان کھڑے ہو گئے۔ "آؤ شمین خان ابی رہے گی ادھر طاہرہ کے پاس۔"

"میں کچھ دیر میں آتا ہوں۔ کوئی مسئلہ ہو تو فون کر لیجئے گا۔ صمد لالہ کے پاس ہے میرا موبائل نمبر۔"

اور اب ابی انہیں بتا رہی تھیں۔ "بیٹی ہوئی ہے، شمین خان طاہرہ اور بچی دونوں ٹھیک ہیں۔"

"لیکن وہ ڈاکٹر فردوس تو کہہ رہی تھی کہ ابھی دیر ہے۔ سو میں اصبح کو لینے چلا گیا تھا۔ طاہرہ نے میری عدم موجودگی کو مائنڈ تو نہیں کیا؟" وہ ابی کے سامنے نگاہیں جھکائے کھڑے پوچھ رہے تھے۔

"نہیں۔" ابی کے چہرے پر ایک نرماہٹ سی تھی اور لہجے میں نرمی تھی۔ "تم بیٹھو، ابھی وہ لیبر روم میں ہی ہے۔ ڈاکٹر فردوس ابھی بتا کر گئی ہیں کہ کچھ دیر وہ انہیں ابھی لیبر روم میں ہی رکھیں گے، تھوڑا بی پی کا مسئلہ ہے۔"

"میں...... میں پتا کرتا ہوں، ڈاکٹر فردوس سے۔"

وہ بیٹھتے بیٹھتے رک گئے اور ابی کا جواب سنے بغیر باہر چلے گئے، وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی ابی کا فون سن کر پہنچے تھے، اور سیدھے کمرے میں آئے تھے۔

ابی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی اور وہ بیڈ کے ساتھ پڑے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"کیا چیز ہوتی ہے یہ اولاد بھی۔"

جب لندن کے ایک اسپتال میں اصبح پیدا ہوئی تھی، تو وہ بہت تکلیف میں تھیں اور ان کا بی پی خطرناک حد تک شوٹ کر گیا تھا، لیکن پھر بھی بڑی شدت سے انہوں نے اصبح کو دیکھنے کی خواہش کی تھی۔

"کیسی ہے وہ، میری بیٹی۔" شدت جذبات سے ان کی آواز کانپ رہی تھی۔

"بہت...... بہت پیاری۔" وسیط خان نے ان کے کان میں سرگوشی کی تھی۔ "میں ابھی اسے دیکھ کر آیا ہوں، کاٹ میں لیٹے ہوئے، جیسے وہ کسی ملک کی شہزادی ہو۔"

"میں...... میں کب دیکھوں گی اسے۔" وہ بے قرار سی تھیں۔

"بس ابھی کچھ دیر بعد۔" اور پھر جب نرس نے سرمئی آنکھوں اور بادامی بالوں والی گلابی فراک اور گلابی تولیے میں لپٹی اصبح کو ان کی گود میں ڈالا تو انہیں لگا تھا، جیسے ہفت اقلیم کی دولت ان کی گود میں آ گئی ہو۔ وہ اپنے دل میں امڈتے جذبوں کو سمجھ نہیں پا رہی تھیں،

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

لیکن اس ننھی سی جان کو دیکھ کر ان کے اندر جیسے گلستان کھل رہا تھا۔

''یہ میری ہے۔ میری وجود کا حصہ...... میری تخلیق۔''

اور اب طاہرہ نے بھی ان ہی طرح بے قرار ہو کر پوچھا تھا۔ ''اجی، کیسی ہے وہ! میری بیٹی۔''

''بالکل ثمین خان کی طرح، ویسی ہی آنکھیں ویسی ہی ناک۔''

''اب ہماری فیملی مکمل ہو گئی ہے اجی۔ میری بڑی آرزو تھی کہ میری ایک بیٹی ہو۔ بیٹیاں تو ماؤں کی سہیلیاں ہوتی ہیں نا اجی اور بیٹے وہ تو بے پروا ہوتے ہیں بے نیاز...... اور بیٹیاں ماؤں کے دکھ اپنے دل پر لیتی ہیں۔ میں سوچتی تھی اجی، کبھی مجھ پر کوئی دکھ آ پڑا تو کون محسوس کرے گا، میری تو کوئی بہن بھی نہیں ہے، ماں بھی نہیں، برسوں پہلے وہ مٹی کے ڈھیر میں چھپ گئی۔''

''خدا نہ کرے کہ تمہیں کوئی دکھ ہو طاہرہ، اللہ ثمین خان اور تمہارے بچوں کو سلامت رکھے۔'' اجی کانپ سی گئیں۔

''اجی مجھے ذرا میری بیٹی کو دکھا دیں۔''

''ہاں ابھی وہ نرس کے پاس ہے، کچھ دیر تک دکھائیں گے۔'' انہیں تسلی دے کر اجی لیبر روم سے نکل آئی تھیں اور ثمین خان کو آ کر فون کیا۔

''بیٹیاں ماؤں کی سہیلیاں ہوتی ہیں۔'' صوفے کی پشت پر ٹیک لگائے لگائے اجی کے کان میں طاہرہ کی آواز گونجی، لیکن میں نے کبھی اصبح کو قریب نہیں آنے دیا۔ کیسے ترستی تھی، وہ مجھے بات کرنے اور اپنی باتیں شیئر کرنے کے لیے اور میرا بھی دل کتنا چاہتا تھا کہ میں اپنا سینہ چیر کر اس کے سامنے رکھ دوں، اسے بتاؤں۔

اصبح میرا دل بالکل خالی ہے اور اس سے خون رستا ہے قطرہ قطرہ کر کے...... تمہارا دکھ مجھے کھائے جاتا ہے، لیکن مجھے ڈر لگتا تھا کہ کہیں پھر مجھے اسے جدا کرنا مشکل ہو جائے، کہیں میں اس کی محبت میں گرفتار ہو کر کچھ ایسا نہ کر بیٹھوں، کہ ساری قربانی رائیگاں چلی جائے، لیکن کیا ہوا میری تمام تر کوشش کے باوجود کیا میں اپنا دل پتھر کر سکی۔ کیا اس دل کو اصبح کی محبت سے خالی کر سکی اور کیا اب اسے جدا کرنا آسان ہو گا میرے لیے، کچھ بھی نہیں ہوا۔ میری ساری احتیاط فضول اور بودی تھی۔ اس کی تصویر تو میری آنکھوں میں نقش تھی۔ بند آنکھوں سے

بھی میں اسے دیکھتی تھی، اس کی طرف نگاہیں اٹھائے بغیر مجھے پتا ہوتا تھا کہ اس نے کون سے رنگ کے کپڑے پہنے ہیں، اس کے ہاتھوں میں چوڑیاں کس رنگ کی ہیں۔

میں نے اتنے سال گنوا دیئے، اسے خود سے دور رکھ کر اور خود اس سے دور رہ کر، لیکن اب نہیں...... اب نہیں، اب تو اسے چلے ہی جانا ہے دو سال بعد۔ مہلت کے صرف دو سال اور پھر شاید آنکھیں اسے کبھی نہ دیکھ سکیں یا پھر کبھی شاید زندگی کے کسی موڑ پر وہ نظر آ جائے، لیکن وہ اس اصبح سے کتنی مختلف ہو گی۔

دکھ نے جیسے ان کے دل میں بھالا سا اتارا۔ انہوں نے تڑپ کر آنکھیں کھول دیں، ان کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں، اور دل جیسے کٹ رہا تھا اور اس سے قطرہ قطرہ خون ٹپک رہا تھا۔ تب ہی دستک دے کر ثمین خان اندر آ گئے، ان کے چہرے پر عجب طرح کی جگمگاہٹ تھی۔

''میں نے اسے دیکھا ہے اجی۔'' ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی ''وہ بہت پیاری ہے، بالکل اصبح کی طرح۔''

''خدا کرے اس کا نصیب اصبح جیسا نہ ہو۔'' اجی نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ان کا لہجہ نارمل تھا، لیکن یہ نارمل سا لہجہ بھی ثمین خان کو اندر تک شرمندہ کر گیا۔ ان کے چہرے کی جگمگاہٹ بجھ گئی۔

''اور کیا خبر اس کا نصیب......'' انہوں نے سوچا۔

اس کا نصیب تو جو ہو گا سو ہو گا، لیکن ایک فیصلہ جو وہ کرنے والے تھے، اس کے متعلق وہ اس کی پیدائش سے پہلے ہی ان کے دل پر رقم ہو چکا تھا اور وہ شاید اس لیے دنیا میں آئی تھی، انہیں اس ندامت کے بوجھ سے آزاد کرانے کے لئے بیٹیاں اسی لیے ہوتی ہیں۔ ہمارے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے۔

اس تصور سے ہی ایک اذیت ان کی رگوں کو کاٹنے لگی، لالہ بیس برسوں سے اس اذیت سے گزر رہے ہیں، صرف اور صرف میری وجہ سے لیکن کیا کرتا۔ میں کیا کرتا...... غیر ارادی طور پر انہوں نے اپنی مٹھیاں بھینچیں۔

وہ میری بیوی تھی، میری عزت لیکن میں...... موت اور زندگی کا مالک نہ تھا اور میں نے وہ اختیار اپنے ہاتھ میں لیا، جو مجھے نہیں تھا اور یہ اسی کی سزا ہے۔ جسے بیس برسوں سے ہم بھگت رہے ہیں، صرف وسیط لالہ اور اجی ہی نہیں میں بھی۔

انہوں نے ذرا کی ذرا پلکیں اٹھا کر اجی کی طرف دیکھا۔ وہ جانے کہاں تھیں، ان
سے بے خبر اپنے آپ میں گم۔

اجی کا سامنا کرنے سے وہ کس قدر گھبراتے تھے اور آج وہ ان کے مقابل بیٹھے تھے
ندامت اور شرمندگی اب بھی ان کے وجود کو اسی طرح گھیرے میں لیے ہوئے تھے، پھر بھی
اجی کے سامنے بیٹھے تھے اور ان کا ذہن مستقبل کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔

* * *

''تمہارا دماغ چل گیا ہے ثمین خان کیا کہہ رہے ہو؟'' غیر ارادی طور پر وسیط خان
آواز بلند ہو گئی تھی اور پیشانی پر بے شمار شکنوں کا جال بن گیا تھا۔

''لالہ۔'' ثمین خان یک دم اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاؤں کے پاس زمین پر
گئے اور اپنے ہاتھ ان کے گھٹنوں پر رکھتے ہوئے التجا کی۔

''لالہ، میں صحیح کہہ رہا ہوں، پچھلے تین برسوں میں دعا مانگ رہا ہوں، کہ میرا رب
ایک بیٹی سے نواز دے اور میں اصبح کو آزاد کرا کے......''

''پاگل ہو گئے ہو تم!'' وسیط خان نے کسی قدر غصے سے ان کا ہاتھ اپنے گھٹنوں سے
دیا ''بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو تم، جو ہونا تھا ہو چکا۔ شاید تقدیر میں یہی لکھا تھا۔''

''لالہ...... لالہ پلیز، آپ میری بات پر غور تو کریں، سوچیں تو......''

''یہ ممکن نہیں ہے ثمین خان، مت زخموں کو کریدو، مت چھیلو انہیں۔''

''آپ ان سے بات تو کریں لالہ۔''

''پاگل ہیں وہ دیوانے ہیں۔'' وسیط خان کو پھر غصہ آ گیا۔

''وہ بیس سال سے انتقام کی آگ میں جل رہے ہیں اور اب جب یہ آگ بجھنے و
ہے، تو وہ بیس سال کا اور انتظار کریں۔ ثمین خاناں تمہارا دماغ چل گیا ہے، تم بچوں سے
زیادہ بچے بن رہے ہو۔''

ثمین خان نے بے بسی سے انہیں دیکھا اور سر جھکا لیا۔ ان سے وسیط خان کا د
برداشت نہیں ہوتا تھا۔ وہ اجی اور اصبح کی طرف دیکھ نہیں پاتے تھے اور انہیں یہی حل نظر آیا
کہ وہ اپنی بیٹی دشمن کے حوالے کر کے اصبح کو آزاد کرا لیں، لیکن کس قدر احمقانہ بات تھی
جو انہوں نے سوچی تھی، بھلا وہ مانیں گے۔ یہ بات جو بیس سال سے انتظار کر رہے ہیں۔

اور یہ بیس سال بھی انہوں نے پتا نہیں کیسے انتظار کر لیا تھا، ورنہ ہونا تو یوں تھا کہ سولہ
سال کی ہوتے ہی وہ اصبح کا مطالبہ کر دیتے اور وسیط خان انہیں انکار نہیں کر سکتا تھا کہ یہ
ہ گے کا فیصلہ تھا۔ ان کی زندگی کے عوض۔

لیکن جب عبدالصمد خان کے ہاں انہوں نے اصبح کو دیکھا تھا اور ستارہ نے انہیں بتایا
تھا کہ وہ بھی ان کے ساتھ میڈیکل کالج میں پڑھتی ہے، تو ان کے اندر جیسے کہیں کوئی گلرنگ
تتلی پر پھیلا کر رقص کرنے لگی تھی، تو کیا کوئی معجزہ ہو گیا ہے؟ کیا رحمت خان نے اسے آزاد
کر دیا ہے؟ اور کیا معجزے آج کل بھی ہوتے ہیں، لیکن یہ معجزوں کا دور نہیں تھا۔

اصبح سے نگاہیں ہٹا کر انہوں نے وسیط خان کو دیکھا تھا، جن کے چہرے پر دکھوں کی
ایک پوری کہانی رقم تھی، جن کی آنکھیں خشک تھیں، لیکن انہیں وہ روئی ہوئی سی لگی تھیں، جن
کے لب بھینچے ہوئے تھے، لیکن انہیں لگا کہ وہ بین کر رہے ہوں، تو پھر اتنی دیر کیوں؟ سوارہ
کے پاؤں میں تو زنجیریں ہوتی ہیں پھر...... ایک بڑا سا سوالیہ نشان تھا، جو ان کے سامنے تھا،
لیکن وہ وسیط خان سے اس کا جواب نہیں پوچھ سکتے تھے، بلکہ کسی سے بھی نہیں۔ نہ آغا جان
سے نہ بڑے لالہ سے۔

سب کیا سوچتے کہ وہ اصبح کو دشمن کے گھر بھیجنے کے لیے بے چین ہیں، حالانکہ کوئی ان
کا دل چیر کر دیکھتا تو اسے پتا چلتا، کہ وہ تو اصبح کے لئے دن رات دعائیں کرتے رہے، پھر
بھی ایک الجھن سی تھی اور یہ الجھن اس روز خود ہی سلجھ گئی، جب ان کی بیٹی کی پیدائش کی خبر سن
کر آغا جان اور امید خان لاہور آئے تھے۔

وہ اسی وقت اجی اور وسیط خان کو ان کے گھر چھوڑ کر آئے تھے، اجی کو گھر پسند آ گیا تھا،
گھر خرید لیا گیا تھا اور سیٹ کرنے کے بعد وہ وہاں شفٹ ہو گئے تھے، اصبح بھی ہاسٹل سے آ
گئی تھی۔

''گو مجھے زیادہ دن یہاں نہیں رہنا، صرف اصبح کی پڑھائی مکمل ہونے تک...... لیکن
پھر بھی مجھے کرائے کے گھروں میں رہنا پسند نہیں ہے۔'' وسیط خان نے ان سے کہا تھا۔

''وقت جدائی قریب آ گیا ہے ثمین خان میں اور اجی ہر لمحے اصبح کے قریب رہنا چاہتے
ہیں۔''

لہجے کی دل گرفتگی نے ثمین خان کو اندر تک گھائل کر دیا تھا، وہ بے حد اداس سے گھر میں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

داخل ہوئے تھے اور آغا جان کو دیکھ کر وہ جہاں حیران ہوئے تھے، وہاں خوش بھی ہوئے۔ آغا جان ننھی سجل کو گود میں لیے بیٹھے تھے۔

"ارے آغا جان آپ اور لالہ اس طرح اچانک۔" ان سے گلے ملتے ہوئے کہا۔

"ہاں، بس اچانک ہی پروگرام بن گیا، وہ کمند خان کئی دنوں سے آ رہا ہے پاس، سوچا وسیط خان سے بات کرلوں، خود ہی اور اپنی اور پوتی کو بھی دیکھ لوں۔"

"کمند خان کون آغا جان؟" ان کو اپنا علاقہ چھوڑے برسوں ہو چکے تھے اور ان ذہن میں کہیں کوئی کمند خان نہ تھا۔

وہ امید خان کے پاس ہی بیٹھ گئے، جو اپنی انگلی سجل کے منہ میں ڈالے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے، وہ بڑے مزے سے ان کی انگلی چوسے جا رہی تھی "یہ تو بالکل تمہارے ہے ثمین خان۔"

امید خان نے اٹھ کر اسے طاہرہ کے حوالے کیا اور واپس آ کر پھر ثمین خان کے بیٹھ گئے۔

طاہرہ اسے گود میں لیے باہر نکل گئیں، تو آغا جان نے ثمین خان کی طرف د

"کمند خان، فیروز خان کا بھائی ہے۔"

"اور وہ...... کیوں آ رہا ہے آپ کے پاس۔"

انہیں جیسے ادراک ہو گیا تھا کہ کیوں پھر بھی پوچھا، تو آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

"وہ چاہ رہا تھا کہ اب اصبح کو ان کے حوالے کر دیا جائے۔"

"نہیں!" انہوں نے بے آواز کہا اور دل جیسے کہیں گہرائیوں میں ڈوبنے لگا۔

"یوں تو اصبح کو چند سال پہلے ہی وہ لے جاتے، لیکن تمہارے لالہ نے ان سے مہلت لے لی تھی، کمند خان تب بھی مہلت دینے کے خلاف تھا، لیکن فیروز خان جو ان دنوں مرگ پر تھا، خدا نے اس کے دل میں رحم ڈال دیا، وسیط خان خود گیا تھا اس کے پا درخواست لے کر اس نے فیروز خان سے کہا تھا۔

"میری بیٹی کو ڈاکٹر بننے کا بہت شوق ہے، وہ تمہاری امانت ہے۔ اب یا چند سال اسے تمہارے گھر ہی آنا ہے، اگر اجازت دے دو تو، تمہاری مہربانی، نہ دو تو بہر حال ہم مج ہیں، اور پتا نہیں فیروز خان کے دل میں کیا آیا کہ اس نے کہا ٹھیک ہے۔ پانچ سال

سکی۔ شاید موت کو قریب دیکھ کر اللہ نے اس کے دل میں رحم ڈال دیا تھا یا پھر...... دلبر کہتا ہے کہ آخری دنوں میں وہ بالکل پاگل ہو گیا تھا اور ماہ نور کا نام لے لے کر چیختا تھا، شاید اس نے ہی ماہ نور کو مارا تھا۔"

ثمین خان کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور ضبط کی کوشش میں آنکھیں انگارہ ہو گئیں، وہ جو بظاہر ایک گھر بسا کر بیٹھے تھے، کیا ماہ نور کو بھول گئے تھے۔ شاید نہیں وہ تو روز اول سے یونہی ان کے دل میں بسیرا کیے ہوئے تھی۔

"کمند خان نے اس وقت بھی فیروز خان کی بات پر احتجاج کیا تھا اور اب فیروز خان کے بعد وہ مسلسل رحمت خان پر زور ڈال رہا تھا، اکسا رہا تھا، اسے کہ وہ اپنے باپ کے قاتل کے گھر کی بیٹی کو لائے۔ وہ تو خود رحمت خان کو عورت سے کوئی دلچسپی نہیں، پہلی بیوی کو بھی گھر لا کر بھول چکا ہے، خود سارا دن چرس والے سگریٹ پی کر ڈیرے پر بیٹھا رہتا ہے۔"

ثمین خان کے اندر ایک سنسنی سی دوڑ گئی، اصبح کا معصوم چہرہ نگاہوں کے سامنے آیا اور رگوں میں دوڑتا لہو جیسے سرد ہونے لگا، چہرے پر سرخی کی جگہ زردی سی کھنڈ آئی اور بڑے اعتماد سے سپاٹ لہجے میں بولتے آغا جان کی آواز بھی تھرتھرا گئی اور وہ یک دم چپ ہو گئے۔

طاہرہ نے اندر آ کر کھانا لگنے کی اطلاع دی، تو ان تینوں نے چونک کر طاہرہ کو دیکھا اور پھر پوری رات ثمین خان سو نہ سکے۔

طاہرہ نے ان کی بے چینی محسوس کی "کیا بات ہے ثمین، آپ بہت بے چین ہے۔ آغا جان یا لالہ نے تو کچھ نہیں کہا؟"

"نہیں۔" انہوں نے پرسوچ نظروں سے طاہرہ کو دیکھا۔

"طاہرہ اگر میں سجل کے متعلق کوئی فیصلہ کروں، تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا، کیا تم مجھے اس کے متعلق فیصلے کا اختیار دیتی ہو۔"

"ثمین خان!" طاہرہ نے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا "سجل صرف میری بیٹی تو نہیں، آپ کو اس کے متعلق ہر فیصلے کا اختیار ہے۔"

وہ بظاہر مطمئن سے ہو کر لیٹ گئے، لیکن بند آنکھوں کے پیچھے نیند نہیں تھی، وہ لفظ بنتے اور جوڑتے رہے اور پھر صبح سویرے جب کوئی بھی جاگا نہیں تھا، آغا جان بھی نماز پڑھ کر غالباً گئے تھے، وہ وسیط خان کے پاس آ گئے۔ اس سے پہلے کہ آغا خان وسیط خان تک کمند خان

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

کا مطالبہ پہنچاتے، وہ وسیط خان سے بات کر لینا چاہتے تھے۔

وسیط خان ان کی بات سن کر حیران رہ گئے۔ ثمین خان نے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ ا
خان سے بات کریں کہ رحمت خان اصبح کو آزاد کر دے اور اس کی جگہ نجل کا نکاح رحم
خان یا اس کے چھوٹے بھائی گل ریز خان سے کر دیا جائے اور وہ چاہیں تو اسی وقت نجل
لے جائیں۔

وسیط خان نے نہ صرف یہ کہ کر ان کی بات رد کر دی تھی، بلکہ ان سے کچھ خفا بھی
گئے تھے اور اب وہ بے بسی سے نظریں جھکائے بیٹھے تھے۔

"میں کیا کروں لالہ، کیا مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" انہوں نے انتہائی بے چارگی۔
ہاتھ ملائے۔

"ثمین خان مت سوچا کرو اتنا۔" وسیط خان اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قریب آ بیٹھ
"بیمار پڑ جاؤ گے۔ کبھی دیکھی ہے، اپنی شکل آئینے میں کیا حال بنا رکھا ہے تم نے، اپنا خیا
رکھا کرو۔"

"لالہ...... وہ کمند خان آغا جان کو۔"

"کچھ نہیں ہوگا ابھی۔" انہوں نے اس کے کندھے پر تھپکی۔ "فیروز خان نے مجھ۔
وعدہ کیا تھا، بہت سارے لوگوں کے سامنے اور ابھی پانچ سال نہیں ہوئے، دو سال رہتے ہ
پورے۔ میں خود آغا جان سے بات کر لوں گا، تم پریشان نہ ہو۔"

انہوں نے ننھے بچے کی طرح انہیں بہلایا اور خود بہت دکھ سے سوچا۔ دو سال بھی بیت
جائیں گے، ایک دن۔ وہ دو صدیاں نہیں ہوتے۔ کاش ان دو سالوں کا ہر ایک لمحہ ایک صد
بن جائے۔ انہوں نے انہونی سی خواہش کی اور پھر خود ہی جیسے اس خواہش پر شرمند ہو گئے ا
امی کو آواز دی۔

"امی...... امی چائے لاؤ ثمین خان آیا ہے۔" امی جو اس کی آمد سے بے خبر کچن م
تھیں، حیران ہو کر نکل آئیں۔

"خیریت ہے ثمین لالہ؟"

"ہاں خیریت ہی ہے، یونہی چلا آیا تھا، رات آغا جان اور بڑے لالہ آئے ہیں، سو
بتاتا چلوں۔"

"مجھے پتا ہی نہیں چلا، میں سمجھی اخبار والا ہوگا۔" امی نے جیسے ان کی بات سنی ہی نہیں،
پتا نہیں کس دھیان میں تھیں۔

"دودھ چولہے پر تھا، میں ابھی چائے بنا کر آتی ہوں، ناشتا کرو گے نا؟"

"نہیں، بس صرف چائے۔"

"ناشتا بھی بنا لو۔" وسیط خان نے کہا اور پوچھا "صبی اٹھ گئی۔"

"ہاں تیار ہو رہی ہے؟"

"اکٹھا ناشتا کرتے ہیں، ثمین خان اسے کالج چھوڑ دے گا، میں ذرا آغا جان اور لالہ
سے ملنے جاؤں گا۔"

"وہ ادھر نہیں آئیں گے کیا؟" امی کا دھیان نہ جانے کہاں رہتا تھا۔

"آئیں گے کیوں نہیں۔"

"اچھا۔" امی سر ہلاتے ہوئے کچن میں چلی گئیں۔

ثمین خان انہیں ہی دیکھ رہا تھا، وہ بہت بدل گئی تھیں، کچھ سال پہلے جب وہ بی جی کی
وفات پر آیا تھا، تو وہ بہت سنجیدہ اور سخت لگنے لگی تھیں، پتھریلا سا سپاٹ چہرہ، وہ بہت کم بولتی
تھیں، خاموشی سے سر جھکائے حویلی کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتی، وہ اصبح
کی طرف بھی کم ہی دیکھتی تھیں۔

لیکن لاہور آنے کے بعد انہوں نے محسوس کیا تھا، ان کے چہرے کا پتھریلا پن جیسے خود
ہی ختم ہو گیا تھا، چہرے کے نقوش میں ایک مہربان سی نرماہٹ تھی اور لہجے میں دلگداز سی
نرمی۔

وہ اصبح سے ڈھیروں باتیں کرتی تھیں۔ ناشتا بناتے ہوئے، ناشتے کی ٹیبل پر، پھر اس
کے کالج سے آنے کے بعد۔ اِدھر اُدھر کی لایعنی باتیں، اور جب کبھی وہ اصبح سے باتیں نہیں کر
ہی ہوتیں، تو کھوئی کھوئی لگتیں، کسی اور ہی دھیان میں گم۔ اپنے آپ میں مگن جیسے خود سے
گفتگو کر رہی ہیں۔

"کبھی کبھی مجھے لگتا ہے، ثمین خان جیسے امی اپنے حواس کھو رہی ہے ہولے ہولے۔"
وسیط خان نے امی کی پشت پر نگاہیں جمائے ہوئے کہا۔

"ایک ہی بات پر مسلسل بیس برس تک سوچنا، ایک ہی دکھ...... ایک ہی خوف کے تحت

بیس سال گزارنا جیسے سر پر کوئی تلوار لٹک رہی ہو اور ہر لمحہ یہ خطرہ ہو کہ گردن پر ابھی گرا ہمارا سر قلم کردے گی، اس سے تو اچھا تھا، وہ اسی وقت اصبح کو لے جاتے ہے نا!"

وہ عجب طرح سے ہنسے۔ جس میں بہت سارے ٹوٹے کانچوں کی چبھن تھی۔ "ایک بار ساری اذیتوں سے گزر جاتے۔"

شمین خان نے کچھ نہیں کہا، چپ چاپ انہیں دیکھتے رہے اور پھر نظریں جھکا لی کیونکہ بہت سارے آنسوؤں نے آنکھوں کے آگے پردہ تان لیا تھا اور اس پردے پر ساری تصویریں تھیں۔

ماہ نور کی جو بہت معصوم تھی اور تصویریں بناتی تھی، جسے این، سی اے میں جانے کا ش تھا۔

اکبر خان کی جو اسے اپنی دوسری بیوی بنانا چاہتا تھا، محض اس جائیداد کے لالچ میں زرک خان اس کے نام کرنا چاہتا تھا۔

زرک خان کی جو جہالت کی رسموں سے بھاگ گئے تھے کہ وہ اپنے بیٹوں کو قبا انتقام کی نذر کر کے کھونا نہیں چاہتے تھے، لیکن جو پھر بھی کھو گئے تھے اور جب انہوں ہالینڈ کے اسپتال کے ایک کمرے میں جان دی تھی، تو ان کے پاس ان کا اپنا کوئی نہیں تھ تینوں بیٹوں میں سے ایک بھی نہیں۔ ان کی آنکھیں ان کی راہ تکتی رہیں اور وہ امریکہ کے با رومز میں اپنی ہم رقص کی بانہوں میں بانہیں ڈالے رقص کر رہے تھے۔۔ اور اصبح جو سفید گاؤ بازوؤں پر لٹکائے لاؤنج میں داخل ہو رہی تھی، جو اس بات سے اب تک بے خبر تھی کہ سوارہ ہے اور اب وقت آنے والا تھا۔ جب وہ جان لے گی اور پھر...... پھر کیا ہوگا۔

"ارے کاکا جان آپ!" اس کے چہرے پر یک دم خوشی کے پھول سے کھل اٹھے۔

"اتنی صبح...... طاہرہ آنٹی اور بچے تو ٹھیک ہیں؟"

"ہاں۔" انہوں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "یونہی واک کے لیے نکلا تو سوچا لالہ کو اور تم سب کی خبر لیتا چلوں۔"

"یہ آپ نے اچھا کیا۔" وہ ڈائننگ ٹیبل کی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ "میرا بہت جی چا رہا تھا، سب سے ملنے کو، لیکن میرے ٹیسٹ چل رہے ہیں، آپ لے کر آئیں نا آنٹی او بچوں کو۔"

"لاؤں گا۔" شمین خان بہت سنجیدہ تھے۔

شکر ہے اب کاکا بات کر لیتے ہیں مجھ سے۔ اصبح نے دل ہی دل میں سوچا اور امی کو آواز دی۔ "امی آجائیے نا دیر ہو رہی ہے۔"

"لالہ، آپ امی کو کسی ڈاکٹر کو دکھایئے نا۔" کسی قدر جھجکتے ہوئے شمین خان نے بہت آہستہ آواز سے کہا۔

"سوچ رہا ہوں۔" وسیط خان کی آواز بھی آہستہ تھی۔ "ایک دفعہ گاؤں سے ہو آؤں، تو پھر لے چلوں گا۔ تم پتا کر کے رکھنا، کسی اچھے ماہر نفسیات کا۔"

شمین خان نے اثبات میں سر ہلا دیا اور امی کو ٹرے اٹھائے لاؤنج کی طرف آتے ہوئے دیکھنے لگا۔

* * *

فروری کا آخر تھا، دھوپ میں ہلکی تپش تھی۔ اصبح لان میں بیٹھی دھوپ سینک رہی تھی اور سامنے ہی امی بیٹھی، اسے دیکھ رہی تھیں۔

"گرمی لگنے لگی ہے، اب زیادہ دیر دھوپ میں بیٹھا نہیں جاتا۔ ہے نا امی۔"

"کرسی ادھر سائے میں کرلو۔"

"نہیں، بس اب اندر ہی چلتے ہیں، پڑھوں گی میں، کافی وقت ضائع ہوگیا۔"

"اتنا پڑھ کر کیا کرے گی، صبی، کیوں تھکتی ہے اتنا۔" امی کی آواز بھرا رہی تھی۔

"امی آپ جانتی ہیں ڈاکٹر بننا میری اور بابا جان دونوں کی خواہش ہے۔"

"اچھا...... پر جتنی دیر تو کالج رہتی ہے، میں بہت بے چینی رہتی ہوں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ میں بھی تیرے ساتھ کالج چلی جایا کروں۔" ان کی آنکھوں میں اس کے لیے محبتوں کا ایک سمندر موجزن تھا۔

"امی!" اس نے ایک دم ان کے ہاتھ تھام لیے اور اس کی آواز بھرا گئی۔

"یہ...... یہ آپ نے چار سال پہلے کہا ہوتا، تو میں کبھی یہاں نہ آتی، ڈاکٹر بننے کی خواہش کے باوجود۔"

اس نے دلگرفتگی سے سوچا اور یہ امی کو ایکدم پتا نہیں کیا ہوگیا ہے، ایک منٹ کی بھی جدائی برداشت نہیں کرسکیں، حالانکہ پہلے تو میری طرف دیکھتی بھی نہیں تھیں اور بات بھی کتنی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

کم کرتی تھیں اور اب تو جتنی دیر میں گھر میں رہوں، میرے پاس ہی رہتیں، میں پڑ
ھوں، تو اب بابا جان کو بھی فراموش کر دیتی ہیں۔ شاید یہ اس تین سالہ جدائی کا اثر ہے
انہوں نے ان تین سالوں میں مجھے بہت مس کیا ہے، تب ہی تو بابا جان کے کہنے پر
شفٹ ہو گئی ہیں، ورنہ پہلے تو حویلی چھوڑتی ہی نہیں تھیں، حالانکہ اس کے ایڈمیشن کے
عرصے بعد ایک بار وسیط خان نے کہا تھا کہ کیوں نہ وہ لاہور میں گھر لے لیں، تا کہ
ہاسٹل میں نہ رہنا پڑے، لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔

”کیا سوچنے لگی ہو؟“ امی نے پوچھا۔

”کچھ نہیں امی۔“ اس نے ان کے ہاتھ چھوڑ دیئے اور مسکرائی ”میں سوچ رہی
میں کتنی خوش قسمت ہوں، کہ مجھے آپ جیسی ماں اور بابا جان جیسے محبت کرنے والے
دیئے ہیں خدا نے۔“

”خوش قسمت!“ امی نے دل ہی دل میں کہا اور آنکھوں میں نمی تیر گئی ”کاش....
اصبح تو سچ مچ خوش قسمت ہوتی۔“ ان کے دل نے جیسے فریاد کی۔

”بس اللہ میاں ایک دو بہن بھائی دے دیتا نا تو مجھ جیسا خوش قسمت اس روئے
پر کوئی نہ ہوتا۔ شاہ زر لالہ اور امان اللہ ہیں، تو لیکن ان سے ایسی بے تکلفی تو نہیں ہے
بھائیوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ امی آپ کا بھی دل تو چاہتا ہوگا نا کہ آپ کا کوئی بیٹا ہوتا۔“

”میرا دل۔“ انہوں نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔

ان کا دل تو جیسے اسی روز مر گیا تھا، جب اصبح سوارہ بن گئی تھی ”مجھے بچے
چاہئیں۔“ انہوں نے وسیط خان سے صاف صاف کہہ دیا تھا۔

”ایک بھی نہیں۔“ انہیں ڈر لگتا تھا، خوف آتا تھا، کہ اگر وہ پھر بیٹی کی ماں بن گئیں
کل کو کسی اور کے قتل کا قصاص ادا کرنے کے لیے پھر اسے سوارہ بنا دیا گا تو۔ ”نہیں،
نہیں، مجھے مزید اولاد پیدا نہیں کرنی۔“

وسیط خان نے خاموشی سے ان کے فیصلے پر سر جھکا دیا، اس لیے کہ وہ امی کے
تھے۔ ان سے شرمندہ تھے کہ ان کی بیٹی کو بچا نہیں سکے تھے، اس رسم کی بھینٹ چڑھنے
امی کی ہی نہیں، ان کی بھی بیٹی تھی۔

لیکن وہ مجبور تھے، جب امی دونوں ہاتھ جوڑے التجا کر رہی تھیں اور وہ ان سے نظ

ائے، ننھی اصبح کو گود میں لیے امید خان کے پیچھے جا رہے تھے، اس وقت انہوں نے سوچا
تھا، وہ امی کے مجرم ہیں، سو انہوں نے ایک بار بھی امی سے بیٹے کی خواہش ظاہر نہیں کی،
ایک بار بھی نہیں کہا امی میرا نام میری نسل تو بیٹے سے چلے گی کیا، خبر خدا مہربان ہو اور بیٹا ہی
ہو۔ تمہارا خوف بے معنی ہو لیکن امی بیٹے کی خواش میں بیٹی کو جنم نہیں دینا چاہتی تھیں سو۔

”آپ کا دل امی۔“ اصبح نے مسکرا کر انہیں دیکھا، تو وہ چونکیں۔

”ہاں میرے دل نے تمہارے بعد کسی کی چاہ ہی نہیں کی، اصبح تمہیں پا کر جیسے پوری
کائنات پا لی۔“

اتنا...... اتنا چاہتی ہیں، امی مجھے اور میں یونہی ان کے متعلق وسوسوں کا شکار رہی تھی،
اس نے شرمندگی سے سوچا اور ان کے ہاتھوں کو لبوں سے لگاتے ہوئے مسکرائی۔

”آئی لو یو امی۔“ ”آئی لو یو سو مچ!“ تب ہی گیٹ کھلا اور ماریہ اٹیچی گھسیٹتے ہوئے اندر
داخل ہو رہی تھی۔

* * *

"ارے ماریہ تم!" وہ ایک دم کھڑی ہوگئی۔ ماریہ نے بھی اسے دیکھ لیا اور فوراً بولی۔
"تمہارے بغیر دل نہیں لگ رہا تھا، ہاسٹل میں سو تمہاری آفر کو یاد رکھتے ہوئے آ گئی ہوں، تمہارے پاس۔"
وہ اٹیچی وہیں چھوڑ کر اس کے پاس کرسی پر آ کر دھپ سے بیٹھ گئی اور پھر جیسے چونک کر امی کو دیکھا۔
"السلام علیکم امی!"
"وعلیکم السلام۔" امی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کھڑی ہوگئیں۔
"تم بیٹھو میں دلبر کو بھیجتی ہوں، تمہارا سامان اٹھا کر اندر لے جائے۔"
"امی۔" ماریہ نے انہیں پکارا تو وہ جاتے جاتے رک گئیں اور مڑ کر اسے دیکھا
"آپ نے میرے اس طرح یہاں آنے پر برا تو نہیں منایا۔"
"پاگل ہو۔" امی مسکرائیں "تم تو میری اصبح کی سہیلی ہو، مجھے وہ مٹی بھی بہت عزیز ہے جسے میری اصبح کے پاؤں چھوتے ہیں، میرا تو دل چاہتا ہے، انہیں بھی سنبھال کر رکھ لوں میں تو خود کہہ رہی تھی اصبح سے کہ ماریہ کو کہو یہاں آ جائے تمہارے پاس، مل کر پڑھا کرو دونوں۔"
"امی آپ بہت کیوٹ ہیں۔" ماریہ نے اٹھ کر ان کے رخسار پر بوسہ دیا اور وہ مسکراتے ہوئے اندر چلی گئیں۔
"امی کتنا کم مسکراتی ہیں اور جب مسکراتی ہیں تو کتنی اچھی لگتی ہیں۔" اصبح نے سوچا۔
"یار تمہاری ماما بہت اچھی ہیں، پتا ہی نہیں چلتا انہوں نے لندن سے اے لیول کیا ہے، میں جب بھی ان سے ملی بہت متاثر ہوئی ہوں۔" ماریہ واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

"اچھا اب بتاؤ صبح صبح کیا آفت ٹوٹ پڑی کہ بوریا بستر اٹھائے چلی آئی ہو۔"
"کوئی ایک آفت...... آفت، آفتیں!" ماریہ نے ناگواری سے ناک چڑھائی "ابھی سو رہی تھی کہ پہلے تو ان دو محترماؤں کے چیخنے سے میری نیند خراب ہوئی۔"
"کون دو محترمائیں؟" اصبح نے دلچسپی سے اسے دیکھا، اسے ماریہ کی اس طرح کی بے لانہ گفتگو بہت مزہ دیتی تھی۔
"بھئی ایک تو وہی محترمہ جو تمہارے جانے کے بعد میرے کمرے میں براجمان ہوئی یعنی نیلوفر صاحبہ...... اور دوسری وہ خالدہ خانم۔"
اس کی بات سن کر اصبح ہنسی
"لگتا ہے دونوں ایک ہی انار کی بیمار ہیں۔ واہ کیا دھواں دھار لڑائی ہوئی دونوں میں۔ پلے تو صرف اتنا ہی پڑا کہ ایک محترمہ دوسری کی طرف سے پیام صلح لے کر ان ات کی پاس گئی تھیں، لیکن اپنا دل ان کے پاس چھوڑ آئیں، لہٰذا وہ حضرت اب نیلوفر ہ کو چھوڑ کر خالدہ میڈیکل کی لف پڑھائی کے باوجود ان سے ملنے کے لیے وقت نکال کر اگ بھاگ کر جاتی ہیں۔"
"یہ تو تھی آفت...... مزید آفتیں کیا ہوئیں؟" اصبح نے پوچھا۔
"کچھ نہیں، بس ذرا میری زبان میں کھجلی ہوئی۔ میں نے دو تین مفت مشوروں سے نوازا لہٰذا توپوں کے دہانے میری طرف ہوگئے۔ اب دونوں نے اشتراک کر لیا تھا اور ک تاک کر نشانے لگا رہی تھیں اور مزید شائل اور حنا وغیرہ کا گروپ تھا، جو میری حالت زار لگا رہا تھا، کم از کم تم ہوتیں تو میری سائیڈ لیتیں۔ بس میں نے سامان اکٹھا کر لیا، میں ان محترمہ کے ساتھ نہیں رہ سکتی، کیا خبر رات کو میرا گلا ہی گھونٹ دیتیں، مجھے رقیب رو سمجھ کر حالانکہ میرا رنگ خاصا گورا ہے نا۔" اصبح ہنس رہی تھی۔
"تمہارے ساتھ ہوئی بری، خیر یہ بتاؤ ناشتا کرو گی...... یا کر لیا تھا۔"
"ناشتا کر کے ہی لیٹی تھی، سچی چار بجے سے اٹھ کر پڑھ رہی تھی، نو بجے ناشتا کیا کہ گھنٹہ آرام کر لوں لیکن...... بس چائے پلوا دو۔ ساتھ میں کچھ اسنیکس وغیرہ بھی ہو جائیں نہیں ویسے تمہارے ہاں کھانا کتنے بجے کھایا جاتا ہے؟"
"جب بابا آتے ہیں اور میں آتی ہوں کالج سے لیکن آج چھٹی ہے، بابا حویلی گئے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ہیں، میں اور امی...... اور تم...... جب تم کہو کھانا لگ جائے گا۔ ویسے تمہیں ہر وقت
پینے کی ہی فکر لگی رہتی ہے کچھ اور فکر بھی کر لیا کرو۔"

"یار میری جان کو سیکڑوں فکریں لگی ہوئی ہیں، ایک تو ماما نے منگنی کرا دی، ہر دفعہ
جاتی تھی، تو خیر تھا لیکن اب کے سپلی آ گئی تو کتنی بے عزتی ہو گی سسرال کے سامنے اسی
آ گئی ہوں، مل کر پڑھیں گے، اکیلے کہاں پڑھا جائے گا۔ ادھر ہونے والے سسر صاحب ایم
پلان کر رہے ہیں کہ گاؤں میں ایک کلینک بنوائیں گے، جہاں ان کی ڈاکٹر بہو جب
امریکہ سے آئے گی تو گاؤں کے غریبوں کا مفت علاج کرے گی، یار اب تو پاس ہو
ضروری ہو گیا ہے۔"

"مفت علاج کرنے کے لیے یا......"

"بے عزتی سے بچنے کے لیے۔" ماریہ نے فوراً کہا۔

"لیکن یہ امریکہ سے بہو آئے گی کا کیا مطلب؟" اصبح نے پوچھا۔

"یار وہ حضرت یعنی میری فیانسی امریکہ میں ہی تو ہیں اور شادی کے بعد ان کا
وہیں سیٹل ہونے کا ہے لیکن میرا نام بھی ماریہ ہے۔ پاکستان سے آئی بندے کو تو نا
دینا۔"

"دلبر کاکا۔" اصبح نے دلبر کو آواز دی، جو ٹیچی اٹھائے اندر جا رہا تھا۔

"امی سے کہنا ماریہ چائے پیے گی، ہم اندر ہی آ رہے ہیں۔"

"بنا رہی ہیں چائے۔" دلبر نے مڑ کر جواب دیا۔

"پتا ہے صبی۔" ماریہ سنجیدہ ہو گئی۔ "میں ہاسٹل سے ... تمہارے گھر تک ایک
بات سوچتی رہی ہوں کہ یہ نیلو اور خالدہ جیسی لڑکیاں اتنی پڑھی لکھی ہیں، اتنی باشعور مستقبل
ڈاکٹر کیا انہیں زیب دیتا ہے، اس طرح کی حرکت کرنا۔ یار جس کی ... بیب ہو، وہ تو ا
ہی ہے نا، پھر کتنی امیچوری بات تھی، مجھے بڑا دکھ ہوا۔"

"چھوڑو ماریہ...... کچھ لوگ ہوتے ہیں، بے صبرے تھڑدلے اور یہ اس طرح کے
مرد ایسی ہی احمق لڑکیوں کو مزید بے وقوف بناتے ہیں۔"

"ہاں وہ تمہارے اسفند یار صاحب کا کیا حال ہے، کہاں تک پہنچے۔ کیا بابا اور ا
پاس درخواست پیش کر دی۔"

"مجھے نہیں معلوم، ماریہ تم جانتی ہو، مجھے یہ سب پسند نہیں ہے۔"

"تمہارے والدین ایک دن تمہاری شادی تو کریں گے، وہ کوئی نہ کوئی تو ہوگا نا۔"

"وہ جو کوئی بھی ہوگا ماریہ اسکے متعلق ہر فیصلہ بابا نے کرنا ہے اور امی نے۔ میں نے
اسفند سے کہہ دیا تھا، کہ اس کے لیے وہ بابا سے رجوع کریں۔"

"گڈ یہ ہوئی نا بات، اس لیے تو جان دیتی ہوں، تم پر اصبح ڈیئر!"

"اچھا اب مجھے بناؤ نہیں۔" اصبح جھینپ گئی۔

"لڑکیوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے، اصبح اتنے ہی مضبوط کردار کا۔ سچی اگر یہ اسفند یار
درمیان نہ آتا اور میں نے اس کے نام پر تمہارے چہرے کے بدلتے رنگوں کو نہ دیکھا ہوتا، تو
سچی میں نے سوچ رکھا تھا، تمہیں اپنی بھابی بناؤں گی۔"

"اوہ، یہ ماریہ بھی بہت گہری نظر رکھتی ہے۔" اصبح نے سوچا۔

ستارہ کی وجہ سے کئی بار اسفند کا ذکر ہوا، اس روز بھی جب وہ فارغ بیٹھی مونگ پھلی کھا
رہی تھیں، تو ستارہ نے کہا۔

"صبی تمہیں پتا ہے اسفند بھائی تمہیں پسند کرنے لگے ہیں۔" اس کا دل بہت زور سے
دھڑکا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟ ویسے ہماری صبی ایسی ہی ہے کہ اسے کوئی ناپسند کر ہی نہیں سکتا۔"
ماریہ نے بے پروائی سے چھلکے زمین پر پھینکے۔

"وہ تو ہے لیکن مجھے لگتا ہے، اسفند بھائی صبی سے محبت کرنے لگے ہیں۔"

"تمہیں الہام ہوا ہے۔" ماریہ نے کوٹ کی پاکٹ سے مونگ پھلی نکال کر دونوں کے
ہاتھوں پر رکھی۔

"وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے، تمہاری دوست کی کہیں منگنی وغیرہ تو نہیں ہو چکی۔"

"خیر یہ تو بندہ جنرل نالج کے لیے بھی پوچھ سکتا ہے۔" ماریہ جان بوجھ کر اسے چڑا رہی
تھی۔

"انہیں لڑکیوں کی جنرل نالج سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"ہیں...... لیکن اپنی اصبح تو لڑکی ہے یار اپنے اسفند بھائی کو بتا دینا۔"

"اب میں تمہیں ماروں گی ماریہ۔" ستارہ سچ مچ چڑ گئی، اصبح خاموش بیٹھی تھی اور اس کا

دل ہاں...... اسے اپنے دل پر اختیار نہیں تھا۔ جہاں اسفند کے نام سے ہی ادھم مچ گیا تھا۔

"میں غلط نہیں کہہ رہی، ویسے اصبح اور اسفند بھائی کا جوڑا زبردست رہے گا۔ ازکیٰ آپی کی شادی میں کتنے ہی لوگوں نے اسفند بھائی کے متعلق پوچھا تھا، لیکن اسفند بھائی کی نظریں تو بس اصبح کے گرد ہی گھوم رہی تھیں، ہے نا اصبح۔"

"پتا نہیں۔" اصبح کا رنگ گلابی ہوگیا اور تب ماریہ نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

"یعنی دال میں واقعی کچھ کالا کالا ہے۔"

"ماریہ!" اصبح نے اسے گھورا۔

لیکن دل جو اقرار کر رہا تھا کہ ہاں ہے کالا کالا۔ اسفند نے نظروں ہی نظروں میں کئی پیام دیے تھے اور پھر اپنے جذبوں کا بھی اظہار کر ڈالا تھا لیکن اس نے صرف ایک ہی بات کہی تھی۔

"اسفند صاحب یہ شعبہ میرے والدین کا ہے، آپ کو مجھ سے کوئی دلچسپی ہے تو میرے والدین سے بات کریں۔"

"گڈ...... لڑکیوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے، اتنے ہی مضبوط اور پختہ کردار کا۔" اسفند کی آنکھوں میں ہزاروں کرمک شب جل اٹھے تھے۔

"میں نے یقیناً ہیرے کا انتخاب کیا ہے، اصبح خان اور مجھے اپنے انتخاب پر فخر ہے۔ اب آپ سے تب ہی بات ہوگی جب......" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر اصبح کو دیکھا تھا۔

"آپ بہت مضبوط ہیں اور آپ کو خود پر بہت اختیار ہے، لیکن مجھے اتنا اختیار نہیں، سو مجھے اتنا تو کہنے دیجیے کہ آپ نے میری نیندیں چھین لی ہیں۔ اصبح آپ نے مجھے میرا نہیں رہنے دیا، آپ کوئی جادوگرنی یا...... پتا نہیں کیا ہیں، آپ کہ آپ نے اسفند یار جیسے بندے کا دل جیت لیا، جسے آج تک کوئی نہیں جیت سکا تھا۔"

پھر وہ ایک دم ہی مڑ گیا تھا اور وہ لاؤنج میں ساکت کھڑی رہ گئی، لیکن دل میں ہزاروں چراغ جل اٹھے تھے اور سماعتوں میں ایک ہی جملہ گونج رہا تھا۔

"آپ نے مجھے میرا نہیں رہنا دیا، اصبح، آپ نے مجھے......"

اس روز ستارہ کے کمرے میں وہ اسے مجھے سوچے گا، کہہ کر چلا گیا تھا اور پھر ادھر اُدھر جب کبھی نظر پڑتی، اصبح کو اس کی نظریں سوال کرتی محسوس ہوتی تھیں۔ مجھے سوچا...... یہ مجھے

سوچا کہ نہیں...... اور وہ فوراً نظریں چرا لیتی تھی۔

پھر ہاسٹل آکر بھی وہ کتنے ہی دن ڈسٹرب رہی تھی، ستارہ کئی دن سے کالج نہیں آرہی تھی، اسے بخار تھا۔ اس روز وہ ماریہ کے ساتھ اس سے ملنے آئی تھی اور وہاں سے ہی اس نے اقصیٰ کو فون کرکے ازکیٰ کی خیر خیریت دریافت کی تھی اور اقصیٰ اس کے آنے کا سن کر فوراً آنے کے لیے تیار ہوگئی تھی اور کچھ ہی دیر بعد وہ اسفند کے ساتھ پہنچ گئی تھی اور ستارہ کے کہنے پر جب وہ کولڈ ڈرنک لینے کے لیے باہر نکلی تو لاؤنج میں بیٹھے اسفند کو دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔

"السلام علیکم!" اسفند نے کھڑے ہو کر ایک بہت گہری نظر اس پر ڈالی تھی۔

"کیسی ہیں آپ؟"

"اچھی ہوں۔"

"وہ تو آپ ہیں لیکن کیا آپ نے مجھے سوچا؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا، جب کہ دل کہہ رہا تھا، تمہارے علاوہ ان سارے دنوں میں، میں نے کچھ نہیں سوچا۔ تم کیوں اس طرح مجھے ڈسٹرب کرنے آگئے ہو۔

"اصبح، میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"تو آپ یہ بات مجھ سے کیوں کہہ رہے ہیں؟"

"تو کس سے کہوں؟" اسفند نچلے ہونٹ کا دایاں کونا دانتوں میں دبا کر مسکرائے۔

"کس سے کہا جاتا ہے؟"

"آپ بتا دیں۔"

"یہ بات والدین سے کرنے کی ہوتی ہے، اسفند یار صاحب۔" اور تب ہی اسفند نے وہ بات کہی تھی۔

"میرا خیال ہے اصبح ڈیئر تم نے کافی سے زیادہ اسفند یار کو سوچ لیا ہے، اب اسے رخصت کرو اور چلو اٹھو۔ دلبر نے چائے کے لیے بلایا ہے۔"

"کب!" وہ جھینپ گئی۔

"ابھی کچھ دیر پہلے اس نے دروازہ کھول کر اشارہ کیا تھا۔ ویسے یار یہ تمہارا دلبر کیا چیز ہے، ابھی تک مجھے اس کی سمجھ نہیں آسکی۔" ماریہ نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کبھی کبھی ایب نارمل ہو جاتا ہے، کچھ لیکن ویسے ٹھیک ہے، دراصل اس کے پورے

خاندان کو ان کے دشمنوں نے قتل کر دیا تھا، تب یہ دس سال کا تھا اور کاکا کو ملا تھا، ٹیلے کے پیچھے چھپا ہوا ڈرا سہا۔ تب کاکا اسے ساتھ لے آئے تھے، تب سے آغا جان کے پاس ہے۔ بابا جان یہاں شفٹ ہوئے، تو ان کے ساتھ ہی چلا آیا۔ شین کاکا سے بہت اٹیچڈ تھا، وہ جب چلے گئے تو بہت روتا تھا، پھر بابا جان کے ساتھ اٹیچڈ ہو گیا، کبھی کبھی تو بالکل کسی دس سالہ بچے کی طرح بی ہیو کرتا ہے، لیکن زیادہ تر نارمل ہی رہتا ہے۔" اصبح نے تفصیل بتائی۔

امی ٹرالی سجائے ان کا ہی انتظار کر رہی تھیں "ارے امی، اتنی چیزیں ہم نے دن کا کھانا بھی کھانا ہے۔" ماریہ نے بیٹھتے ہوئے کباب اٹھا کر منہ میں ڈالا۔

"تمہیں کچھ نہیں ہوگا بے فکر ہو کر کھاؤ۔" اصبح بیٹھ گئی۔

"اوئے گاجر کا حلوا بھی ہے، امی نے بنایا ہوگا۔" ماریہ اب ٹرالی میں موجود دوسری چیزوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"امی میں صرف چائے لوں گی۔"

"ایک سینڈوچ لے لو، خالی چائے مت پیو۔"

"ابھی تو ناشتا کیا تھا۔"

"کچھ نہیں ہوتا، لو ایک سینڈوچ پھر پڑھنے بیٹھ جاؤ گی، تو ہوش نہیں رہے گا کھانے پینے کا۔"

"امی، آپ فکر نہ کریں، میں اب آ گئی ہوں نا تو اس کا خیال رکھوں گی۔" ماریہ نے ایک بسکٹ اٹھا کر منہ میں ٹھونسا۔

"اتنا کھانے کے باوجود اس کا یہ حال ہے کہ لگتا ہے افریقہ سے آئی ہے اور اگر اس نے کھانا چھوڑ دیا، تو پھر کیا حال ہوگا اس کا۔"

"ہائے، اتنی دردناک باتیں نہ کرو بھی اللہ سلامت رکھے کھانے پلانے والوں کو میں، کیوں چھوڑوں گی بھلا۔ ارے ہاں......" اسے اچانک یاد آیا۔

"ایک بڑی سیڈ نیوز ہے، یار میں تو حیران ہی رہ گئی سن کر۔"

"کیوں، کیا ہوا؟" اصبح نے چائے کا کپ اٹھایا۔

"یار وہ نہیں تھی سیکنڈ ایئر کی ماروی سندھ کے کسی گاؤں سے آئی تھی۔"

"ہاں......ہاں۔"

"اس کی بڑی بہن تھی کوئی رابیل، اس کے ساتھ بڑی ٹریجڈی ہوئی۔ بیس سال پہلے ان کی ماں کی وفات پر ان کے باپ نے کسی شخص کی بہن سے شادی کی تھی اور رشتے کے بدلے میں عوضانہ کے طور پر اپنی بڑی بیٹی کا رشتہ لڑکی کے بھائی کو دے دیا تھا۔ تب رابیل صرف تین سال کی تھی۔ لڑکی کے بھائی نے کہا تھا کہ اگر تو اس کے ہاں بیٹا ہو گیا، تو وہ رابیل کے جوان ہونے پر اسے بیٹے سے بیاہ لے گا اور اگر بیٹا نہ ہوا، تب بھی لڑکی کا وہ مالک ہے، وہ جس طرح چاہے گا کرے گا۔ وہاں سندھ میں اس رسم کو پیٹ دینا کہتے ہیں، یعنی لڑکی کے بدلے میں لڑکی دی جائے۔

"اب بدقسمتی سے ماروی کی سوتیلی ماں کے بھائی کا کوئی بیٹا ہی نہیں ہوا، بلکہ کوئی اولاد ہی نہیں ہوئی اور یوں اب بیس سال بعد ماروی کی سوتیلی ماں کے بھائی اپنی بیوی کے مرنے کے بعد خود دولہا بن کر آ گئے۔ رابیل کے باپ کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا، ظاہر ہے اوطاق میں بیٹھ کر دس لوگوں کے سامنے انہوں نے پیٹ دینا قبول کیا تھا، سو رابیل کو سوتیلی ماں کے بھائی کے ساتھ رخصت کر دیا گیا، جو عمر میں اس کے باپ سے بھی بڑا تھا۔ پہلی بیوی بڑی بہن کے رشتے کے عوض کی تھی، دوسری بیوی منجھلی بہن کا رشتہ دے کر کی۔ اب دونوں بیویاں مر چکی ہیں، اور یہ تیسری شادی سب سے چھوٹی بہن کے عوض کی ہے، جسے بیس سال پہلے بیاہا تھا۔ دو بیویوں سے اولاد نہیں ہوئی اور اب بڈھا تیسری شادی رچا بیٹھا۔"

"ماروی بے چاری بہت رو رہی تھی، اسے تو ماں کے مرنے کے بعد مہینے کی تھی، جب وہ تو اس کے پاس ماموں کراچی لے آئے تھے، اپنی بیٹی کی طرح پالا اسے...... اور پڑھایا تھا۔ رابیل سے اس کی کبھی کبھی ملاقات ہوئی تھی، لیکن بہن تو تھی، سگا رشتہ تو ہی تھا اس کا دنیا میں۔"

"اوہ مائی گاڈ! آج کے اس دور میں بھی لوگ اتنی جہالت کی رسموں کو باقی رکھے ہوئے ہیں۔"

ساری بات سن کر اصبح نے کہا اور خالی پیالی ٹرالی میں رکھی تو اس کی نظر امی پر پڑی، جن کا رنگ سفید ہو رہا تھا اور ہونٹ کپکپا رہے تھے، ہاتھ ہولے ہولے لرز رہے تھے۔

"امی کیا ہوا؟"

اصبح نے یک دم اٹھ کر ان کا ہاتھ تھاما۔ انہوں نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ آنکھیں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

پانیوں سے بھری تھیں۔

''کیا ہوا اجی، پلیز بولیں نا؟'' اس نے بے چینی سے ان کے سینے پر ہاتھ رکھ کر ''درد ہو رہا ہے کیا یہاں؟'' امیج کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

''درد...... ہاں بہت درد ہے۔'' اجی کے ہونٹ ہلے...... اور پھر ان کی آنکھیں ہونے لگیں۔

''یہ...... یہ جہالت کی رسمیں یہ......'' ان کی آواز تتلا گئی۔ امیج کی چیخیں نکل گئیں۔

''اجی...... اجی۔''

''پاگل ہو گئی ہو امیج۔'' ماریہ نے بازو پکڑ کر اسے پیچھے کیا، اور اجی کو آرام سے سہ دیتے ہوئے صوفے پر ہی لٹا دیا اور ان کی پیشانی پر بہتے پسینے کو پونچھنے لگی۔

''تم جلدی سے انکل صمد کو یا اپنے کاکا جان کو فون کرو، آج سنڈے ہے نا گھر پر ہوں گے وہ۔''

''ہاں۔'' امیج نے تیزی سے کہا اور کانپتے ہاتھوں سے نمبر ملانے لگی، فون شین خان ۔ ہی ریسیو کیا۔

''کاکا جان...... کاکا جان۔'' آنسوؤں سے اس کا گلا رندھ گیا۔

''یہ تم ہو نا امیج بیٹا تم، پلیز کیا ہوا جلدی بولو کیا ہوا، نہیں تو میرا دل بند ہو جائے گا۔''

''اجی...... وہ اجی کو میرا خیال اٹیک ہوا ہے، دل کا۔ آپ آ جائیں پلیز کاکا جان، با جان تو آغا جان سے ملنے گئے ہوئے ہیں۔'' وہ زور زور سے رونے لگی۔

''ریلکس، ریلکس، میں آ رہا ہوں۔'' انہوں نے فوراً ہی ریسور رکھ دیا۔

''مستقبل کی ڈاکٹر ہو تم میں۔'' ماریہ جو خود بھی گھبرا رہی تھی، اس نے خود کو سنبھالا۔ ''یہ رونا دھونا بند کرو اور ادھر آ کر بیٹھو اجی کے پاس۔''

اجی بار بار آنکھیں کھولتیں اور پھر بند کر لیتیں۔ ان کا پورا جسم پسینے میں بھیگ رہا تھا اور پیشانی سے تو پسینہ پانی کے قطروں کی طرح بہہ رہا تھا، امیج نے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے۔ اس کے آنسو ان کے ہاتھوں پر بہہ رہے تھے، وہ بار بار کبھی انہیں ہونٹوں سے لگاتی، کبھی آنکھوں سے لگاتی۔

''اجی...... اجی آئی لو یو اجی۔''

''مت روؤ امیج...... تمہارے بابا جان تمہاری آنکھ سے گرنے والا ایک آنسو بھی برداشت نہیں کر پاتے۔''

انہوں نے رکتے رکتے کہا۔

''نہیں لگی، میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی، آپ کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ یا رب العالمین میری اجی کو کچھ نہ ہو۔ میری زندگی بھی اجی کو دے دو میرے مولا۔''

''اٹھو یہاں سے میو تم اجی کو اور پریشان کر رہی ہو۔'' ماریہ نے ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھا دیا، جب ہی باہر ایمبولینس کی آواز آئی اور ساتھ ہی بیل ہوئی۔ انکل عبدالصمد کے اسپتال سے ایمبولینس اور شین خان کی گاڑی ایک ساتھ ہی گیٹ پر پہنچی تھی۔ وہ تیزی سے باہر نکلی، دلبر نے گیٹ کھول دیا تھا۔

اسے اب تک دلبر کا خیال ہی نہیں آیا تھا، وہ وحشت زدہ سا لاؤنج کی ایک دیوار سے لگ کھڑا اجی کو دیکھ رہا تھا، اب بیل کی آواز سن کر باہر گیا تھا۔

باہر انٹرنس کے پاس ہی کاکا جان اور ان کے پیچھے آتی طاہرہ آنٹی کو دیکھ کر جیسے اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔

''کاکا جان، اجی۔'' وہ دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔

''حوصلہ امیج بچے حوصلہ کرو۔'' ان کی اپنی آواز لرز رہی تھی، لیکن انہوں نے امیج کے سر پر پیار کرتے ہوئے اسے حوصلہ دیا، لیکن امیج تو بس روئے چلی جا رہی تھی، وہ ہولے ہولے اسے تھپکنے لگے۔

● ● ●

''یہ کیا کیا تم نے اجی؟'' عبدالصمد خان کے اسپتال کے ایک کمرے میں اجی کے بیڈ کے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھے وسیط خان نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

''ابھی سے حوصلہ ہار بیٹھیں۔'' وہ ذرا سا مسکرائے، مجھے اکیلا چھوڑ کر جانے کا ارادہ کر لیا تھا تم نے...... یہ تو سراسر چیٹنگ ہے نا۔'' انہوں نے اجی کی طرف دیکھا، ان کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

''تمہارے بنا اکیلے، میں کیسے غم کا اتنا بڑا بار اٹھا پاؤں گا، جب وہ میری امیج کو لے جائیں گے اجی، تو میں اکیلا......'' ان کا گلا رندھ گیا۔ ''میرے ساتھ ایسا مت کرنا، مجھے اکیلا

مت کرنا۔"

امی نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا اور ہولے سے مسکرائیں "میں اب اچھی ہوں، آ
پریشان نہ ہوں۔"

"تم کیا جانو امی، جب ثمین خان کا فون گیا، تو مجھے لگتا تھا، جیسے میرا دل بند ہو جا
گا، میں پتا نہیں، یہاں تک کیسے پہنچا امی، تم نہیں جان سکتیں۔"

"پتا نہیں کیا ہوا تھا، ماریہ کچھ بتا رہی تھی، اپنی کسی سہیلی کے متعلق مجھے لگا جیسے میرا د
ڈوبتا جا رہا ہے، نیچے ہی نیچے پاتال میں گرتا جا رہا ہے، پھر ایک شدید درد کی لہر اٹھی تھی،
پورے وجود میں پھیل گئی۔ پتا نہیں اس اجنبی بچی کے دکھ کا بار میرے دل پر کیوں آ پڑا، شا
اس کا دکھ میری اصبح جیسا ہی تھا۔"

"امی، ہم انسان بہت کمزور ہوتے ہیں، ہم اولاد کا دکھ برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم ا
خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اور تمہیں حوصلہ دے۔"

"وسیط خان کیا آپ...... آپ کے لوگ اس رسم کو ختم نہیں کر سکتے۔" مدت بعد ا
نے پھر وہی فرمائش کی تھی۔

"کاش، میرے اختیار میں ہوتا، لیکن میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

امی نے آنکھیں بند کر لیں اور بند آنکھوں میں آنسوؤں نے ہلچل مچا دی، لیکن وہ انہیں
پینے کی کوشش کرنے لگیں، انہیں دل کا ہلکا سا اٹیک ہوا تھا اور اللہ کا شکر تھا کہ اس نے انہیں
زندگی عطا کی تھی، تین دن بعد انہیں آئی سی یو سے باہر لایا گیا تھا۔ آج تو وہ کافی بہتر تھیں
اس لیے وسیط خان نے اصبح اور ماریہ کو کالج میں بھیج دیا تھا۔ وہ دونوں جانا نہیں چاہتی تھیں
لیکن انہوں نے اصرار کیا۔

"تمہاری پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے، فائنل ایئر ہے، میں ہوں نا امی کے پاس، پھر
تمہاری طاہرہ آنٹی بھی آ جائیں گی ثمین خان بھی ہے۔"

تب وہ بہ مشکل کالج جانے پر راضی ہوئی تھیں۔

انہوں نے امی کو آنکھیں بند کرتے دیکھا تو آہستہ سے ان کا ہاتھ چھوڑ دیا اور ان کے
چہرے کو دیکھنے لگے۔ چند ہی دنوں میں ان کے سرخ و سفید چہرے پر زردی کھنڈ آئی تھی۔

"اور کیا امی برداشت کر سکے گی جب......" انہوں نے ہونٹ بھینچ کر اپنی سسکی کو دبایا

کتنی مشکل سے مانا تھا کمند خان۔

"تم لوگ مکر رہے ہو، اب جرگے کے سامنے تمہارے باپ نے قبول کیا تھا، اکبر خان
کے قتل کے بدلے اپنی پوتی کا رشتہ دینا اور پھر نکاح ہو چکا ہے۔"

"ہم مکر نہیں رہے کمند خان، بس ایک ڈیڑھ سال ہی کی تو بات ہے، جہاں اتنے سال
صبر کیا وہاں۔"

"اور ڈیڑھ سال بعد تم پھر آ گئے تو۔"

"نہیں آؤں گا کمند خان۔" انہوں نے بمشکل سے اپنے آنسو پیئے۔

"چھوڑو کاکا، میں نے کیا اچار ڈالنا ہے اس کا۔"

رحمت خان نے نسوار کی چٹکی منہ میں ڈالتے ہوئے کمند خان کے کندھے پر ہاتھ مارا
تھا۔

"وہ بیوی تو میری ہے نا، اچھا ہے ڈاکٹر بن جائے گی، تو ادھر گھر کی عورتوں کا مفت
علاج ہو جائے گا۔" اس نے زور سے قہقہہ لگایا۔

"ادھر وہ میری جان قمرو بھی ایسا نازک مزاج ہے ہر دوسرے تیسرے دن شوں شوں کر
رہا ہوتا ہے، کم از کم اسے دوا ہی دے دے گی، ورنہ میرے کس کام کی۔"

وسیط خان کو لگا تھا، جیسے کسی نے ان کا دل دو ٹکڑے کر دیا ہو۔ یہ شخص...... یہ شخص ان
کی اصبح کے قابل تھا بھلا۔ اجڈ جاہل تھوڑی تھوڑی دیر بعد نسوار کی چٹکی منہ میں ڈالتا اور پھر
تھوک کا پٹاخہ فرش پر پھینکتا ہوا...... اور یہ شخص ان کی اصبح کا شوہر تھا۔

"شکریہ کمند خان!"

وہ دل پر بہت بھاری بوجھ لیے گھر آ گئے تھے، پھر کتنے ہی دن انہیں نیند نہیں آئی تھی۔
یہ زندگی نے ان سے کیسا امتحان لیا تھا، ہر لمحہ انہیں لگتا جیسے ان کا وجود کسی نے جلتی بھٹی میں
ڈال دیا ہو اور اگر امی دیکھ لے، رحمت خان کو تو......

انہوں نے امی کی طرف دیکھا، جن کی آنکھیں بند تھیں، لیکن آنسو رخساروں پر پھیلتے جا
رہے تھے۔ انہوں نے اپنی انگلی کی پوروں سے ان کے آنسو پونچھے۔

"مت رو امی۔"

"امی نے آنکھیں کھول کر ایک شکوہ بھری نظر ان پر ڈالی، ورنہ مدت ہوئی، انہوں نے

شکوہ کرنا یا گلہ کرنا چھوڑ رکھا تھا۔

"اس طرح ناراض اور گلہ کرتی نظروں سے دیکھتی ہوئی، تم بہت اچھی لگ رہی ہ
اجی۔"

وہ بھی جیسے بیس سالوں بعد وہی وسیط خان بن گئے تھے، جو لندن میں تھے۔ اجیؔ
چھیڑتے ہنستے مسکراتے، لطیف باتیں کرتے ہوئے، اجی کے ہونٹوں پر ایک مدھم سی مسکراہ
ابھر کر معدوم ہوگئی۔

"اگر آپ اس وقت ڈٹ جاتے تو...... واپس چلے جاتے، اصبح کو لے کر لندن تو......"

"اجی۔" ان کے لب بھینچ گئے، اور انہوں نے دل ہی دل میں کہا "تم جانتی ہو، یہ ممکر
نہ تھا۔ میں بی جی اور شمین خان کی زندگی سے نہیں کھیل سکتا تھا۔"

"تم کچھ لوگی کھانے کو، سیب کاٹ دوں۔" انہوں نے جیسے ان کی بات سنی ہی نہ تھی۔

"نہیں، میں سونا چاہتی ہوں۔"

"اوکے، میں لائٹ آف کر دیتا ہوں، تم سو جاؤ، میں یہ ادھر صوفے پر بیٹھا ہوں۔"

"وہ ان کے پاس سے اٹھ کر صوفے پر نیم دراز ہو گئے اور ایک بار پھر ان کا ذہن کمنا
خان اور رحمت خان کی طرف چلا گیا، کوئی معجزہ، کوئی انہونی، انہوں نے بے آواز لبوں سے
دعا کی اور آنسو قطرہ قطرہ ان کے اندر گرنے لگے۔

● ● ●

"کیا بات ہے وسیط خان، تم چپ کیوں ہو گئے ہو، یقین کرو اسفند بہت اچھا لڑکا
ہے۔" ڈاکٹر عبدالصمد خان نے ساکت بیٹھے وسیط خان کو دیکھا۔

"بخدا اگر بھائی جان ستارہ کے لئے خواہش مند ہوتے، تو میں سمجھتا میری ستارہ بہت
خوش قسمت ہے۔ اصبح بھی مجھے ستارہ کی طرح ہی عزیز ہے، اپنی بچی ایسی...... میں اس کے
لیے اچھا ہی سوچوں گا۔"

"میں جانتا ہوں عبدالصمد خان۔" وسیط خان کی آواز دھیمی تھی۔ "اسفند یار یقینا ایسا
لڑکا ہے کہ میں اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتا لیکن......"

"لیکن کیا؟" عبدالصمد خان نے بے چینی سے ان کی بات کاٹ دی "ہمارے آباؤ
اجداد نے مدتوں پہلے اپنے علاقوں کو یہاں چھوڑ رہائش اختیار کر لی، ہم یہاں سے ہی گھل مل

یہ ہی طور طریقے اپنا لئے لیکن وسیط خان ہم تم میں سے ہی ہیں...... غیر نہیں ہیں۔"

"یہ بھی تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں عبدالصمد خان۔" وسیط خان کی آواز اب بھی
تھی اور لبوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"پھر اتنا تردد کیوں؟" عبدالصمد خان نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا، باتوں باتوں
دو تین بار انہوں نے اسفند کے لیے بات کی تھی اور وسیط خان کا عندیہ لینا چاہا تھا لیکن
خان سمجھ کر بھی انجان بن جاتے تھے، لیکن آج وہ گھر آئے تھے اور اسفند یار کے سلسلے
ان کی رائے لیتے ہوئے باقاعدہ پرپوزل دیا تھا، اصبح کے لیے۔

"یقین کرو وسیط خان، اصبح ہمارے گھر بہت خوش رہے گی، میری بھابی جان اور بھائی
ہم سب کی ہی شدید خواہش ہے کہ اصبح بیاہ کر ان کے گھر آئے۔"

"کاش، میں اتنا خوش قسمت ہوتا صمد خان۔" وسیط خان نے ایک گہری سانس لی۔
کاش میرے اختیار میں ہوتا، تو آج میں تمہارا دامن پھولوں سے بھر دیتا۔ میں نے اصبح کے
ایک ایسے ہی شریک حیات کی تمنا کی تھی۔"

"پھر کیا رکاوٹ ہے تم...... میرا مطلب ہے کیا تم لالہ امید خان کے کسی بیٹے سے اصبح
شادی کرنا چاہتے ہو۔"

"کاش! ایسا ہی ہو جاتا لیکن ایسا نہیں ہے۔" انہوں نے پھر ایک گہری سانس لے کر
خود کو کچھ کہنے کے لیے تیار کیا۔ "اصبح سوارہ ہے۔" بالآخر انہوں نے وہ کہہ دیا، جسے زبان
لاتے ہوئے انہیں بے شمار اذیت سے گزرنا پڑا تھا۔

"نہیں۔" ڈاکٹر عبدالصمد خان نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔ "کیا اصبح کو علم ہے؟"
بعد عبدالصمد خان اس صدمے سے سنبھلے۔

"نہیں۔ وہ بہت چھوٹی تھی، جب شمین خان نے اپنی منکوحہ کی عزت کے لیے اکبر خان
قتل کر دیا تھا۔" انہوں نے مختصراً بتایا۔

عبدالصمد خان خاموش بیٹھے تھے، جیسے ابھی تک صدمے کی سی کیفیت میں ہوں۔

"عبدالصمد خان، یار ادھر دیکھو، ایک باپ کے دل کو جسے ہر آن یہ دکھ نوچتا کھسوٹتا رہتا
ہو کہ اس کی اکلوتی بیٹی ایک دن دشمن کے گھر چلی جائے گی اور وہ...... وہ جانے کیا سلوک
کریں گے، اس کے ساتھ......" ان کی آواز بھرا گئی اور آنسو باہر نکل آنے کو بے تاب

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ہوئے۔

"وسیط خان میں نے کئی بار سوچا تھا، کہ تمہیں کیا ہو گیا تم ایسے تو نہ تھے۔" عبدالصمد
خان بولے، تو وسیط خان کے دکھ سے ان کی آواز بوجھل ہو رہی تھی۔

"وہ وسیط خان جو مجھے لندن میں ملا تھا اور یہ وسیط خان جو یہاں ہے۔ دونوں میں
بہت فرق ہے۔ میں سوچتا تھا وسیط خان کیا ہے، ایسا جس نے تمہارے ہونٹوں کی ہنسی میں
کرب بھر دیا ہے۔ جس نے تمہاری آنکھوں میں عجب اداس سا تاثر سمو دیا ہے، لیکن
خانان تمہارا دکھ تو میرے تصور سے بھی بہت بڑا ہے۔" عبدالصمد خاموش ہوئے تو وسیط
کو اپنا دل ڈوبتا ہوا سا لگا۔

"کیسا ہے وہ شخص؟"

"کون......!" وہ چونکے۔

"وہی جس کے ساتھ......"

"کیا بتاؤں۔" وسیط خان کو لگا جیسے ان کا دل درد سے پھٹ جائے گا" وہ......
ہے جیسا تمہارا چوکیدار مسیح خان۔"

"نہیں۔" عبدالصمد خان کو لگا جیسے ان کا دل دو ٹکڑے ہو جائے گا۔

اصبح جس کے حسن، جس کی خوبصورتی اور خوب سیرتی کی تعریف کرتے ان کی زبان
نہ تھکتی تھیں، وہ اصبح......

"نہیں۔" ان کے لبوں سے پھر نکلا اور وہ اٹھ کر وسیط خان کے پاس بیٹھ گئے۔

"وسیط خان۔" ان کا ہاتھ ان کے کندھے پر آ ٹکا۔

"وسیط خان میرے بھائی میرے دوست ...... بتاؤ میں کیا کہوں، مجھے کچھ سمجھ نہیں
آ رہا۔"

"کچھ بھی مت کہو عبدالصمد خان، کچھ بھی مت کہو۔ بس مجھے اپنے سینے سے لگا لو
اپنے ساتھ بھینچ لو، نہیں تو میرا دل پھٹ جائے گا، اتنے سالوں بعد پہلی بار میں نے اپنا دکھ کسی
سے شیئر کیا ہے، تو مجھے لگتا ہے جیسے میرا ضبط میرا ساتھ چھوڑ دے گا، مجھے حوصلہ دو میرے
یار۔"

عبدالصمد خان نے انہیں اپنے بازوؤں میں بھر لیا اور وسیط خان کی آنکھوں سے

بہہ نکلے، وہ آنسو جو اتنے سالوں سے اندر ہی اندر ان کے وجود کو کاٹ رہے تھے۔ عبدالصمد
خان بغیر کچھ بولے ہولے ہولے انہیں تھپکتے رہے اور پھر کچھ دیر بعد وسیط خان خود ہی سنبھل
کر بیٹھ گئے، ان کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔

"اب میں گھر جا کر کیا کہوں گا، وسیط خان، وہ سب تو بہت ایکسائیٹڈ ہو کر میرا انتظار
کر رہے ہوں گے، کیا کہوں گا میں ان سے؟"

"کچھ بھی کہہ دو صمد خان، لیکن اصل بات مت بتانا، میں چاہتا ہوں کہ اصبح سکون کے
ساتھ اپنی تعلیم مکمل کر لے، میں اس کی قسمت بدلنے پر قادر نہیں ہوں، اس کے ہاتھ کی
لکیروں میں رحمت خان کا نام لکھا ہے، اسے ساری زندگی دشمن کے گھر رہنا ہے، لیکن جو
میرے اختیار میں ہے، وہ میں کرنا چاہتا ہوں۔ کنند خان سے میں مہلت لے چکا ہوں، کوئی
اصبح سے یہ حقیقت کہہ دے گا تو وہ ڈسٹرب ہو جائے گی، پلیز ایسا مت کرنا۔" عبدالصمد خان
نے پر سوچ انداز میں سر ہلا دیا۔

مگر بھائی اور بھابی نے پوچھا تو وہ کیا کہیں گے جان سے پیارا لاڈلا بھتیجا۔ جس کی
آنکھوں میں انہوں نے اصبح کے نام پر دیئے جھلملاتے دیکھے تھے، کیا وہ اسے مایوس کر دیں،
یا کہہ دیں کہ وسیط خان سوچ کر جواب دے گا، لیکن نہیں مایوس کر دینا ہی صحیح ہے۔ اس راستے
پر تو کہیں امید کا کوئی چراغ نہیں جلتا، نہ اس کے دیے روشن ہوتے ہیں، وہ کہہ دیں گے، اس
کی بات طے ہو چکی ہے، بچپن سے ہی۔ ہاں یہ صحیح ہے وہ ایسا ہی کہیں گے اور پھر انہوں نے
یونہی کیا۔

اسفندیار جو ماں کے ساتھ سامنے ہی صوفے پر بیٹھا تھا، یک دم اس کا رنگ سفید پڑ
گیا۔

"نہیں، بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ اصبح نے کبھی ذکر نہیں کیا۔" اس نے سوچا اور ستارہ نے
اس کی سوچ کو زبان دے دی۔

"لیکن ڈیڈی صبی نے کبھی بتایا تو نہیں۔"

"شاید اسے علم نہ ہو۔ بڑوں نے بات طے کر دی ہوگی۔" عبدالصمد خان نے جان
بوجھ کر اسفند کی طرف نہیں دیکھا، جس کی حالت اس شخص کی سی ہو رہی تھی جو جیتنے کی امید
لیے بیٹھا ہو اور ہار یک دم اس کا مقدر بنا دی گئی ہو۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"کیا شاہ زر یا امان اللہ سے؟" ستارہ نے پھر پوچھا۔

"نہیں، شاید خاندان سے باہر کہیں۔"

"بات ہی طے ہوئی ہے نا نکاح تو نہیں ہوا، انکل آپ......" ازکی بھائی کی ر
تھی، سو اس نے عبدالصمد خان سے کہنا چاہا لیکن صمد خان نے اسے ٹوک دیا۔

"شریفوں میں بات کا طے ہونا نکاح کے برابر ہی ہوتا ہے۔" وہ اٹھ کھڑے ہ
جاتے جاتے انہوں نے اسفند کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر جیسے ہاتھوں کے ہلکے دباؤ سے
تسلی دی تھی، لیکن اسفند تو یوں بیٹھا تھا، جیسے جیتے جاگتے انسان سے پتھر کے مجسمے میں
ہو گیا ہو۔ نہ اس نے اٹھ کر چچا کو تعظیم دی، نہ پہلے کی طرح اٹھ کر گیٹ تک انہیں چھ
گیا۔

ستارہ نے تاسف سے اسے دیکھا اور سوچا۔ کتنا اچھا جوڑا ہوتا اسفند اور اصبح کا
اور پتا نہیں وہ کیسا ہو گا۔

"کمال ہے اصبح کو پتا ہی نہیں۔" اقصیٰ پہلی بار بولی۔ اس نے تو تصور ہی تصور م
کو اپنی بھابی بنا دیکھ بھی لیا تھا۔

"بعض اوقات والدین ذکر نہیں کرتے، اولاد سے تاکہ وہ سکون سے اپنی پڑھائ
کریں۔ خیر، اصبح نہ سہی کوئی اور دیکھتے ہیں۔ شکر ہے اسفند مانے تو۔" اسفند یار کی والد
اٹھتے اٹھتے کہا اور ساتھ ہی اقصیٰ کو بھی اٹھنے کے لیے کہا۔

"اقصیٰ چلو اٹھو، کھانا بنانے کی تیاری کرو، ازکی کا میاں آ گیا، تو اس نے پھر
جلدی کا شور مچا دینا ہے۔"

ازکی ماں کے جانے کے بعد اٹھ کر اسفند یار کے پاس آ بیٹھی، دونوں میں بچپن
سے بہت دوستی تھی۔

"اسفی۔"

"ازکی!" اسفند کی آواز بھرا رہی تھی۔ "یہ...... یہ میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا
ایسا ہی تھا تو وہ میرے سامنے کیوں آئی، میرے دل نے اسے پسند کیوں کیا...... اگر......"

"ریلیکس اسفی، بہت سی باتیں ہمارے اختیار میں نہیں ہوتی ہیں اور......"

اسفند یار یک دم اٹھا اور تیز تیز قدموں سے چلتا لاؤنج سے باہر نکل گیا، اپنے کمر

میں آ کر وہ بیڈ پر بیٹھ گیا۔

ازکی بے شک اس کی دوستوں جیسی بہن تھی، پھر بھی وہ اس وقت جس کیفیت سے گزر
رہا تھا وہ اس سے شیئر نہیں کر سکتا تھا۔ زندگی کے اتنے سارے سال وہ گزار چکا تھا، کسی
چہرے نے اسے اسیر نہیں کیا تھا، وہ کہیں رکا نہیں تھا، حالانکہ کتنے خوب صورت چہرے ایسے
تھے، کہ وہ رک سکتا تھا، لیکن وہ رکا نہیں تھا کہیں بھی...... اور جب پہلی بار اس نے اصبح کو دیکھا
تھا تو اسے لگا تھا جیسے اس کی تلاش ختم ہو گئی ہے، یہی وہ لڑکی ہے، جس مقدر نے اس کا مقدر
بننا ہے اور اس نے کے حوالے سے کتنے ہی خواب دیکھ ڈالے تھے۔

کیا وہ کسی اور لڑکی کے ساتھ زندگی گزار سکتا ہے...... اور کیا کبھی اس کا دل کسی اور لڑکی
کو وہی مقام دے سکتا ہے جو اصبح کا ہے...... نہیں شاید کبھی نہیں......

"اصبح یہ تم نے میری ساتھ اچھا نہیں کیا، مجھے اپنا اسیر کر کے خود...... لیکن نہیں بھلا، اصبح
کا کیا قصور اس نے تو کبھی میری حوصلہ افزائی نہیں کی، بس ایک سیدھا راستہ بتا دیا، لیکن میں
اس سیدھے راستے پر بھی چل کر تمہیں نہیں پا سکا۔ اصبح میں کیا کروں۔" اس نے بے بسی سے
بیڈ کی پٹی پر مکا مارا۔

مجھے ایک بار اصبح سے بات تو کرنی چاہیے۔ کیا خبر کوئی راستہ ہو، کیا پتہ اصبح مجھے......
ہاں مجھے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے ایک اپنائیت محسوس ہوئی تھی۔ اگر وہ مجھے پسند نہ کرتی
ہوتی تو مجھے کبھی بھی والدین سے بات کرنے کے لیے نہ کہتی۔ وہ ایک پڑھی لکھی لڑکی ہے، وہ
اپنے والدین سے بات کر سکتی ہے کہ وہ مجھ سے۔" امید کا ایک ننھا سا دیا اس کے دل میں جلا
تو وہ بے اختیار اس کے ہاتھ فون کی طرف بڑھے۔ ایک بار اس نے ستارہ کی ڈائری سے اس
کا موبائل نمبر نوٹ کیا تھا، لیکن پھر اس نے فون کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور اب اس کی
انگلیاں تیزی سے اس کا نمبر ڈائل کر رہی تھیں اور دل ڈوب اور ابھر رہا تھا۔ کیا پتا...... کیا خبر۔

"نہیں۔" نمبر ملاتے ملاتے اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"کیا کہوں گا، میں اس سے کہ اس نے کیوں میرے دل میں بسیرا کیا، وہ میرے
سامنے آئی۔"

"اوہ نہیں...... تو پھر؟" اس نے جیسے خود سے پوچھا۔

"انکل تحسین...... ہاں انکل تحسین۔"

گو وہ ان سے پہلی بار ملا تھا، لیکن وہ اس کے ساتھ بالکل دوستوں کی طرح
کرتے تھے، میں ان سے کہوں گا، کہ وہ میری سفارش کریں، کوئی راستہ تو ہوگا۔ کہیں تو
روزن ہوگا، جس سے راہ تلاش کی جائے۔ میں سب کہہ دوں گا، ان سے اپنی کیفیات
حال دل......

اسفند نے جیسے فیصلہ کرلیا، اور ایک اٹھ کر کھڑا ہوا، لاؤنج میں ایک ذرا رک کر اس
طرف دیکھا، جو ابھی تک وہاں ہی بیٹھی ستارہ سے ہولے ہولے کچھ کہہ رہی تھی، پھر گاڑی
چابیاں اٹھائیں اور مڑ گیا۔

''بھائی۔'' لڑکی نے اس کی وحشت بھری آنکھوں اور رستے ہوئے چہرے کو دیکھا
پکارا ''اسفی رکو، بات سنو۔'' لیکن وہ سنی ان سنی کرتا ہوا تیزی سے باہر چلا گیا۔

● ● ●

وحشتو، نفرتو، چاہتو
آؤ گریہ کریں
خواب بستی کے کوچوں میں پھرتے ہوئے
زرد چہروں پہ آنکھوں کا صحرا لیے
اور کالی عباؤں میں لپٹے ہو پیکرو
آؤ گریہ کریں
مقتل روح میں آرزوؤں کا خوں روز ہوتا رہا
دم کہ سینے میں ہر پل ہی گھٹتا رہا
دل مگر ایسا وحشی کہ چلتا رہا
آؤ گریہ کریں
ہم پہ الزام ہے
اپنے جذبوں کے قتل عمد کا سنو
جبر کے خنجروں سے تڑپتی ہوئی اس محبت کا خوں
جس کی قسمت میں اظہار کا دن نہیں

نوٹ بک سامنے کھلی پڑی تھی اور صبح نہ جانے کتنی دیر سے ہاتھ گود میں دھرے

کی سیڑھیوں پر ساکت بیٹھی تھی، اس کی آنکھیں خشک تھیں، لیکن اندر جیسے سمندر ابل رہے تھے۔ سامنے درختوں سے اوپر ہوتے ہوئے سورج کی کرنیں اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی، شاید دس بجے تھے یا...... پتا نہیں کیا۔

وہ شاید صبح فجر کے بعد یہاں آ کر بیٹھی تھی۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ کب وہ باہر آئی تھی اور کب دلبر لان کی گھاس کو پانی دیتے دیتے اچانک ہی اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا تھا اور کب...... کب اس نے وہ بھیانک انکشاف کیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا، جیسے وہ صدیوں سے یونہی اسی کیفیت میں بیٹھی تھی، خشک آنکھوں کے ساتھ۔ وہ رونا چاہتی تھی، لیکن آنکھیں خشک تھیں جیسے ان میں ریت اڑتی ہو اور دھول۔ اندر کہیں کوئی درد بال کھولے بین کرتا تھا اور نمکین پانی کی جھیلیں بنتی تھیں اور یہ نمکین پانی دل کی دیواروں کو کاٹتا تھا، مگر وہ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے خشک آنکھوں کے ساتھ ساکت بیٹھی تھی، تب سے جب...... جب دلبر نے پانی کا فوارہ اس کے قریب رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''ہم گاؤں کب جائیں گے اصبح بی بی؟''

''پتا نہیں لیکن شاید جلد ہی بابا جان کہہ تو رہے تھے۔''

''تو کیا اب آپ ڈاکٹر بن گئی ہیں؟'' دلبر نے پوچھا۔

''امتحان تو دے دیا ہے، دلبر کاکا اب رزلٹ آنا ہے، لیکن بابا جان کہہ رہے تھے کہ رزلٹ سے پہلے ہی وہ گاؤں چلے جائیں گے، واپس شاید آغا جان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، بار بار ان کے فون آ رہے ہیں۔''

''اچھا، میرا بھی ادھر لاہور میں دل نہیں لگتا، اور ادھر کا پانی بھی ایسا ہے نا ہر وقت گھٹنوں میں درد رہتا ہے۔ اٹھتا ہوں تو کڑکڑ کرتے ہیں، مجھے کوئی اچھی سی دوائی دے دینا، اب تو آپ بھی ڈاکٹر ہو نا۔''

اصبح افسردگی سے مسکرائی۔ ''اچھا، دوائی لے لینا، لیکن کاکا یہاں آ کر تم نے کبھی بانسری نہیں بجائی۔ آج سناؤ نا دل چاہ رہا ہے۔''

''ابھی پانی دے لوں نا تو سناتا ہوں، پر بچی بات بتاؤں، وہاں اپنے علاقے میں ٹیلے پر بیٹھ کر بانسری بجانے کی اور ہی بات تھی، لگتا تھا جیسے ڈوبتے سورج کی اداسی کا سوز بھی اس کی لے میں اتر آتا ہے۔''

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

دلبر زیادہ تر خاموش رہتا تھا، بہت کم کسی سے بات کرتا تھا ایک شمین خان تھے، جن سے
وہ باتیں کیا کرتا تھا، اور اب اصبح تھی۔ جس سے بات کرلیا کرتا تھا۔ اصبح سے وہ بہت پیار کرتا
کرتا تھا، بچپن میں اسے گود میں اٹھائے پھرتا تھا، اس کے لیے میلے سے ٹافیاں اور چوڑیاں
لاتا۔ شمین خان چلا گیا، تو اسے ہی بانسری سنایا کرتا تھا۔

"دلبر کاکا ایک بات پوچھوں؟" اصبح نے جھجکتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

وہ ایک بات جس نے اسے پچھلے چھ ماہ سے پریشان کر رکھا تھا، وہ ایک بات جس سے
اسے بے خبر رکھا گیا تھا، شاید اس لیے کہ وہ ڈسٹرب نہ ہو اور اپنی توجہ پڑھائی کی طرف
رکھے۔ شاید بابا جان اور امی نے صحیح ہی کیا تھا، وہ ماریہ بھی تو کہتی تھی، جنید کے ساتھ منگنی کے
بعد اس کا دھیان بٹ گیا ہے۔ وہ پہلے کی طرح اپنی پڑھائی پر توجہ نہیں دے سکتی، لیکن وہ کیا
کرتی، اس دل کا جس پر انجانے میں اسفندیار کا نام لکھا جا چکا تھا۔ اسے تو خبر بھی نہیں ہوئی
تھی اور اسفندیار نے دل میں چپکے سے بسیرا کر لیا تھا، پتا نہیں کیوں دل کو یقین تھا کہ بابا
جان اسفند کو رد نہیں کریں گے۔ وہ تھا ہی ایسا کہ اسے رد نہیں کیا جا سکتا تھا، وہ کسی بھی دل کا
خواب ہو سکتا تھا، پھر اگر اس کے دل نے چپکے چپکے اس کی رفاقت کے خواب بن لیے تھے تو
کیا ہوا تھا۔

لیکن کاش...... اے کاش وہ جانتی ہوتی اسے خبر ہوتی کہ اس کی قسمت کا فیصلہ تو بہت
پہلے کیا جا چکا ہے تو وہ اسفند کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتی۔ اپنی ساعتیں پتھر کر لیتی، لیکن
ایسا نہیں ہوا تھا اور اسفند کے علاوہ کسی اور کی رفاقت کا خیال ہی جیسے دل و جان کو ٹکڑے کر
تھا۔ وہ کتنا بھی خود کو سمجھاتی، کتابیں کھول کر سامنے رکھتی لیکن اسفند کا تصور نہ جانے کہاں سے
آ کر ڈسٹرب کرنے لگتا۔ کانوں میں اس کے کہے لفظ گونجنے لگتے۔ اسفند پلیز میرے تصور
میں مت آؤ، تمہارے میری راستے الگ ہیں۔ لیکن اسفند تو دل میں براجمان مسکرائے جا
جاتا۔

اس روز وہ شمین خان کے ہاں گئی تھی۔ طاہرہ آنٹی اور بچے بہت دنوں سے بلا رہے
تھے، بابا جان شمین خان کاکا اور امی، آغا جان سے ملنے گئے ہوئے تھے۔ وہ کالج سے سیدھی
ادھر ہی چلی گئی تھی۔ ماریہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ گھنٹا بھر وہاں ٹھہر کر
واپس آ جائے گی لیکن آنٹی اور بچے گھر پر نہ تھے۔ صرف ملازمہ اور ننھی نجل تھی، ملازمہ نے بتایا

تھا کہ وہ بچے لوگ کے یونیفارم لینے گئے ہیں۔

"میری غلطی ہے ماریہ مجھے رات کو فون کر کے آنٹی کو بتا دینا چاہیے تھا کہ میں کالج سے
واپسی پر آؤں گی۔"

"اور اب کیا انتظار کرو گی؟" ماریہ نے پوچھا۔

"نہیں خیر، انتظار تو نہیں بہت ٹائم ویسٹ ہوگا واپس چلتے ہیں پھر کسی دن آ جائیں
گے۔" اس نے کاٹ میں سوئی نجل کو اٹھا کر پیار کیا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"یار اتنی دور آئے ہیں تو کیا اب ایک کپ چائے بھی نہ پئیں۔" ماریہ نے اس کی
طرف دیکھا۔

"چائے مل سکتی ہے؟" کوک کے گلاس ٹیبل پر رکھتی ملازمہ سے ماریہ نے پوچھا تو اصبح
کو ہنسی آ گئی۔

"کیوں نہیں، ابھی بناتی ہوں۔"

"ذرا فریج میں بھی تاک جھانک کر لینا کچھ کھانے کو بھی مل جائے تو اچھا ہے۔"

"بہت ندیدی ہو تم ماریہ، اب گھر تو چل ہی رہے ہیں۔"

"یار مجھ میں تمہارے جتنا اسٹیمنا نہیں ہے، صبح سے ان حضرت قبلہ مردے صاحب کی
چیر پھاڑ کر رہے تھے، میرے تو پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔"

اصبح نے مسکرا کر کوک کا گلاس اٹھا لیا۔ شاید تب تک آنٹی بھی آ جائیں۔ اس نے سوچا
لیکن آنٹی تو نہیں آئیں البتہ اسفندیار آ گیا۔ تھکا تھکا اور پریشان سا۔ اس کی نظروں نے اصبح
کو اپنے حصار میں لے لیا، تو پھر جیسے جھکنا بھول گئیں۔ ماریہ نے کھنکھار کر اسے اپنی موجودگی
کا احساس دلایا تو وہ چونکا۔

"آپ دونوں کیسی ہیں؟ میں انکل سے ملنے آیا تھا، دراصل ہم لوگ واپس جا رہے
ہیں۔"

اصبح نے یک دم نظریں اٹھائیں، وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کب!" ماریہ نے پوچھا۔

"کل صبح۔"

"اور ازکی؟"

"ظاہر ہے اسے تو یہاں ہی رہنا ہے اپنے سسرال میں۔" وہ بے حد افسردہ ؟
تھا۔

"اور دیکھو۔" ماریہ نے اصبح کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ "یہ اقصیٰ وغیرہ کس قدر۔
ہیں، فون تک نہیں کیا، ملنے تو خیر کیا آتیں۔"

"آنٹی اور انکل کہاں ہیں؟"

"کاکا تو آغا جان سے ملنے ہیں اور آنٹی شاپنگ کے لیے۔"

"اوہ! پھر تو شاید انکل سے ملاقات نہ ہو سکے۔" وہ جانے کے لیے مڑا۔

"ارے بیٹھیے، وہ جنت چائے لا رہی ہے، چائے پی کر جایئے گا۔" ماریہ نے ا
اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں دیکھتی ہوں، اتنی دیر لگا دی اس نے۔"

اسفند اصبح کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا، اصبح کی نظریں جھکی تھیں اور دل ؟
طرح اسفند کو مقابل پا کر زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

"اصبح۔" ماریہ کے جانے کے بعد اسفند نے اصبح کی طرف دیکھا۔ اصبح نے ذ
ذرا نظریں اٹھائیں اور جیسے اس کا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

یہ اسفند کو کیا ہوا ہے...... کیا تھا اس کی آنکھوں میں۔ اتنا کرب، اتنی اداسی جیسے
رو دے گا۔ اس سے پہلے تو اسفند ایسا نہیں تھا، مسکراتی کچھ کہتی آنکھیں...... جگنوؤں ؟
جگمگاہٹ لیے۔ اب بجھی بجھی سی تھیں، جیسے ان میں راکھ اڑتی ہو۔

"اصبح میں تو بے خبری میں مارا گیا لیکن کیا تم...... تم بھی بے خبر تھیں اس بات سے؟"

"کس بات سے؟" اصبح کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

"کیا اب...... اب بھی تم نہیں جانتیں!" اسفند کے لہجے میں بھی حیرت در آئی تھی۔

"کیا...... کیا نہیں جانتی؟"

"اصبح میں نے ان چند دنوں میں ہی تمہارے حوالے سے اتنے خواب دیکھ ڈالے
کہ اب ان خوابوں کی کرچیاں ان آنکھوں میں چبھتی ہیں اور میرے دل کو زخمی کرتی ہیں۔
تم نے کہا تھا کہ اگر مجھے تمہاری رفاقت کی چاہ ہے تو تمہارے والدین سے بات کروں۔
تمہاری چاہ ہے اور پھر وہی کیا جو تم نے کہا تھا لیکن اصبح میری خوابوں کے محل مسمار ہو ؟

مجھ کو تمہارے بابا جان نے بتایا کہ تم بچپن سے ہی منسوب ہو، تمہاری بات طے ہو چکی۔"

"نہیں!" اصبح نے بمشکل اپنی سسکی روکی۔

"ایسا ہی ہے اصبح...... لیکن بتاؤ میں کیا کروں؟ میرا کیا قصور ہے۔ کاش تم میرے
سامنے نہ آتیں، نہ میں تمہیں نہ دیکھتا اب کیسے...... کیسے برداشت کر پاؤں گا میں یہ سب۔ کیسے
نقش جو ہر روز پہلے سے زیادہ گہرا ہوتا جاتا ہے میرے دل میں اسے مٹا پاؤں گا۔ بتاؤ اصبح
کیسے؟"

اور یہ تو وہ بھی نہیں جانتی تھی کہ جب یوں کوئی نقش دل میں تصویر ہو جائے، تو ایسے کیسے
مٹایا جاتا ہے۔

کتنے سارے دن اس سے پڑھا نہ گیا، کتنی ہی راتیں اس نے جاگ کر گزاریں۔ شاید
اس نے اسفند یار کو اتنا نہ سوچا ہو جتنا اسفند نے اسے سوچا تھا، پھر بھی...... پھر بھی اس کا دل
کٹا تھا۔ کتنی مشکل سے اس نے خود کو سمجھایا تھا، بہلایا تھا، لیکن پھر بھی رات کو وہ جب بستر پر
لیٹی تو دل چپکے چپکے رونے لگتا۔

کیا تھا اگر وہ ایک شخص جسے دل نے چاہا تھا، اس کی زندگی کا رفیق ہوتا۔

پتا نہیں وہ کون تھا، جسے بابا جان اور امی نے اس کے لیے منتخب کیا تھا۔ اس نے کئی بار
سوچا تھا اور کئی بار اس کا دھیان شاہ زار اور امان اللہ کی طرف چلا گیا تھا لیکن جب دو ماہ پہلے
شاہ زار اور امان اللہ دونوں کی بات ہی پشاور میں اپنے ماموں کے گھر طے پا گئی، تو اس نے
سوچا کہ وہ کوئی اور ہو گا لیکن کون؟ اور وہ کیا اسفند یار کو بھول پائے گی اور کیا وہ خوش رہ پائے
گی، اس کے ساتھ لیکن وہ یہ بات کسی سے بھی نہیں کہہ سکتی، بابا جان اور امی سے بھی نہیں کہ
وہ اسفند...... ایک ماریہ تھی جس نے نہ جانے کیسے اس کے دل کا راز جان لیا تھا، وہ اسے
سمجھاتی رہتی۔

"وہ جو کوئی بھی ہو گا صبی بہت بہترین ہو گا۔ اسفند یار سے بھی زیادہ اچھا، تب ہی تو بابا
جان اور امی نے تمہارے لیے اسے منتخب کیا ہے۔"

"لیکن وہ اسفند یار تو نہیں ہو گا نا!" اس کا دل جیسے فریاد کرتا اور وہ ضبط کی کوشش میں
نڈھال ہو جاتی اور وہ خواب تھا جو پھر تواتر سے آنے لگا تھا، وہی تاریک زنداں اور دم گھوٹتا
اندھیرا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

پتا نہیں پیپرز کیسے ہوئے تھے، فائنل ایئر تھا لیکن وہ اتنی محنت نہیں کر سکی تھی، جا
چاہتی تھی۔ ماریہ اسے ڈھیروں تسلیاں اور دلاسے دے کر اپنے گھر چلی گئی تھی اور بابا جا
جو اس کے ہاؤس جاب تک لاہور میں ہی رہنا چاہتے تھے، اچانک ہی واپسی کا پروگرا
تھا۔

آغا جان کے فون اکثر آتے تھے، اور بابا جان پریشان ہو جاتے تھے لیکن ا۔
کچھ نہیں بتاتا تھا کہ کیا بات ہے۔ شاید آغا جان کی طبیعت خراب ہے۔ اس نے خود ہ
لیا تھا۔ جب سے ماریہ گئی تھی۔ اس کا دل بہت گھبرانے لگا تھا۔

وہ ہوتی تھی تو وہ اسفند کا خیال مٹانے میں کامیاب ہو جاتی تھی، لیکن اب تو جیسے
خیال مٹتا ہی نہ تھا۔

پتا نہیں وہ کیسا ہوگا، اس روز کتنا ڈسٹرب اور ٹوٹا ہوا لگ رہا تھا۔

"یا رب العالمین! اسے میرے درد محبت سے نجات دلا، رہا وہ مجھے بھول جائے
کتنی ہی بار بے آواز دعا کرتی۔ آج بھی فجر کی نماز پڑھنے کے بعد قرآن پڑھتے پڑھتے
دل گھبرایا تو وہ باہر نکل آئی۔ اجی اور بابا جان اپنے کمرے میں ہی تھے۔ ان دنوں پھرا
طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ ورنہ ان کی عادت تھی وہ فجر کی نماز پڑھ کر فوراً ہی باہر آ جاتی
اور اکثر قرآن باہر ہی بیٹھ کر پڑھتیں۔ دلبر لان میں پانی دے رہا تھا اور وہ دلبر سے وہ پو
تھی۔ جو کبھی کبھی اسے پریشان کر دیتا تھا۔

دلبر نے ایک نظر اسے دیکھا تھا "کون...... کس سے، تمہاری بات طے نہیں ہوئی ہا
بچی تم تو سوارہ ہو۔ اپنے تھین خاناں سے قتل ہو گیا تھا ناں!"

امبح کو لگا جیسے کسی نے اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا ہو۔ زندگی کے ا
سال اس نے اپنے علاقے میں گزارے تھے، وہ جانتی تھی سوارہ کیا ہوتی ہے۔ وہ جیسے ڈ
گئی تھی۔ ایک ٹک دلبر کو دیکھ رہی تھی، اجی کی خاموشی...... وسیط خان کی سنجیدگی اور ا
کشمالہ کی سرگوشیاں۔

سب اسے اس حقیقت کا ادراک دلا رہے تھے جو دلبر نے کہی تھی۔

"دلبر کاکا۔" اس کے لب پھڑپھڑائے۔

دلبر نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور پھر فوارہ چھوڑ کر اپنے آنسو چھپاتا تیزی سے

کوارٹر میں چلا گیا۔

دلبر جو کبھی کبھی ایب نارمل ہو جاتا تھا، خون میں لت پت اپنوں کے چہرے اسے یاد
آتے تھے، جلتے گھر کی آگ آنکھوں میں دھواں دیتی، تو وہ بلا وجہ ہی بہت باتیں کرتا اور کبھی
چیخ کر روتا اور پھر خود ہی کچھ دنوں بعد نارمل ہو جاتا۔

اسے تھین اور امبح سے بہت پیار تھا، وہ امبح کو بہت سنگین حقیقت بتا کر اپنے کوارٹر میں
چلا گیا تھا اور امبح ہاتھ گود میں دھرے ساکت بیٹھی تھی۔ جیسے پتھر کی ہو گئی ہو۔

وہ دلبر کو روکنا چاہتی تھی، مزید پوچھنا چاہتی تھی، یقین کرنا چاہتی تھی لیکن لفظ اندر ہی
اندر چکرا کر کہیں گم ہو گئے تھے۔

"آؤ گریہ کریں۔"

اس نے زور سے آنکھوں کو بھینچا اور کھولا۔

"صبی۔" اجی نے آہستگی سے آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"یہاں اس طرح کیوں بیٹھی ہو۔ چلو آؤ ناشتا کر لو۔ تمہارے بابا جان انتظار کر رہے
ہیں۔"

'اجی۔" اس کے ہونٹوں سے بمشکل نکلا، اسے لگا جیسے اس کی زبان خشک ہو کر اکڑ چکی
ہ۔

"کیا ہے امبح بیٹا، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" انہوں نے جھک کر اس کے ستے
ہوئے چہرے اور ویران آنکھوں کو دیکھا۔

"اجی۔" اس کے ہونٹوں سے پھر نکلا۔

"میری جان کیا ہوا؟" وہ جیسے تڑپ کر اس کے قریب بیٹھ گئیں اور اس کے ہاتھ اپنے
ہاتھوں میں لے لیے، جو ٹھنڈے یخ ہو رہے تھے۔

"اجی۔"

"میری جان۔" سیکڑوں آنسوؤں کی نمی اجی نے اپنے دل پر محسوس کی، انہوں نے یک
دم اسے سینے سے لگا لیا اور بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگیں۔

"میں سوارہ ہوں اجی؟" اس کے سینے میں چہرہ چھپاتے ہوئے اس نے جیسے سرگوشی
کی۔

امی کا ہاتھ ساکت ہو گیا۔

"امی۔" اس نے سر اٹھا کر دیکھا، ان کا رنگ سفید پڑ گیا، اور اس کے گرد لپٹے ہا
ڈھیلے ہو گئے تھے۔

"دلبر کاکا صحیح کہتا ہے نا؟"

امی کی نظریں جھک گئیں اور سر اثبات میں ہلا۔

اصبح یوں ہی ساکت نظروں سے انہیں دیکھتی رہی، بنا کچھ کہے، بنا کوئی گلہ کیے، پھر ا
کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اٹھایا۔

"چلیں، بابا جان انتظار کر رہے ہوں گے۔"

امی اس بلا کا ضبط دیکھ کر حیران ہوئیں، لیکن یہ ضبط انہیں رلا گیا۔ وہ یک دم اسے گلے
لگا کر رونے لگیں۔

زور زور سے جیسے اکیس سالوں کے آنسو آج ہی بہا دیں گی۔

آؤ گریہ کریں

وحشتو، نفرتو، چاہتو آؤ گریہ کریں

شین خان کی اسٹڈی ٹیبل پر پڑی ڈائری میں لکھی یہ نظم پتا نہیں کیوں اسے اتنی اچھی لگ
تھی کہ اس نے اپنی نوٹ بک میں نوٹ کر لی تھی۔

"کیا ہوا......؟" وسیط خان گھبرا کر باہر نکل آئے۔

"کیا ہوا......؟"

امی کی چیخیں اور بلند ہو گئیں، وہ اس طرح اصبح کو گلے لگائے ہوئے تھیں۔ اصبح نے
نرمی سے انہیں خود سے الگ کیا۔ امی نے زخمی نظروں سے وسیط خان کی طرف دیکھا۔

"اب کیا ہونا ہے خان جو ہونا تھا، اکیس برس پہلے ہو چکا۔"

"امی۔" انہوں نے امی کا ہاتھ تھام لیا اور سہارا دیتے ہوئے اندر چلے۔ اصبح ان کے
پیچھے سر جھکائے اندر آئی۔ امی کو صوفے پر بٹھاتے ہوئے انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔

"کیوں بچی کو پریشان کر رہی ہو، حوصلہ کرو۔" لیکن امی اسی طرح روتی رہیں، ہولے
ہولے۔ اصبح ان کے سامنے خاموش بیٹھی پتھرائی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"اور یہ اچانک کیا ہو گیا تم تو اسے بلانے کے لیے گئی تھیں، کیوں اصبح بچے کیا ہوا

اچانک؟"

"کچھ نہیں بابا جان، میں نے امی سے صرف یہ پوچھا تھا کہ کیا میں سوارہ ہوں۔" اس
کا ضبط کمال تھا۔

وسیط خان کی آنکھوں میں بھی لمحہ بھر کو حیرت اتر آئی۔

"دلبر کاکا نے بتایا تھا مجھے، آپ کے لیے چائے بناؤں اور امی آپ چائے پئیں گی۔"

امی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وسیط خان امی کے پاس سے اٹھ کر اس کے سامنے آ
کھڑے ہوئے۔

"اصبح۔" ان کی آنکھوں میں یک دم اتنی سرخی چھا گئی تھی، جیسے ابھی ان سے خون ٹپک
پڑے گا۔

"بابا جان آپ کا اور امی کا فیصلہ یقیناً درست ہوگا، شاید اور کوئی راستہ نہ ہو آپ کے
پاس۔" وہ بلا کے ضبط کا مظاہرہ کر رہی تھی، اندر طوفان برپا تھا۔

"امی آپ کیوں رو رہی ہیں، میں نے گلہ تو نہیں کیا، صرف تصدیق چاہی تھی۔" وہ
اشتے کی ٹیبل کی طرف بڑھ گئی۔

یہ اچھا ہوا کہ دلبر نے اسے بتا دیا، وسیط خان نے سوچا ورنہ وہ جب بھی اس سے کہنے
لگتے، ان کے حوصلے جواب دے جاتے اور اب تو اسے بتانا ہی تھا۔ آغا جان فون پر فون کیے
جاتے۔

"میں لوگوں کی باتیں نہیں سن سکتا، وسیط خان اب اس معاملے کو ختم کرو، کُند خان وعدہ
کرنے کے باوجود اصرار کر رہا تھا۔"

اور اب کوئی راستہ نہیں رہا تھا، صرف چند دنوں کی بات تھی۔ واپس اپنے علاقے میں
جاتے ہی اصبح کو جرگے کے فیصلے کے مطابق دشمن کے حوالے کر دینا تھا۔ اچھا ہوا دلبر نے بتا
دیا۔ ورنہ وہ تو......

اصبح جسے انہوں نے ڈاکٹر بنایا تھا، جس کی ہر خوشی پوری کی تھی، جس کے دل میں کوئی
بات ہوتی تو وہ جان لیتے، جس کے سامنے وہ آسمان کے تارے توڑ کر رکھنا چاہتے تھے، وہ
اصبح چپ کھڑی تھی، حالانکہ جب شین خان نے آ کر ایک بار پھر کہا تھا۔

لالہ، آپ کُند خان سے بات تو کریں۔ یہ ہے میری تجل اسے ان کے حوالے کر دیں،

میں قاتل ہوں اور یہ میری بیٹی ہے لیکن اصبح کو بچا لیں لالہ، وہ اسفند یار بہت اچھا ہے...... اور وہ شاید پسند کرنے لگا ہے، اصبح کو۔"

اور امی نے کہا تھا" میں اسی دن سے ڈرتی تھی وسیط خان اور کہتی تھی مت بھیجو ا باہر پڑھنے کے لیے۔ مت آگہی دو اسے جاہل رکھو تا کہ تمہارے آگے بول نہ سکے اور خا سے رسم ورواج کی بھینٹ چڑھ جائے۔"

انہوں نے امی کی بات کا جواب نہیں دیا تھا، تب اور ثمین خان کو جھڑک دیا تھا" پاگل ہو گئے ہو ثمین خان، فضول باتیں مت کرو۔"

لیکن ثمین خان کے جانے کے بعد کتنی ہی دیر تک انہوں نے سوچا تھا، اگر اصبح نے اسے یہ فیصلہ قبول نہیں، وہ اس کم عمری کے نکاح کو نہیں مانتی اگر...... کتنے ہی وہموں نے انہیں ستایا تھا اور شاید اسی خوف سے وہ آغا جان کو رضا مندی دے آئے تھے کہ اگلے ہفتے گاؤں واپس آ جائیں گے کنندخان کو بتا دیں۔

اصبح سپاٹ چہرے کے ساتھ ٹیبل کے پاس کھڑی تھی" آیئے بابا جان اور امی آپ بھی ناشتے کے بعد میں اور دلبر کا کال کر پیکنگ کر لیں گے، ہمیں کب جانا ہے۔" اس نے کرسی گھسیٹی۔

آؤ گریہ کریں
آؤ گریہ کریں
اپنے جذبوں کے قتل عمد کا سنو
جبر کے خنجروں سے تڑپتی ہوئی اس محبت کا خوں
جس کی قسمت میں اظہار دن نہیں
اس محبت کی سب رائیگاں ساعتو
آؤ گریہ کریں

"اصبح۔" وسیط خان دو قدم آگے بڑھے اور وہ کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے رک گئی۔

"جی بابا۔"

"جان بابا......" انہوں نے بے اختیار اپنے بازو پھیلا دیئے۔

وہ جو اتنی دیر سے ضبط کا مظاہرہ کر رہی تھی، ان کے گلے لگتے ہی جیسے ضبط کے سارے

بند ٹوٹ گئے، پہلے خشک آنکھیں تر ہوئیں۔ تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑے، پھر ان آنکھوں میں سیلاب آ گیا۔

"میری بچی...... میری زندگی......" وسیط خان اس کے سر پر ہونٹ رکھے رو رہے تھے "ہمیں معاف کر دینا، اپنے ماں باپ کو معاف کر دینا لیکن ہم بہت مجبور ہو گئے تھے۔"

آؤ گریہ کریں
کوکھ نے بے بسی کی جنا تھا جسے
اس محبت کے مرنے پہ گریہ کریں

"بابا جان ایسا مت کہیں، مت کریں ایسی باتیں!"

"تم اپنے بابا کے دل میں رہتی ہو، اپنی امی کی روح میں بستی ہو۔ تم ہمیشہ ہمارے دل میں رہو گی۔"

"اور آپ نے میری دل کی بات نہ جانی۔" اس نے بھیگی پلکیں اوپر اٹھائیں۔

"اسفند بہت اچھا لگا تھا مجھے...... بہت اچھا......"

انہوں نے جیسے اس کے دل کی آواز سن لی تھی، اس کی پلکیں جھک گئیں۔

"اصبح...... ہم کیسے جئیں گے تمہارے بعد...... نہیں جانتے۔ ہمارے دل چیر کر دیکھو اصبح بچے جہاں کہیں سالوں سے جدائی بال کھولے بین کرتی ہے۔ تم کہو گی ہم نے تمہیں سب کچھ کیوں نہیں بتایا اب تک...... تو بچے ہم تمہیں اکیس سال پہلے ہی کیوں عذاب میں مبتلا کر دیتے۔ ہم نے سب کو منع کر دیا تھا۔"

"بابا جان۔" اصبح نے سسکی لی۔

امی نے اب آنکھیں پونچھ لی تھیں اور صوفے پر بیٹھی خاموشی سے اصبح اور وسیط خان کو دیکھ رہی تھیں۔

وسیط خان کے آنسو ان کے رخساروں کو بھگو رہے تھے" مرد تو نہیں روتے بابا جان۔"

اصبح نے دائیں ہاتھ کی انگلی سے ان کے آنسو پونچھے۔

"تمہارا بابا تو اکیس سال سے رو رہا ہے، لیکن اس کے آنسو خود اس کے سوا کسی نے نہیں دیکھے۔" انہوں نے سوچا۔

"وہ اپنی اور تیری بدنصیبی پر روتا ہے اصبح۔"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"بابا جان مت روئیں پلیز، امی کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔"
اس کی نظر امی پر پڑی تھی، جو ساکت بیٹھی تھیں۔
"امی۔" وسیط خان سے الگ ہو کر وہ ان کے پاس آ بیٹھی۔
"کیا سوارہ کبھی اپنے رشتہ داروں سے نہیں مل سکتی۔"
"پتا نہیں۔" امی نے نفی میں سر ہلا دیا۔
ان کو بھلا کیا خبر، وہ تو جب سے پاکستان آئی تھیں، اپنے ہی دکھ میں جلا تھیں، نہ انھوں نے اردگرد دیکھا تھا، نہ انہیں پتا تھا۔
"اچھا...... ہم دعا تو کر سکتے ہیں کیا پتا کبھی...... اور میں...... پریشان نہیں ہوں۔ آپ میرے لیے دکھی نہ ہوں، میری زندگی شین کاکا کی زندگی سے زیادہ اہم تو نہیں ہے۔"
وہ انہیں تسلی دے رہی تھی، بہلا رہی تھی، آنے والی جدائی کے لیے تیار کر رہی تھی اور خود اس کے اندر ماتم بپا تھا۔

آؤ گریہ کریں

دلبر خاموشی سے آ کر اندر بیٹھ گیا تھا، سرخ لال آنکھیں، دہکتا ہوا چہرہ۔
"میں نے دیکھا تھا، تجھے بھی دکھایا تھا نا تمہارا دولہا۔ کندھے پر بٹھا کر جب اس کی شادی ہوئی تھی، وہ ٹیلے پر سے...... یاد ہے نا۔"
اصبح نے بس ایک نظر اسے دیکھا اور پھر امی کی طرف متوجہ ہو گئی۔
"چھی...... گندا...... غلیظ۔" دلبر نے زمین پر تھوک دیا، وہ پھر ابنارمل ہو رہا تھا۔
اصبح کے اندر کہیں کچھ ٹوٹ کر بکھرا تو وہ کسی شادی شدہ شخص کے گھر جائے گی، تاریک زنداں اور دم گھونٹتا اندھیرا مسلسل دیکھا جانے والا خواب کا منظر آنکھوں کے سامنے آ گیا۔
"میں ماروں گا اسے، سب کو...... سب کو ماروں گا۔" دلبر گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگا۔ ہولے ہولے سسکیاں لے لے کر...... اور وہ تینوں چپ بیٹھے اسے دیکھ رہے تھے۔
"آؤ گریہ کریں۔"
دل نے فریاد کی۔
"امی...... بابا جان......" اس نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔ "آپ نے دونوں نے ایک دوسرے کا خیال رکھنا ہے، میرے لیے یہ اطمینان کافی ہو گا کہ جس فضا میں، میں

سانس لے رہی ہوں، اس میں میرے بابا جان اور امی کی سانسوں کی خوشبو بھی ہے، جو سورج جو چاند مجھ پر طلوع ہوا ہے، اسے میرے بابا جان اور امی کی آنکھوں نے بھی دیکھا ہے۔ یہ ہوائیں جو چلتی ہیں، میرے بابا جان کو چھو کر آئی ہیں، لیکن اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو آپ کی اصبح کیسے جیے گی بابا جان کیسے؟" آنسو ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں چمکے۔
وسیط خان نے ایک نظر امی پر ڈالی اور جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا۔
"دیکھ لو اصبح نے ایک بار بھی کچھ نہیں کہا۔ دیکھ لو...... تم ڈرتی تھیں نا...... لیکن ہماری اصبح تو......"
"اور وہ شخص بھلا اس کے قابل ہے۔ وہ تو اس کے پاؤں کی خاک بھی نہیں ہے۔ قوم لوط کا ایک فرد۔" دل جیسے کٹ کٹ کر گرنے لگا۔
"یہ رسمیں...... یہ غلط رواج...... کاش...... کاش کوئی ان کی مذمت کرے...... لیکن کون؟" ان کی آنکھیں بھر آئیں "جانے کب تک بیٹیاں مصلوب ہوتی رہیں گی، جانے کب تک......"
"بابا جان ہمیں کب جانا ہے۔" اصبح نے ہاتھوں کی پشت سے اپنے رخسار پونچھے۔
"کل یا شاید پرسوں۔" انہوں نے ایک گہری سانس لی۔
اور پھر...... ضبط پھر ساتھ چھوڑنے لگا۔ پاس بیٹھی اصبح کو انہوں نے پھر اپنے ساتھ لگا لیا اور ان کے آنسو اس کے بال بھگونے لگے۔ اصبح نے امی کی طرف دیکھا، جن کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں اور دلبر کو جو ابھی تک گھٹنوں پر سر رکھے سسک رہا تھا اور وقفے وقفے سے چھی...... گندا غلیظ...... کہہ کر زمین پر تھوک دیتا تھا۔
بابا جان کو دیکھا، جن کے آنسو اس کے بال بھگو رہے تھے اور اس کے اندر محبت بال کھولے بین کرنے لگی۔

آؤ گریہ کریں
اس محبت کے مرنے پہ گریہ کریں
وحشتو، نفرتو...... چاہتو
آؤ گریہ کریں!

● ● ●

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ٹوٹے ہوئے خوابوں کا مسیحا

ہزار شکلیں ہیں نفرتوں کی
دل بشر وہ شجر ہے
جو بس محبتوں کی ہی نرم نازک فضاؤں میں پھلتا پھولتا
ہے
پل بھر میں سوکھتا ہے
ہوائے نفرت سے اپنے دل کو بچائے رکھنا
اسے محبت کی آب زم زم سے سرور رکھنا

● ● ●

اور میں بھی جارج برنارڈ شاہ کا Discipale Devils ہوں، رچرڈ کی طرح م
نے بھی اپنی روح شیطان کے حوالے کردی ہے۔ جس نے میری روح کو بچوں کے آنسوؤا
والے اس گھر میں برباد ہونے سے بچایا ہے، لیکن میں رچرڈ کی طرح آزادی کا ہیرو نہیں
بنوں گا' بلکہ ہمیشہ Devils ہی رہوں گا۔ اس لیے کہ میرے وجود کو نفرت کے خمیر سے گوند
گیا ہے۔ مجھے ہر شے سے نفرت ہے۔ پھولوں سے، تتلیوں سے، رنگوں سے اور نفرت کا یہ خا
اُفعی سات سال کی عمر سے میرے وجود میں پل رہا ہے...... اور میں پورے کا پورا زہریلا ہو چ
ہوں۔ میں رچرڈ کی طرح اندر سے پادری نہیں بلکہ اندر سے بھی شیطان ہوں اور آج میرے
دل میں ایک نئی نفرت سر اٹھا رہی ہے۔

اس نے زور سے قہقہہ لگایا اور ڈائری کو اچھال دیا جو میز کے کونے سے ٹکرا کر نیچے گر

الی۔ مگر وہ ہنستا چلا گیا...... اور باہر کوریڈور سے گزرتے ہوئے ماریہ احسن نے اس قہقہے کو سنا
اور ایک جھرجھری سی لی۔

کیسا قہقہہ تھا۔ عجیب سی کھنکھناہٹ لیے پورے وجود میں سنسنی پیدا کرتا ہوا۔ لمحہ بھر کو وہ
ہیں ٹھٹک کر رک گئی۔ پھر مڑ کر اس کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا اور آگے بڑھ کر
ہلے سے اسے دھکیلا۔ وہ دروازے کی طرف پیٹھ کیے باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی پر تھوڑا
سا جھکا ہوا تھا۔ پھر جب وہ مڑا تو اس کے ہاتھ میں سیاہ دھبوں والی مسٹرڈ تتلی تھی۔ جس کے
پر کو اس نے چٹکی سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ میں پھڑ پھڑا رہی تھی...... اور اس کے
ہونٹوں پر آسودہ سی مسکراہٹ تھی۔

"اوہ تم کس قدر اذیت پسند ہو فرہاج!"

ماریہ احسن نے سوچا اور بے اختیار ایک قدم آگے بڑھ آئی تو اس نے چونک کر اسے
دیکھا۔

"آپ کو اس مظلوم سی تتلی پر ترس نہیں آتا۔ چھوڑ دیں، پلیز اسے!"

اس کی ہنستی آنکھوں کی رنگت یکدم بدل گئی...... اور وہ جیسے شعلے برسانے لگیں۔ لمحہ بھر
ہونٹ بھینچے اسے دیکھتا رہا۔ پھر تتلی کو جو اس کے ہاتھوں میں ادھ موئی ہو رہی تھی۔ زمین پر
پھینک کر پاؤں سے مسل دیا۔

"اوہ نہیں میرے خدا!"

ماریہ احسن نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیا...... اور تقریباً بھاگتی ہوئی باہر نکل
گئی اور کوریڈور کے سرے پر پہنچ کر اس نے پھر اس کا قہقہہ سُنا، رونگٹے کھڑے کرتا ہوا۔

"اور یہ نئی نفرت تمہارے لیے ہے، ماریہ احسن۔" اس نے جھک کر اپنی نیلی جلد والی
ڈائری اٹھائی اور لکھا۔

"تم جو میری سوتیلی ماں کے لاڈلے بھائی کی اکلوتی خوبصورت بیٹی ہو......" اور مجھے دنیا
کی ساری خوبصورتیوں سے نفرت ہے۔"

"وہ ایسا کیوں ہے انکل......؟"

اور وہیں کوریڈور میں کھڑے کھڑے اس نے اپنے کمرے سے باہر آتے ہوئے
اسلان حیدر سے پوچھ لیا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"اس کے اندر اتنی نفرت، اتنا غصہ کیوں بھرا ہے؟" اور رضوان حیدر کی آنکھ
اداسی اتر آئی۔

"پتا نہیں، وہ ایسا کیوں ہے بیٹے۔ اسے سب سے نفرت ہے، مجھ سے، ما
بہنوں سے، ہر شے سے...... اس کی نفرت مجھے اندر سے ہولے ہولے ختم کر رہی ہے۔
نڈھال نڈھال سے کوریڈور میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے۔

"بچپن سے ہی وہ ہم سب کو ستا رہا ہے' رلا رہا ہے مجھے۔ عطیہ کو، بہنوں کو، م
کر خوش ہوتا ہے' جب عطیہ اس کے لئے کوئی چیز لاتی تھی تو توڑ پھوڑ کر پھینک دیتا
اس کی پلیٹ میں کھانا ڈال کر محبت سے اس کے سامنے رکھتی تو وہ کھانا کھائے بغیر ہی
تھا۔ ایک بار عطیہ نے اس کے لئے سوئیٹر بنایا تو قینچی سے کتر ڈالا۔

"شاید انہوں نے آنٹی کو بطور ماں قبول نہیں کیا ہوگا۔"

"ہاں شاید ایسا ہی تھا۔" رضوان حیدر نادم سے ہو گئے۔

"آپ کو چاہیے تھا کہ شادی سے پہلے اسے اعتماد میں لیتے۔ شاید وہ بہت ح
ہوگا۔"

"ہاں!" رضوان حیدر کے چہرے پر پشیمانی کا رنگ گہرا ہو گیا۔ "شاید غلطی
تھی، میں نے جلدی کی۔"

انہوں نے ایک گہری سانس لے کر ماریہ کی طرف دیکھا۔

"وہ بہت ہنس مکھ بچہ تھا۔ ہر ایک اس سے پیار کرتا تھا۔ مگر شاید وہ عاتکہ کے
قریب تھا۔ اسی لیے تو اس نے عطیہ کو بطور ماں قبول نہیں کیا...... اور جب میں نے
کہ یہ تمہاری نئی ممی ہیں تو اس نے نفرت سے عطیہ کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو جھٹک دیا
یہ ممی نہیں، یہ تو ڈائن ہیں۔" اور میں ایک سات سالہ بچے کے منہ سے یہ بات سن کر
زدہ رہ گیا۔ پتا نہیں کس نے اس کے معصوم ذہن کو زہر آلود کر دیا تھا...... اور وہ نفرت
دن اس کی آنکھوں میں نظر آئی تھی، ہر گزرتے پل کے ساتھ بڑھتی ہی گئی بلکہ اب تو
لگتا ہے، جیسے اسے اپنے آپ سے بھی نفرت ہو۔ وہ خود سے بھی محبت نہیں کرتا۔"

"شاید آنٹی کا رویہ ان کے ساتھ۔" وہ کچھ کہتے کہتے جھجک گئی۔

"تمہاری آنٹی!"

انہوں نے سر اٹھا کر اس پیاری سی دلکش لڑکی کی طرف دیکھا، جو آنکھوں میں درد کی
قندیلیں جلائے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"وہ روایتی سوتیلی ماں نہیں تھی۔ اس نے بہت کوشش کی، مگر جب بار بار اس کے
بڑھے ہوئے ہاتھوں کو جھٹک دیا گیا تو اس نے بھی اپنا آپ الگ کر لیا اور اس سے بے پروا
ہوگئی۔ اس کا کوئی قصور نہیں ہے بیٹا!"

رضوان حیدر کی آنکھیں نم ہوگئیں اور وہ نہ جانے کس کام سے باہر نکلے تھے۔ اٹھ کر
واپس اپنے کمرے میں چلے گئے...... اور اس کا دل ان کے لئے گداز ہو گیا اور اس نے وہیں
کھڑے کھڑے سوچا۔

"آنٹی قصوروار نہ سہی، مگر پھر بھی غلطی کہیں ابتداء میں ہی ہوئی ہے، کوئی ایک نہیں بلکہ
شاید دونوں ہی قصوروار ہیں۔"

اس نے مڑ کر فرہاج حیدر کے کمرے کی طرف دیکھا اور ایک جھرجھری سی لی۔ کس قدر
دل ہلا دینے والا قہقہہ تھا۔ لمحہ بھر کو اس کی آنکھوں کے سامنے اس کا چہرہ آ گیا۔ کیسی آگ تھی،
جو اس کی آنکھوں سے نکل رہی تھی اور وہ اس کے ہاتھ میں پھڑ پھڑاتی ہوئی تتلی۔

"تو یہ تم ہو فرہاج حیدر! مگر میرے خیالات، میرے تصورات سے کس قدر مختلف۔
ایک بیمار ذہن کے انسان اور میں۔"

اس کے ہونٹوں پر ایک نامعلوم سی مسکراہٹ آ کر ٹھہر گئی۔ میں فرحی کی البم میں تمہاری
تصویر دیکھ کر پتا نہیں کیا سوچا کرتی تھی۔ تم جو تصویروں میں اتنے خوبصورت دکھائی دیتے
تھے۔ اندر سے اتنے زہریلے ہو کہ تمہیں دیکھ کر خوف سا آنے لگا ہے۔ یوں لگتا ہے، جیسے
ساری دنیا تمہارے سامنے ایک حقیر کیڑے کی طرح ہے اور تم ابھی اسے پاؤں تلے مسل کر
آگے بڑھ جاؤ گے۔

اور فرہاج حیدر اپنی نیلی جلد والی ڈائری بیڈ پر پھینک کر باہر نکلا تو کوریڈور میں ساکت
لڑکی کچھ سوچتی ہوئی ماریہ کو دیکھ کر ہولے ہولے چلتا ہوا اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔
ماریہ کی ہتھیلیاں پسینے میں بھیگ گئیں۔ فرہاج لمحہ بھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا
رہا۔ ماریہ نے نگاہیں جھکا لیں تو وہ زہریلے انداز میں مسکرایا۔ "میں آپ سے نفرت کرتا ہوں
مس ماریہ!"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

اس نے لفظ چبا کر منہ سے نکالے اور ایڑیوں کے بل تیزی سے گھوم گیا اور وہ آ
پھاڑے حیرت سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

● ● ●

"نانو! نانو! گھر کب چلیں گے ہم؟"
سیاہ نیکر' سرخ شرٹ پہنے وہ سرخ و سپید اور بے حد خوبصورت بچہ ان کے اردگرد گھو
تھا۔
"چلیں گے بیٹا!"
"مگر اتنے دن تو ہو گئے ہیں، ہمیں آئے ہوئے۔ مجھے مما اور پپا بہت یاد آر
ہیں...... اور پھر مما تو فون بھی نہیں کرتیں اور آج تو پپا نے بھی فون نہیں کیا۔ میں صبح سے
کے پاس بیٹھا ہوں۔"
"اب کیوں کرے گا فون۔ چونچلوں سے فرصت ملے گی تو تیری یاد آئے گی نا
ارے دیکھ لی مرد کی محبت۔ ابھی تو میری عاتو کا کفن بھی میلا نہیں ہوا اور سہرا سجا لیا۔" نانو
ٹھنڈی سانس لی۔
"نانو!" اس نے پیار سے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔
"کب چلیں گے گھر' بتائیں نا؟"
"کیا کرے گا وہاں جا کر۔ اب کیا ہے، تیرے لیے وہاں؟"
"میری ممی اور پپا۔" اس نے لاڈ سے کہا۔
"ارے مرگئی، تیری ممی بدنصیب۔"
نانو نے اس کے بازو جھٹک دیے تو قریب بیٹھے مطالعہ کرتے صفدر مرزا نے نا
نظروں سے انہیں دیکھا۔
"اماں پلیز! اب رضوان بھائی کا غصہ اس معصوم بچے پر تو نہ اتاریں۔ وہ کیا جانے
کتنی بڑی دولت سے' کتنی بڑی شفقت سے محروم ہو گیا ہے۔"
"کیا کروں صفدر! میرے اندر آگ لگی ہوئی ہے۔ چار دن بھی صبر نہ ہوا ا
سے۔ ابھی تو میری عاتو کی قبر کی مٹی بھی خشک نہیں ہوئی تھی، میری بدنصیب بچی۔"
نانو رونے لگیں تو وہ پریشان سا ہو گیا اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے ان کے آ

صاف کرنے لگا۔
"نانو! آپ کیوں روتی ہیں۔ مت روئیں نا! مجھے پتا ہے، آپ کو بھی ممی یاد آ رہی ہیں۔
ممی گندی ہیں۔ آتی کیوں نہیں ہیں؟"
"میرے بدنصیب، بدقسمت بیٹے!"
نانو نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا...... اور اس کے چہرے اس کے ماتھے اور اس کی
آنکھوں کو چومنے لگیں۔
"اماں پلیز!" صفدر مرزا نے انہیں پھر ٹوکا۔ "بچے کو ڈسٹرب نہ کریں۔"
"ادھر آؤ بیٹا!" انہوں نے اسے بلایا۔
"جی ماموں!" وہ مڑ مڑ کر حیران نظروں سے نانو کو دیکھتے ہوئے، ان کے پاس جا کھڑا
ہوا۔
"بیٹے! آپ اچھے بچے ہیں یا گندے بچے۔"
"میں اچھا بچہ ہوں۔" وہ ذرا سا اکڑ گیا۔
"تو پھر آپ کو پتا ہے۔ اچھے بچے ضد نہیں کرتے۔"
"میں ضد تو نہیں کرتا ماموں جان! بس میں تو اپنی ممی اور پپا کے پاس جانا چاہتا ہوں۔
یہاں میرا دل نہیں لگتا...... اور پھر مجھے یہاں ڈر بھی بہت لگتا ہے۔"
وہ روہانسا ہو گیا۔
"ارے آپ ڈرتے ہیں، آپ تو بڑے بہادر بچے ہیں۔ پھر آپ کی نانو! آپ کے
پاس ہی تو سوتی ہیں۔"
"مجھے رات کو تھوڑا ہی ڈر لگتا ہے مجھے تو۔"
اس نے سہمی سہمی نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور پھر جھک کر ان کے کان میں
سرگوشی کی۔
"مجھے تو نصرت آنٹی سے ڈر لگتا ہے۔"
لمحہ بھر کو صفدر مرزا کا چہرہ تاریک سا ہو گیا۔
"نہ اچھے بچے کسی سے نہیں ڈرا کرتے۔"
"اچھا لیکن آپ مجھے ممی کے پاس کب لے چلیں گے؟"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"پر بیٹا! آپ کی می تو بہت دور چلی گئی ہیں۔"

"کیوں وہ اتنی دور چلی گئی ہیں، ماموں جان مجھے کیوں ساتھ لے کر نہیں گئیں مجھے کبھی گھر چھوڑ کر نہیں گئیں۔" اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"پتا ہے ماموں۔" اسے اچانک یاد آ گیا۔

"می تو میرے لیے بہن لینے گئی تھیں۔ کیا بہن بہت دور سے ملتی ہے۔ وہ کب گی۔"

"آجائیں گی بیٹا!"

"اچھا تو پھر آپ مجھے پپا کے پاس ہی چھوڑ آئیں۔"

"مگر بیٹا! پپا تو گھر پر اکیلے ہیں۔ پھر وہ صبح آفس چلے جاتے ہیں۔ آپ کا دھلائے گا۔ کپڑے کون تبدیل کروائے گا، پھر تیار کر کے اسکول کون بھیجے گا۔"

"آپ کو پتا نہیں ماموں جان۔" اس نے کسی قدر تفاخر سے کہا۔

"میں تو خود تیار ہو سکتا ہوں۔ کنگھی بھی خود ہی کر لیتا ہوں اور ہوم ورک بھی تو خو لیتا ہوں، جب می بیمار تھیں نا تو میں خود ہی صبح صبح تیار ہو جاتا تھا۔"

"اچھا پھر تو ہمارا بیٹا بہت اچھا ہے۔"

"میں پپا کو تنگ نہیں کروں گا۔ آپ مجھے پپا کے پاس چھوڑ کر آئیں پلیز!"

"اچھا تو پھر کل آپ کو لے چلیں گے۔"

"پرامس۔" اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"پرامس!" صفدر مرزا نے اس کے ننھے سے گدگدے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"اب چلیں۔ ذرا مارکیٹ تک اور اپنے پیارے سے بیٹے کو آئس کریم کھلا لا کھائیں گے نا!"

"یس ماموں جان!"

اس نے خوشی سے اچھل کر کہا...... اور اچھلتا کودتا باہر نکل گیا۔ نانو ابھی تک ر تھیں۔ باہر جاتے جاتے صفدر مرزا پلٹے اور ہولے سے ان کے کندھے تھپتھپائے۔

"حوصلہ کیجئے اماں! انسان بڑا بے اختیار ہے۔"

"ماموں جان!" اس نے پردہ اٹھا کر انہیں پکارا تو وہ باہر نکل آئے۔

تب ہی کوریڈور کے ایک سرے پر ربڑ پلانٹ کے گملے کے پاس کھڑی اس کے پتوں کو صاف کرتی نصرت جہاں نے مڑ کر انہیں دیکھا اور نفرت سے ہونٹ سکیڑ لیے۔ خود بخود ہی ان کے ہاتھوں پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی اور وہ سہم کر تھوڑا سا ان کے پیچھے چھپ گیا۔ صفدر مرزا نے غور سے اس کی آنکھوں میں ابھرتے خوف اور ڈر کے سائے دیکھے اور تنبیہی نظروں سے نصرت جہاں کی طرف دیکھا۔

"چل دیئے بھانجے کے ساتھ فضول خرچیاں کرنے۔"

"نصرت۔" ان کے لہجے میں سختی آ گئی۔

نصرت جہاں نے حقارت سے اسے دیکھا۔

"بیٹا! آپ جائیں۔ ڈرائیور سے کہیں گاڑی نکالے۔ ہم ابھی آتے ہیں۔"

"کیا بگاڑا ہے، اس معصوم نے تمہارا۔"

نصرت نے کندھے اچکائے اور گملے کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"تمہیں اس پر ترس نہیں آتا نصرت۔" ان کی آواز نرم پڑ گئی۔

"مجھے کیوں ترس آئے گا۔ اس کی ماں نے کبھی ترس کھایا مجھ پر۔ سب جانتی ہوں۔ بےوقوف نہیں ہوں، صفدر مرزا چپکے چپکے تمہیں دوسری شادی کے مشورے کون دیتا تھا۔"

"یہ جاننے کے بعد کہ تمہارے ہاں اولاد نہیں ہو سکتی، اگر اس نے کبھی مجھے دوسری شادی کے لئے کہا بھی تھا تو کچھ غلط یا بے جا تو نہیں کہا تھا۔ بہن تھی وہ میری جب کہ تم یہ بھی اچھی طرح جانتی ہو نصرت جہاں کہ ہمیں اپنی قسم کا آج بھی پاس ہے ورنہ۔"

اور اس ورنہ کے بعد وہ کیا کہتے، یہ نصرت جہاں اچھی طرح جانتی تھیں، انہوں نے مڑ کر انہیں دیکھا اور اوچھا وار کیا۔

"عاتکہ بیگم مجھ پر سوکن لا رہی تھیں، خود پر سوکن پڑ گئی۔"

"نصرت!" صفدر مرزا کی آواز پھر بلند ہو گئی۔

"بخدا اگر ہمارے پاؤں میں اپنی ہی کھائی ہوئی قسم کی زنجیر نہ ہوتی تو ہم اسی وقت آپ کو اپنی زندگی سے خارج کر دیتے۔ مگر دکھ تو یہ ہے کہ ہم نے لب گور تایا ابا کے سامنے قسم کھائی تھی کہ آپ کو کبھی اپنی زندگی سے الگ نہیں کریں گے۔ ہم نے آپ کو آپ کی تمام خامیوں سمیت قبول کیا تھا۔ مگر خدارا ہماری زندگی کو جہنم مت بنائیں۔"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ان کی آواز یک لخت پھر دھیمی پڑ گئی۔

"آپ کیسی عورت ہیں نصرت جہاں! کہ اس ذرا سے بچے سے اس لیے نفر
ہیں کہ اس کی ماں نے ہمیں دوسری شادی کا مشورہ دیا تھا۔ بچے تو فرشتے ہوتے ہیں
مگر تمہارے اندر ماتا کا گداز ہی نہیں ہے، اس سے پیار کر کے دیکھو نصرت! اسے
دیکھو تمہارا اندر روشن ہو جائے گا۔"

"ہوں!" انہوں نے نخوت سے ہونٹ سکیڑے اور منہ موڑتے ہوئے بڑبڑائیں
"محبت کرنے کے لئے آپ اور چچی اماں کم ہیں کیا؟"

صفدر مرزا نے تاسف سے انہیں دیکھا۔

"خدا نے آپ کو اولاد نہیں دی تو اچھا ہی کیا۔ آپ اس قابل ہی نہیں تھیں کہ
آپ کی جھولی میں ڈالا جاتا۔"

"وہ تم سے پھر آپ پر اتر آئے۔" اور اس سے پہلے کہ نصرت جہاں جواب م
کہتیں۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتے پورچ کی طرف بڑھ گئے۔

● ● ●

چڑیا کے بچے کو ہتھیلی پر رکھے وہ سر اونچا کیے روشندان کو دیکھ رہی تھی۔ جہاں چڑ
گھونسلا بنا رکھا تھا، مگر روشندان اونچا تھا اور اس کا ہاتھ وہاں نہیں پہنچ سکتا تھا، اس نے
اُدھر دیکھا، مگر آس پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی، جس پر چڑھ کر وہ بچے کو دوبارہ گھونسلے میں
دیتی۔ وہ مایوسی سے چڑیا کو دیکھنے لگی۔ جو چوں چوں کرتے ہوئے اس کے سر پر چکر لگا
تھی۔ تب ہی قدموں کی آہٹ پر اس نے مڑ کر دیکھا۔ فرہاج اپنے کمرے سے باہر آ رہا
بے اختیار وہ اس کی طرف بڑھی۔

"فرہاج بھائی پلیز! ایک منٹ یہ بچہ گھونسلے میں رکھ دیں۔"

اپنی ہی دھن میں سر جھکائے جاتے ہوئے، فرہاج نے رک کر حیرت سے اسے دیکھ
جو چڑیا کے ننھے سے بچے کو ہتھیلی پر رکھے، سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں پلیز! رکھ دیں، ناں ......! بے چارا گھونسلے سے گر پڑا ہے اور ابھی اڑ نہیں سکتا"

"رکھ دوں!" فرہاج نے تیز نظروں سے اسے گھورا۔

ماریہ نے نگاہیں جھکا لیں۔ "جی!"

اور فرہاج کے چہرے کی رعونت یکدم لوٹ آئی اور چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ اس نے اس کی
پھیلی ہوئی ہتھیلی پر سے بچہ اٹھایا اور پوری طاقت سے لان کی طرف پھینک دیا۔ ماریہ کا چہرہ
یکدم زرد پڑ گیا۔ اس نے پھٹی پھٹی نظروں سے فرہاج کو دیکھا اور اس کی اڑی اڑی رنگت
دیکھ کر اس نے زور سے قہقہہ لگایا۔ وہی وحشی قہقہہ ہڈیوں میں سنسناہٹ پیدا کرتا ہوا اور ماریہ
نے جیسے ہوش میں آتے ہوئے اسے جھنجوڑ ڈالا۔ "تم تم نے ظالم آدمی اسے مار ڈالا، پتھر دل
وحشی آدمی۔"

فرہاج حیدر نے اپنا گریبان چھڑاتے ہوئے زہریلی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"ہر روز نہ جانے کتنے بچے اپنے اپنے گھونسلوں سے گر جاتے ہیں...... اور کوئی انہیں
اٹھا کر ان کے گھونسلوں میں نہیں رکھتا اور وہ راہ گیروں کے قدموں تلے آ کر کچلے جاتے ہیں۔
آپ کے دل میں اتنا ہی گداز ہے، اتنی ہی ہمدردی ہے، تو انہیں بچائیے اور یہ تو محض ایک
چڑیا کا بچہ تھا۔"

اور پتا نہیں اس لمحے اس کے لہجے میں کیا تھا اور اس کے چہرے پر کیسی ناقابل بیان سی
کیفیت تھی کہ ماریہ کے اندر جیسے کچھ پگھلنے لگا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی۔ وہ تیز تیز قدم
اٹھاتے آگے بڑھ گیا۔

لمحہ بھر وہ یونہی ساکت کھڑی رہی۔

"آخر کیا ضرورت تھی مجھے اسے روکنے کی؟" اس نے تاسف سے سوچا۔

"اور کیا مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ ساری دنیا سے خفا ہے، حتیٰ کہ اپنے آپ سے بھی۔"

چڑیا نے اس کے سر کے گرد چکراتے ہوئے شور مچایا تو وہ چونک کر لان کی طرف بھاگی
بچہ بے حس و حرکت پڑا تھا، یکدم ہی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور وہ دونوں
ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو دی۔

اور تب ہی فرہاج حیدر واپس پلٹا۔ وہ ایک ضروری فائل اندر کمرے میں ہی بھول آیا
تھا۔ اسے لان میں بیٹھے روتے دیکھ کر لمحہ بھر کے لئے وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ پھر ایک نظر اس پر
ڈال کر آگے بڑھ گیا۔

کس قدر انہونی بات ہے کہ ایک چڑیا کے بچے کے لئے رو رہی ہے۔ اس نے سوچا
اور جب وہ اپنے کمرے سے مطلوبہ فائل اٹھا کر واپس مڑا تو وہ اسی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"سوری مس ماریہ!"

اس کے پاس سے گزرتے ہوئے غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے نکل گیا اور خود ہی اپنی اس بات پر حیران رہ گیا۔ اس کا چہرہ یکدم سرخ پڑ گیا اور تقریباً بھاگتا ہوا کی طرف بڑھ گیا۔

ماریہ نے اپنی بھیگی پلکیں اٹھائیں۔ مگر وہ جا چکا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا، کہ شخص نے اسے سوری کہا ہے جو بات کرتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے پتھر پھینک رہا ہو۔

اسے یہاں آئے ہوئے کتنے دن ہو گئے تھے اور ایک دن بھی ایسا نہ تھا۔ جب اس اس کے رویے کو نارمل پایا ہو۔ اس کی کمانیں ہمیشہ تنی رہتیں۔ ہونٹ زہر میں بھیگے رہتے ا ہر وقت زہر اگلتا رہتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے دنیا کی ہر شے سے نفرت ہو۔ ابھی کل اس نے فرحی سے کہا تھا۔

"سوری فرحی! تمہارے بھائی کا سدھرنا ناممکن ہے۔ یہ تو کوئی زبردست قسم کمپلیکیٹڈ کیس ہیں۔"

اور فرحی کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

"ہمارا کتنا دل چاہتا ہے۔ وہ ہمارے ساتھ ہنسیں بولیں، باتیں کریں، ہمیں گھما لے جائیں۔ ہم ان سے ضدیں کریں۔ فرمائشیں کریں، مگر پتا نہیں کیوں وہ ایسے کیوں ہیں؟ سب سے متنفر اور خفا۔"

اور یہی بات وہ خود بھی جاننا چاہتی تھی۔ اس نے رضوان حیدر سے بھی پوچھا تھا اور یہی بات اس نے عطیہ بیگم سے بھی پوچھی تھی۔

"وہ ایسا کیوں ہے آنٹی؟"

"پتا نہیں۔" عطیہ بیگم نے لاپروائی سے کہا۔ "وہ بچپن سے ہی ایسا ہے۔"

"کہیں یہ آپ کی کوتاہی تو نہیں آنٹی؟" وہ ہمیشہ سے صاف گو تھی۔

"میری کوتاہی۔" ان کی آنکھوں میں حیرانی اتر آئی۔

"ہاں آنٹی! ظاہر ہے، وہ آپ کا بیٹا نہیں تھا۔ ممکن ہے، یہ اس نفرت اور لاپروائی ردعمل ہو، جو آپ نے اس کے ساتھ برتی اور اب جب کہ وہ خود مختار ہے تو لاشعوری طور پر اس کا اظہار کر رہا ہو۔"

"نہیں، نہیں، رما! میں نے اس سے کبھی نفرت نہیں کی، مگر شاید لاپروائی ضرور برتی۔"

ان کی آنکھوں میں ندامت اتر آئی۔

"میں نے اسے خود سے مانوس کرنے اور اپنے قریب لانے کی بہت کوشش کی تھی۔ مگر وہ میرے قریب ہی نہیں آتا تھا۔ شاید نانی اور ممانی نے میرے خلاف اس کے دل میں پہلے ہی زہر بھر دیا تھا اور پھر میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔"

انہوں نے اعتراف کیا۔

"کاش آپ اسے اس کے حال پر نہ چھوڑتیں۔" ماریہ نے تاسف سے سوچا تھا۔

"آپ نے اس سے نفرت نہیں کی آنٹی! مگر محبت بھی نہیں کی۔ آپ نے اسے اپنی ذمہ داری تو سمجھا، لیکن دل کا ٹکڑا نہیں جانا۔ آپ نے اس سے محبت کی ہوتی آنٹی! تو آج یہ شخص اتنا بکھرا ہوا نہ ہوتا۔ محبتیں کبھی نہ کبھی اپنا آپ منوا لیتی ہیں، وہ تو پتھروں کو بھی موم کر دیتی ہیں اور یہ تو محض ایک بچہ ہی تھا۔"

عطیہ بیگم کے دل پر ندامت کا بوجھ بڑھ گیا۔

"شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔ مگر اب تو ڈور ہاتھوں سے نکل چکی ہے۔ رضوان اس کے لئے دکھی رہتے ہیں۔ فرحی اور ثوبی اس کی وجہ سے سہمی سہمی رہتی ہیں۔"

"اب بھی کچھ نہیں بگڑا آنٹی۔" اس نے بڑے یقین سے کہا۔

"وہ اب بھی پلٹ سکتا ہے کہ محبت میں بڑی قوت ہوتی ہے......! اور پھر ماں کی محبت۔ آپ اس سے محبت تو کر کے دیکھیں۔ اسے خود میں شامل تو کر کے دیکھیں۔ دراصل آپ سب نے اسے خود سے الگ کر دیا ہے۔ اس سے ڈرنے کے بجائے اس کے قریب ہونے کی کوشش کریں۔ اس سے اس کی مصروفیات اور مشاغل کا پوچھیں۔ اپنے اور اس کے مسائل شیئر کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ بدل نہ سکے۔"

"مگر وہ تو میری بات کا جواب تک نہیں دیتا۔" عطیہ بیگم نے مایوسی سے کہا۔

"آپ کوشش تو کریں آنٹی! پتھر پر بھی اگر مسلسل پانی پڑتا رہے تو وہ بھی گھس جاتا ہے اور فرہاج تو آخر انسان ہے۔ کبھی نہ کبھی تو وہ پگھلے گا ہی نا۔"

اور اس رات کھانے کی میز پر عطیہ بیگم نے بڑے پیار سے ڈونگہ اس کی طرف بڑھایا۔

"بیٹا! یہ روسٹ کھاؤ۔ تمہارے لیے ہی بنایا ہے۔"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

اور اس نے سر اٹھا کر علیہ بیگم کو دیکھا۔ لمحہ بھر کے لئے اس کی آنکھوں میں حیرت اتری۔ پھر وہ تمسخر سے ہنسنے لگا۔ اس نے ڈونگہ دوسری طرف کھسکا دیا اور پلیٹ میں تم سا قیمہ ڈال دیا۔

"بیٹا! تم نے میٹھا تو لیا ہی نہیں۔"

اسے ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کرتے دیکھ کر علیہ بیگم نے پھر کہا۔

"یہ انڈوں کا حلوہ فرحی نے بنایا ہے۔ چکھ کر تو دیکھو بیٹا!"

"ہاں ہاں کھاؤ نا بیٹا! بہت اچھا بنا ہے۔" رضوان حیدر نے بھی کہا تو پتا نہیں کیا سوچ کر اس نے تھوڑا سا حلوہ اپنی پلیٹ میں ڈال لیا۔

"کیا بات ہے بیٹا! آج کل دیر سے گھر آتے ہو۔ کیا آفس میں کام زیادہ ہوتا ہے؟" علیہ بیگم نے سیب کاٹتے ہوئے پوچھا تو وہ ایکدم بھڑک اٹھا۔

"آپ کو اس سے کیا غرض کہ میں دیر سے آتا ہوں یا جلدی اور پھر یہ ساری خوشامد کس لیے؟ صاف صاف کہیں۔ آپ کو مجھ سے کیا مطلب ہے؟" علیہ بیگم کی رنگت سفید پڑ گئی۔

ماریہ نے ہولے سے ان کا ہاتھ دبایا۔

"مجھے بھلا تم سے کیا غرض ہو سکتی ہے، بیٹا!" انہوں نے آہستگی سے کہا۔

"یہ تو آپ خود بہتر جان سکتی ہیں۔"

وہ ایک دم کھڑا ہو گیا اور کرسی کو پیچھے دھکیلتے ہوئے تمسخر سے انہیں دیکھا اور ہولے سے ہنسا۔ عجیب سی ہنسی تھی، طنز، تمسخر، تلخی اور جانے کیا کچھ تھا، اس ہنسی میں۔

"تم نے دیکھا تم نے دیکھا رما بیٹے۔" اس کے جاتے ہی علیہ بیگم نے شکوہ کیا۔ "وہ ایسا ہی ہے، اسی طرح تیر چلاتا ہے، یوں ہی زخمی کرتا ہے۔"

رضوان حیدر کے چہرے پر کرب اُمڈ آیا۔

فرحی اور ثوبی نے بھی کھانے سے ہاتھ روک لیا تھا۔

"برسوں کا زنگ لمحوں میں تو نہیں اتر سکتا آنٹی! اور پھر یہ سب کچھ اس کے لئے نیا ہے۔ جس چیز سے وہ آشنا ہی نہیں اس کے مفہوم اور معنی سے کیسے آگاہ ہو سکتا ہے۔ اس نے محبتوں کا ذائقہ ہی نہیں چکھا آنٹی! تو پھر اگر وہ محبتوں پر شک کرتا ہے تو کچھ غلط تو نہیں۔ اگر ہم خود ہی ہمت ہار دیں گے، خود ہی یہ سوچ کر اسے نظر انداز کر دیں گے کہ وہ سدھر نہیں سکتا

تو پھر وہ کیسے سدھرے گا۔ پلیز آنٹی! آپ انکل کے لئے، فرحی اور ثوبی کی خاطر اس کے غصے کو برداشت کریں تو مجھے یقین ہے وہ پلٹ آئے گا۔ ان محبتوں کی طرف جو ہاتھ پھیلائے اس کی منتظر ہیں۔"

رضوان حیدر نے ممنون نظروں سے اسے دیکھا اور ٹیبل سے اٹھ گئے۔ اس رات وہ بہت دیر تک اس کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ وہ جو بہت خوبصورت اور وجیہہ تھا۔ جس کی لانبی سیاہ آنکھوں میں غصہ ہر وقت بل کھاتا رہتا تھا۔

جس کی پیشانی پر ہمیشہ شکنیں پڑی رہتی تھیں اور ہونٹ زہر میں بھیگے رہتے۔ اس کی زبان سے نکلنے والا ایک ایک لفظ سب کو رلاتا تھا۔ زخمی کرتا تھا، لیکن کیسی عجیب بات تھی کہ ...... کہ سا پتھر دل، اکھڑ شخص کی تصویر پہلی بار دیکھتے ہی اس کے دل میں خوشگوار سی دھڑکنیں جاگ اٹھی تھیں...... اور ایک طویل عرصہ تک تو اسے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ وہ اس کی پھپھو کا سگا نہیں، بلکہ سوتیلا بیٹا ہے، نہ ہی فرحی اور ثوبی نے کبھی بتایا، نہ پھپھو نے کبھی ذکر کیا۔ فرحی نے جب بھی اس کی بات کی یہی کہا۔

"فرہاج بھائی! بہت کم گو ہیں۔"

"انہیں بہت غصہ آتا ہے۔"

"ہمیں کبھی گھمانے نہیں لے گئے۔"

وغیرہ وغیرہ! لیکن اس نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اس حد تک تند خو اور بدمزاج ہوگا بلکہ اس کے تصور نے اسے ہمیشہ ایک مدبر اور سنجیدہ مرد کے روپ میں دیکھا تھا اور جب وہ پہلی بار کراچی آئی تھی اور اس سے ملی تھی تو اسے اپنے آپ پر بڑا غصہ آیا تھا۔

"لعنت ہو تم پر ماریہ احسن! کہ تم بھی وہی عام سی لڑکی ہو۔ خوابوں اور خیالوں میں رہنے والی جو اپنے خوابوں اور خیالوں کی دنیا سے باہر آ کر جب اپنے اردگرد دیکھتی ہے تو پہلا نظر آنے والا مرد ہی اس کی دھڑکنوں میں بس جاتا ہے۔ خواہ وہ کیسا ہی کیوں نہ ہو اور تم بھی اس مرد کے لئے سوچتی رہی ہو۔ جسے بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں جو محبت کرنے کا ہنر جانتا ہی نہیں۔"

اسے کتنا اشتیاق تھا فرہاج حیدر سے ملنے کا اس کو دیکھنے کا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ایک بار تو اسے دیکھ کر ضرور چونکے گا۔ وہ جو اپنے کالج کی بیوٹی کوئین تھی، مگر جب اس نے اس کی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تو اسے بڑی ندامت ہوئی تھی اور بے حد غصہ آیا تھا، ہولے ہولے یہ غصہ ہمدردی میں بدل گیا۔ اسے اس پر ترس آنے لگا۔ وہ جو بھرے گھر میں رہتے ہوئے تنہا تھا۔ سب کے ہوتے ہوئے اکیلا تھا، جو بچپن میں ہی ماں کی محبت و شفقت سے محروم ہو گیا تھا۔ جس نے نہ جانے اب تک کتنی محرومیوں کا عذاب جھیلا تھا کہ اس کی شخصیت مسخ ہو کر رہ گئی تھی اور وہ بڑی سنجیدگی سے اسے سدھارنے کی سوچنے لگی تھی۔ خود بخود ہی اس نے اپنے دل میں ارادہ کر لیا تھا کہ وہ سب کے ساتھ مل کر ان محرومیوں کا ازالہ کر دے گی، جو اپنوں نے اسے دی تھیں۔

مگر اس سے صرف رات کے کھانے پر ہی ملاقات ہوتی تھی۔ دن کا کھانا وہ باہر کھاتا تھا اور ناشتا بھی اپنے کمرے میں ہی کر لیا کرتا تھا۔ مگر جب رات کے کھانے پر صا بیگم، فرحی، ثوبی سب نے ہی اس پر توجہ دینی شروع کر دی، اس کے غصے اور اس کی تلخ و ترش باتوں کی پروا کیے بغیر وہ اس سے باتیں کرتے، اسے اپنی باتوں میں شریک کرنے کی کوشش کرتے تو اس نے چڑ کر رات کا کھانا بھی اپنے کمرے میں کھانا شروع کر دیا تھا۔ ابھی کل رات ہی اس نے فرحی، ثوبی کو اس کے کمرے میں چلنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ بیڈ پر اوندھا لیٹا تھا

"فرہاج بھائی!" ثوبی نے ڈرتے ڈرتے پکارا تو اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

"کیا بات ہے؟"

ثوبی نے سٹپٹا کر اس کی طرف دیکھا۔

"وہ دراصل ہم لوگ کارڈز کھیلنے لگے تھے۔ آپ بھی ہمارا ساتھ دیں ناں۔" ماریہ۔ ثوبی کے گھبرانے پر وضاحت کی تو خلاف توقع اس نے نرمی سے انکار کر دیا۔

"آپ لوگ کھیلیں میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔"

"میں آپ کا سر دبا دوں فرہاج بھیا۔"

فرحی نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا تو اس نے بے دردی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"نہیں چاہئیں مجھے تمہاری یہ ہمدردیاں اور محبتیں۔" وہ اس زور سے دھاڑا کہ فرحی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"نکل جاؤ میرے کمرے سے۔"

اس کا لحاظ کیے بغیر اس نے بری طرح فرحی کو ڈانٹ دیا تھا اور تب اس نے بڑی مایوسی سے سوچا تھا کہ اس کا سدھرنا ناممکن ہے۔ نفرتوں نے اسے اس حد تک پتھر بنا دیا ہے، کہ محبتوں کی مسلسل بوچھاڑ بھی اسے نرم نہیں کر پا رہی ہے، لیکن ابھی ابھی اس کے کانوں نے یہ کیا سنا تھا۔ اسے اپنے رویے پر افسوس ہوا تھا۔ وہ نادم تھا۔ تو...... تو کیا پتھر میں شگاف ہو گیا ہے؟" اس نے خوش دلی سے سوچا اور ہتھیلیوں کی پشت سے اپنے بھیگے رخساروں کو صاف کیا۔

"بہر حال یہ ایک مثبت رویہ ہے۔"

اس نے اپنے اندر طمانیت سی محسوس کی اور بڑے غور سے چڑیا کے چھوٹے بچے کو دیکھا۔

"تو تم نے ننھے بچے مر کر اس کے دل میں نرمی اور گداز پیدا کر دیا۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔"

وہ کھڑی ہو گئی اور ایک بار پھر وہ سوچ رہی تھی۔ بنجر زمینوں میں بھی پھول اگائے جا سکتے ہیں۔ بس تھوڑی سی محنت، لگن اور خلوص اور فرہاج حیدر! مجھ میں ان تینوں چیزوں کی کمی نہیں ہے اور مجھے یقین ہے، کہ ایک روز تمہارے اندر سے بھی چشمے پھوٹ پڑیں گے اور تمہارا پور پور محبتوں کے آب زم زم میں بھیگ جائے گا۔ تب ہی فرحی اسے ڈھونڈتی ہوئی لان میں آ گئی اور وہ بے حد مطمئن سی اس کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔

* * *

جب روتے روتے اس کی آنکھیں سوج گئیں اور چیختے چیختے گلا بیٹھ گیا اور نانو نے اس پر کوئی توجہ نہ دی تو وہ چور نظروں سے نانو کو دیکھتے ہوئے باہر نکل آیا۔ نانو نے اسے باہر جاتے دیکھا تو ان کے دل پر گھونسا سا لگا۔ ان کا تھپڑ کھا کر وہ اتنے زور سے چیخ چیخ کر رونے لگا تھا کہ وہ اور بھی بیزار ہو گئی تھیں۔ وہ صبح سے ہی اپنے گھر جانے کی ضد کر رہا تھا۔ ناشتا کرتے ہوئے اس نے دودھ کی پیالی الٹ دی تھی اور سلائس اٹھا کر پھینک دیے تھے۔ تب انہوں نے بڑے آرام سے اسے سمجھایا تھا کہ بچے ضد نہیں کرتے اور یہ کہ اس کے پاپا گھر پر نہیں ہیں۔ مگر وہ ایک ہی رٹ لگائے گیا تو نصرت جہاں نے کسی قدر بیزاری سے اسے دیکھا تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"آخر آپ اسے اس کے باپ کے گھر چھوڑ کیوں نہیں آتیں۔ عاتکہ مرگئی ہے تو ا[...]
کی سوکن تو ہے ناں، وہ سنبھال لے گی اسے۔"

"تمہیں تو اس بچے سے خدا واسطے کا بیر ہے دلہن! تم تو دل سے چاہتی ہو، وہ یہاں [...]
رہے۔" وہ روہانسی ہوگئیں۔

نصرت جہاں بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئیں اور وہ جوان کے ڈر سے سہم کر ذرا سی دیر [...]
لئے چپ ہوگیا تھا۔ پھر حلق پھاڑ پھاڑ کر رونے لگا تو نانو نے اٹھ کر اسے ایک تھپڑ جڑ دیا۔ نا[...]
کا تھپڑ کھاتے ہی اس کی آواز اور اونچی ہوگئی تھی اور اب جب کہ وہ باہر نکل گیا تھا۔ نانو [...]
دل کو کوئی مسلنے لگا۔ "ہائے عاتو تو اس کی آنکھوں میں ایک آنسو بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔"

اور پھر وہ عاتکہ کو یاد کر کے ہولے ہولے رونے لگیں اور اس نے اس امید میں دو تین
بار پیچھے مڑ کر دیکھا کہ شاید نانو اسے منانے، چپ کرانے آرہی ہوں۔ مگر نانو تو اپنے ہی غم
میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ وہ مایوس ہو کر باہر لان میں آگیا۔ ممی تو اگر کسی بات پر اسے ڈانٹتی
تھیں۔ تو پھر کتنا پیار بھی کرتی تھیں، مگر نانو' وہ گھٹنوں پر سر رکھ کر ہولے ہولے سسکنے لگا اور گھٹی
گھٹی آواز میں ممی کو پکارنے لگا۔

صفدر مرزا باہر نکلے تو اسے لان میں بیٹھے روتے دیکھ کر پریشان ہوگئے۔

"ارے ارے کیا ہوا بیٹا؟" انہوں نے سوچا اور پیار سے اسے اٹھالیا۔

"یہ گود میں ہی اٹھانے کی عمر ہے اس کی۔"

نصرت جہاں نے قریب سے گزرتے ہوئے تیر چلایا۔ لیکن وہ انہیں نظر انداز کرتے
ہوئے اپنے کمرے میں آگئے اور اسے بیڈ پر بٹھاتے ہوئے اس کے آنسو پونچھے۔

"ہاں تو اب بتاؤ بیٹا! کیا ہوا ہے، نصرت آنٹی نے کچھ کہا ہے کیا؟"

"نہیں!" اس نے سر ہلا دیا۔

"پھر ہمارے بیٹے کو کس نے رلایا ہے' ہمیں بتاؤ۔ ہم اسے خوب ماریں گے۔"

"نانو گندی ہیں۔ مجھے نانو نے مارا ہے۔ میں اب ان کے پاس نہیں رہوں گا۔"

اس نے بند مٹھیوں سے اپنی آنکھیں رگڑیں۔

"ارے نانو نے مارا ہے آپ کو۔" صفدر مرزا کو حیرت ہوئی۔

"ضرور آپ نے کوئی شرارت کی ہوگی۔"

"کوئی بھی نہیں' میں نے تو صرف گھر جانے کے لئے کہا تھا۔ ممی!"

اس کی آواز بھرا گئی۔

"میں گھر جاؤں گا، اپنے پپا کے پاس' میں یہاں نہیں رہوں گا۔"

"اچھا اچھا بیٹا! لے جائیں گے، آپ کو گھر۔"

انہوں نے جھک کر اس کے رخسار پر بوسہ دیا۔ "لیکن پہلے آپ رونا بند کریں' اچھے
بچے بھی کبھی روتے ہیں۔"

"آپ نے کل بھی کہا تھا کہ لے جائیں گے، لیکن آپ لے کر نہیں گئے۔"

"لے جائیں گے بیٹا! پہلے آپ کی ممی آجائیں پھر!"

"ممی تو اب نہیں آئیں گی۔ وہ مرگئی ہیں اور جو مرجاتے ہیں' وہ پھر واپس تو نہیں آتے
نا۔"

"بیٹا!"

انہوں نے بے اختیار اسے دونوں بازوؤں میں بھر لیا اور اس کے رخساروں' اس کی
پیشانی' اس کے بالوں کو بے تحاشا چومنے لگے۔ بہت سے آنسوؤں نے ان کے حلق کو نمکین کر
دیا' لیکن انہوں نے ان آنسوؤں کو آنکھوں تک نہ آنے دیا اور دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ
لے کر دھیان سے دیکھا۔ وہ صبر کا کوہ گراں لگ رہا تھا۔

آنکھوں کے ساتھ اس کے چہرے سے کچھ ایسا دکھ' ایسا کرب جھلک رہا تھا کہ ان کا
دل کٹنے لگا ایک بار پھر انہوں نے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا اور اپنے آنسو پیتے ہوئے پوچھا۔

"یہ آپ کو کس نے بتایا بیٹا؟"

"نصرت آنٹی کہہ رہی تھیں۔ کیا انہوں نے جھوٹ کہا تھا؟"

نچلا ہونٹ دانتوں تلے دابے تھوڑی دیر وہ غور سے اسے دیکھتے رہے۔ اس کی بڑی
بڑی کشادہ آنکھیں رونے سے' ورم ہو رہی تھیں۔ گالوں پر اب بھی آنسوؤں کے نشان تھے۔
وہ تقریباً سات سال کا تھا۔ کلاس ٹو میں پڑھتا تھا، اور بے حد ذہین تھا۔ ہمیشہ فرسٹ آتا، وہ
ان کو آخر کب تک جھوٹ بول بول کر بہلائے رکھیں گے۔ اب جب کہ اس نے حقیقت کی
[...]گلی کو قبول کرلیا ہے تو۔

"ماموں! نصرت آنٹی نے جھوٹ کہا تھا نا!"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

''نہیں!'' انہوں نے ایک گہری سانس لی۔

''آپ کی ممی اللہ تعالیٰ کے پاس چلی گئی ہیں۔ بہت دور اور جو اللہ کے پاس چلے جاتے ہیں، ناں وہ واپس نہیں آتے۔''

لحہ بھر کو اس کے چہرے کا رنگ سفید پڑ گیا اور اس نے اپنا سر صفدر مرزا کے کندھے پر رکھ دیا۔ اس کی آواز نہیں نکلی، مگر آنسو اس کے رخساروں پر پھیل گئے، جیسے اسے امید تھی کہ ماموں اس کی بات جھٹلا دیں گے اور کہیں گے۔ تمہاری آنٹی نے جھوٹ بولا تھا۔ تمہاری ممی تو زندہ ہیں۔ تھوڑی دیر وہ یونہی ان کے کندھے پر ٹھوڑی ٹیکے بے آواز روتا رہا اور صفدر مرزا اسے ہولے ہولے تھپکتے رہے، پھر اس نے اپنے آپ کو ان کے بازو کے حلقے سے آزاد کیا اور کھڑے ہو کر ہاتھوں کی پشت سے اپنے آنسو صاف کیے۔ نیکر کو کھینچ کر اوپر کیا اور شرٹ کا ایک کونا جو باہر نکلا ہوا تھا' اسے نیکر کے اندر کیا اور صفدر مرزا کی طرف دیکھا۔

''چلیں ماموں جان! مجھے پاپا کے پاس چھوڑ آئیں۔''

وہ اس وقت بڑا بہادر' بڑا مدبر اور معتبر لگ رہا تھا۔

''شام کو چلیں گے بیٹا!'' انہوں نے اسے ٹالنا چاہا۔

''نہیں ابھی! میں ابھی اپنے گھر جاؤں گا۔ میرے پاپا اکیلے ہیں۔ ممی بھی تو نہیں ہیں۔ میں ان کے کپڑے نکال کر انہیں دوں گا' ان کے جوتے اٹھا کر دوں گا۔ ان کی چیزیں سنبھال کر رکھوں گا۔ میں ان کے سارے کام کروں گا اور پھر میں انہیں رونے بھی نہیں دوں گا۔ وہ ممی کو یاد کر کے روتے ہوں گے نا!''

آنسو ایک بار پھر صفدر مرزا کے حلق میں اکٹھے ہونے لگے اور بغیر منہ سے کچھ بولے وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آئے۔

جب وہ فرہاج ولا میں داخل ہوئے تو ان کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ یہ گھر ان کی بہن کا تھا' جہاں وہ ہزاروں بار آئے تھے۔ اس وقت بڑا اجنبی اور اوپرا اوپرا سا لگ رہا تھا۔ وہ ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے تھے۔ لیکن وہ ان کا ہاتھ چھڑا کر بے تحاشا اندر کی طرف بھاگا۔

''پاپا...... پاپا......!''

وہ رضوان حیدر کو آوازیں دے رہا تھا۔ اس کی آواز سن کر کریم بخش اندر سے نکلا۔

''ارے آپ مرزا صاحب! آیئے نا!''

''بابا!'' وہ پلٹ آیا۔

''بیٹا جی!'' کریم بخش نے ایک دم ہی اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

''پاپا کہاں ہیں؟''

''بیٹا! وہ گھر پر نہیں ہیں۔''

کریم بخش نے اس کے رخسار کو پیار سے تھپتھپایا۔

''وہ کب تک لوٹیں گے؟'' صفدر مرزا نے پوچھا۔

''جی وہ اور بیگم صاحبہ تو لاہور گئے ہیں۔''

''ممی' ممی لاہور گئی ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے پاس نہیں گئی ہیں۔ وہ مری نہیں ہیں' ماموں جان' ماموں جان!''

وہ کریم بخش کو چھوڑ کر صفدر مرزا سے لپٹ گیا۔

صفدر مرزا نے افسردگی سے اسے دیکھا۔ ایک ہی لمحے میں اس کا مرجھایا ہوا چہرہ چمکنے لگا تھا۔

''ممی نے فون کیوں نہیں کیا؟ اپنے پاس کیوں نہیں بلایا۔ بابا کیا وہ میرے لیے بہن لینے لاہور چلی گئی ہیں؟ اور پتا ہے بابا! آنٹی کہتی ہیں' تمہاری ممی مر گئی' ہیں وہ اب کبھی نہیں آئیں گی۔ جھوٹ بولتی تھیں نا وہ؟ ہیں نا۔''

اس نے تصدیق طلب نظروں سے صفدر مرزا کی طرف دیکھا۔

''نہیں میری جان! انہوں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔''

صفدر مرزا نے اپنے بازو اس کے گرد حمائل کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کی ممی کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس بلا لیا ہے۔''

''مگر بابا تو کہہ رہے تھے۔ وہ لاہور گئی ہیں۔''

''بیٹا!'' کریم بخش نے کندھے پر لٹکے ہوئے رومال سے اپنی آنکھیں پونچھیں۔

''آپ کے پاپا آپ کے لئے نئی ممی لائے ہیں۔''

''نئی ممی!'' اس کا چمکتا ہوا چہرہ ایک دم بجھ گیا اور آنکھوں کی سطح گیلی ہو گئی۔

''رضوان بھائی کب تک آئیں گے؟''

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"معلوم نہیں جی! اچانک ہی جانا پڑ گیا تھا۔ لاہور سے فون آیا تھا کہ بیگم صاحبہ کے والد سخت بیمار ہیں۔"

"اچھا بابا! پھر ہم چلتے ہیں۔"

وہ جانے کے لئے پلٹے تو صفدر مرزا کی انگلی پکڑتے ہوئے، اس نے کریم بخش کی طرف دیکھا۔

"نئی ممی کیسی ہیں بابا؟"

"اچھی ہیں بیٹا جی!"

"کیا بالکل میری اپنی ممی جیسی ہیں۔"

"جی!"

کریم بخش نے ٹپٹا کر صفدر مرزا کی طرف دیکھا۔

"اچھی ہیں بیٹا جی!"

صفدر مرزا نے اسے دیکھا۔ وہ اس سے بے حد سنجیدہ بے حد متین اور مدبر لگ رہا تھا۔

"خدا کرے وہ اس کے لئے عائشہ کا نعم البدل ہی ثابت ہو وہ اسے اتنا پیار دے کہ اسے محرومی کا احساس نہ ہو۔" انہوں نے سچے دل سے دعا کی اور اس کا ہاتھ تھامے گیٹ سے باہر نکل آئے۔

● ● ●

"اور میرا دل چاہتا ہے۔ میں اس ساری کائنات کو توڑ پھوڑ کر رکھ دوں، ماسوا اس ایک لڑکی کے جو۔"

اس نے چونک کر اپنی تحریر کو دیکھا اور پھر ہاتھ میں پکڑے ہوئے قلم کو۔

"یہ میں نے کیا لکھ دیا ہے، وہ ایک لڑکی؟" اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

"آخر کیا لگتی ہے وہ میری؟ جو میں اس کی سلامتی کے لئے سوچوں۔"

وہ پھر جھک کر اپنی نیلی جلد والی ڈائری پر لکھنے لگا۔

"ہاں میرا دل چاہتا ہے۔ میں اس پوری کائنات کو توڑ پھوڑ کر رکھ دوں، اس کے ٹوٹنے کا تماشا دیکھوں اور پھر اس کے ملبے پر کھڑے ہو کر نیرو کی طرح زور زور سے قہقہے لگاؤں کہ میں نے اس کائنات کو توڑ دیا ہے۔ اس دنیا کو ملیامیٹ کر دیا ہے۔ جس نے مجھ سے میری

ماں چھین لی، باپ کی شفقت لوٹ لی اور پھر میری بے بسی پر قہقہے لگائے ہاں۔" اس نے بایاں مکا زور سے میز پر مارا اور اس کی آنکھیں خوں رنگ ہو گئیں، ماتھے کی رگیں ابھر آئیں۔ دونوں مٹھیاں زور سے بھینچتے ہوئے، اس نے دانت کچکچائے۔

"ہاں! میں اس پوری کائنات کو توڑ پھوڑ کر رکھ دوں گا۔ ریزہ ریزہ کر دوں گا۔

مگر وہ ایک لڑکی۔

جس کی آنکھوں میں بڑے مہربان جذبے ہوتے ہیں اور چہرے پر بڑی ملائم مسکراہٹ اور جو اس دنیا کی باسی نہیں لگتی۔" اس کے دل کے کسی ایک کونے میں اس لڑکی کے لئے جو اس کی سوتیلی ماں کے لاڈلے بھائی کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ذرا سی نرمی در آئی اور اس کے دل کا وہ ایک کونا اس کے لئے گداز ہو گیا۔ ہاں وہ ایک لڑکی جو ایک چڑیا کے کمزور اور ننھے بچے کی موت پر رو سکتی ہے، اسے اس ظالم دنیا میں نیکی کی علامت بن کر ضرور زندہ رہنا چاہیے۔"

اس کی بھنچی ہوئی مٹھیاں کھل گئیں اور لمحہ بھر کے لئے ماریہ احسن کا مسکراتا چہرہ اس کے تصور میں جگمگا گیا اور بلاشبہ یہ لڑکی اتنی ہی خوبصورت ہے، جتنا کہ اس کا دل خوبصورت ہے۔ اس نے اعتراف کیا اور ایک دلکش مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ٹھہر گئی۔

"ہاں مجھے اعتراف ہے، ماریہ احسن کہ تم بہت خوبصورت ہو بے حد۔"

اس نے لکھنا چاہا، لیکن تب ہی نصرت جہاں کی تیز چیختی ہوئی آواز اس کے کانوں میں زہر گھولنے لگی اور ان کا خوبصورت سراپا اس کے تصور میں در آیا۔

لانبی غلافی آنکھیں جو ہر لمحے نفرت کے شعلے برساتی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے دلکش ہونٹ جو زہر میں بجھے تیر چھوڑتے تھے، دودھیا رنگت، سیاہ دراز بال اور سفید مومی انگلیوں والے ہاتھ جو اس کے پھول ایسے رخساروں پر اپنا نشان چھوڑ جاتے تھے۔

غیر ارادی طور پر اس نے اپنے رخسار کو چھوا اور پھر فوراً ہاتھ اٹھا لیا، جیسے ان انگلیوں کا جلتا ہوا لمس اب بھی اس کے رخساروں پر موجود ہو۔

اور پھر عطیہ بیگم بھی نصرت جہاں کے پہلو بہ پہلو آ کھڑی ہوئیں۔ ان سے کہیں زیادہ خوبصورت اور کم عمر، خوبصورت سیاہ آنکھوں پر پلکوں کے گھنے جنگل، لانبی صراحی دار گردن میں ہیرے کا ننھا سا دمکتا لاکٹ، چمکتی پیشانی، دمکتا رنگ، گلابی ہونٹ اور پھر اتنی نرمی اور

آہستگی سے بولتیں جیسے دور کہیں مدھم سروں میں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ مگر وہ ہمیشہ ہاتھوں میں نظر نہ آنے والے بھالے چھپائے رکھتی تھیں۔ ایسے بھالے جن کی نوکیلی زہر میں ڈبویا گیا ہو۔ وہ نہ تو بولتی تھیں، نہ چیختی چلاتی تھیں۔ مگر اس کا جسم چھلنی ہوتا رہا اس چھلنی جسم میں زہر پھیلتا رہتا، ہر روز پہلے سے کہیں زیادہ۔

اور ان دو خوبصورت عورتوں نے مل کر اس کو سارے کا سارا زہر آلود کر دیا تھا۔

''اوہ' نان سینس میں بھی کس قدر احمق ہوں۔''

اس نے اپنے ہی لکھے ہوئے لفظوں پر قلم پھیر دیا ''سچ تو یہ ہے کہ مجھے دنیا کی، خوبصورتیوں سے نفرت ہے اور تم سے بھی ماریہ احسن۔'' اس نے پھولدان میں سجے پھولوں کو نکال کر پتی پتی کر دیا اور اپنی نیلی جلد والی ڈائری کو ہمیشہ کی طرح اچھال کر پھینکا بیڈ کے عین وسط میں جا گری۔

اور وہ جو اس کے پتھر دل کے ایک کونے میں سوئی کے ناکے سے بھی باریک سوراخ ہو گیا تھا۔ اسے ٹہل ٹہل کر بند کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ شاید اسے ڈر تھا کہ یہ سوئی ناکے سے بھی باریک سوراخ کہیں بڑا نہ ہو جائے اور وہ ایک لڑکی جو اس کے دل کے کونے میں سیندھ لگانے کی سعی کر رہی ہے، کہیں اس کے دل کی پوری عمارت کو ہی نہ ڈھا دے اور وہ گداز جو آج اس کے دل کے ایک کونے میں پیدا ہوا ہے۔ کہیں پورے دل میں پھیل جائے اور اس کا دل پگھل کر پانی ہو کر اس کے قدموں میں جا گرے اور اگر ایسا ہو گیا تو پھر یہ ساری نفرت جس نے میرے اندر الاؤ جلا رکھے ہیں۔ یہ آگ کیسے بجھے گی۔ یہ نفرت کیسے کم ہو گی، نفرت کا یہ زہر اگر باہر نہ نکل سکا، تو مجھے ہلاک کر دے گا۔ یہ الاؤ مجھے جلا کر راکھ کر دے گا۔

نہیں ماریہ احسن، نہیں! میں تمہیں اس کی اجازت ہرگز اجازت نہ دوں گا، کہ تم مسکراہٹ کے تیشے سے مجھ پر ضرب لگاؤ اور مجھے کمزور کر دو' اپنی مہربانیوں کے جال مجھ پر پھینکو اور مجھے گرفتار کر لو۔''

اس نے گلدان کے بچے ہوئے پھولوں کو بے دردی سے باہر کھینچا اور مسلتے ہوئے زور سے دھاڑا۔

''بابا...... بابا......''

بوڑھا کریم بخش ہانپتا کانپتا دروازے پر آ کھڑا ہوا۔

''جی چھوٹے صاحب!''

''یہ میرے کمرے میں پھول کس نے لگائے ہیں؟''

''جی...... جی......!'' وہ اس کے تیور دیکھ کر ڈر گیا۔

''ماریہ بی بی نے!''

''کیوں......؟'' وہ اسی طرح دھاڑا۔

''پتا نہیں جی!'' کریم بخش نے نگاہیں جھکا لیں۔

اس نے گلدان اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ ایک چھناکا ہوا اور کرچیاں فرش پر پھیل گئیں۔

''آئندہ اگر یہاں پھول نظر آئے تو میں۔'' بات ادھوری چھوڑ کر اس نے کریم بخش کو گھورا۔

''جی میں نے تو بہت منع کیا تھا، مگر ماریہ بی بی کہتی تھیں۔ پھولوں سے تازگی اور فرحت کا احساس ہوتا ہے۔'' اور وہ سرخ انگارہ آنکھیں لیے دندناتا ہوا ماریہ کے کمرے میں جا پہنچا۔

ماریہ اور فرحی کیسٹس زمین پر بکھرائے اس میں سے اچھی اچھی کیسٹس الگ کر رہی تھیں۔ مدھم آواز میں ٹیپ بج رہا تھا۔

سب کے رہتے لگتا ہے، جیسے کوئی نہیں ہے میرا۔

لمحہ بھر کو وہ دروازے پر ہی ٹھٹک کر رک گیا۔ جیسے گیت کے بولوں نے اس کے پاؤں میں زنجیر ڈال دی ہو' دل میں ایک درد سا اتر آیا اور آنکھوں میں تھکن اور شکستگی کا دھواں سا بھر گیا۔ تب ہی ماریہ نے مڑ کر اسے دیکھا اور اس کے چہرے پر روشنی سی پھیل گئی۔ وہ یکدم کھڑی ہو گئی۔

''آیئے آیئے فرہاج بھائی! آپ کو اچھے اچھے گیت سنواتے ہیں۔''

وہ بغیر کچھ کہے کسی مقناطیسی کشش سے کھنچتا ہوا آگے بڑھ آیا اور نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

مسکراتی آنکھوں اور مسکراتے ہونٹوں کے ساتھ وہ کتنی دلکش' کتنی خوبصورت لگ رہی تھی۔

''آپ کچھ اپ سیٹ لگ رہے ہیں۔ کیا بات ہے؟''

ماریہ نے اس کی سرخ انگارہ آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا تو اس نے یکدم گڑبڑا

کر آنکھیں جھکا لیں۔ لمحہ بھر کو اسے لگا، جیسے وہ سوئی کے ناکے کے برابر سوراخ بڑا ہو ر لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے بے حد تلخی سے پوچھا۔

"کیا آپ بتا سکتی ہیں ماریہ احسن! کہ آپ مجھ پر اتنی مہربان کیوں ہیں؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔"

"مطلب!" اس نے دانت پیسے۔ "آپ نے میرے کمرے میں پھول سجائے۔"

"آپ کے کمرے میں، نہیں صرف آپ کے کمرے میں نہیں، سب کمروں میں لئے کہ پھول تازگی اور فرحت کا احساس دلاتے ہیں اور۔" اس نے معنی خیز نظروں سے ا دیکھا۔

"یہ محبت، خوشبو اور خلوص کی علامت ہیں۔ پھول دوستی کا اظہار ہوتے ہیں۔"

"لیکن مجھے کسی احساس کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی میں محبت، خوشبو اور ودا خواہش مند ہوں۔ کیا آپ کو کسی نے نہیں بتایا کہ مجھے نفرت ہے، ان سب سے۔ سمجھ آپ! آئندہ یہ زحمت مت کیجئے گا۔"

"سوری مجھے علم نہیں تھا کہ آپ کو پھولوں سے نفرت ہے۔"

وہ بڑے اعتماد سے اس کے سامنے کھڑی تھی، جب کہ اس کا اتنا خراب موڈ دیکھ کر کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور وہ سہمی سہمی سی انہیں دیکھ رہی تھی۔

"آپ کیا سمجھتی ہیں ماریہ احسن! کہ آپ اپنے حسن اور اپنی مہربانیوں سے مجھے گھا کر لیں گی، جب کہ میں نے پہلے ہی دن آپ کو بتا دیا تھا، کہ I Hate You۔ (مجھے آ سے نفرت ہے)"

اس کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے بدلا۔ توہین کے...... احساس نے اس کی آنکھوں م چنگاریاں سی بھر دیں۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اسے کھری کھری سنا دے اور اچھی طرح جتا دے کہ وہ کوئی گئی گزری لڑکی نہیں ہے اور نہ ہی آج کل کی فلم زدہ لڑکیوں کی طرح وہ اپنا دل ہتھ پر لیے پھرتی ہے۔ مگر پھر وہ فوراً ہی سنبھل گئی اور بڑے اطمینان سے بولی۔

"نہیں میرا تو ایسا کوئی خیال نہیں ہے۔" اور بیٹھ کر یونہی لاپروائی سے کیسٹ دیکھنے جیسے اس کی بات نے اس پر ذرا بھی اثر نہ کیا ہو۔ وہ تلملا گیا۔

"مجھے آپ سے، آپ کے پھولوں سے اور آپ کی مہربانیوں سے نفرت ہے۔ سمجھیں آپ!"

"جی!" اس نے اسی طمانیت سے جواب دیا۔ "میں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں کہ آپ کو پھولوں سے، ان کی خوشبو، ان کی رنگت اور خوبصورتی سے نفرت ہے۔ اس لیے آپ کے کمرے میں پھول نہ سجائے جائیں اور یہ کہ آپ کو مجھ سے نفرت ہے، بس یہی بات آپ مجھے سمجھانا چاہ رہے تھے نا!"

اس نے ذرا کی ذرا رُخ بدل کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے اب بھی خونخوار نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ہائے داوے جب آپ کو انسانوں سے اور دنیا کی خوبصورتیوں سے اتنی نفرت ہے تو آپ کسی ویرانے میں کیوں نہیں جا کر بس جاتے، یہاں انسانوں کے بیچ کیوں رہتے ہیں۔"

"شٹ اپ!" وہ چلایا۔

"نفرت کرنا بہادری نہیں ہے، بزدلی ہے۔ محبت کرنا بہادری ہے، ہر شے سے محبت کرنا پھولوں سے، تتلیوں سے، رنگوں سے اور انسانوں سے اور چڑیا کے کسی ننھے منے بچے سے جو اپنے گھونسلے سے گر پڑا ہو۔"

اس نے پھر ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھائیں اور فرہاج حیدر کو یوں لگا، جیسے وہ ایک ہی وار سے سوئی کے ناکے کے برابر سوراخ کو اتنا کشادہ کر دے گی کہ وہ گھٹنوں کے بل اس کے سامنے گر جائے گا، وہ یکدم مڑا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

کریم بخش برآمدے میں گلدان کی کرچیاں اکٹھی کر رہا تھا۔

"بابا! مجھے پانی پلاؤ۔"

اس نے بکھرتی آواز میں کہا اور بیڈ پر آ کر یوں دھم سے بیٹھ گیا، جیسے میلوں پیدل چل کر آیا ہو۔

"نفرت کرنا بہادری نہیں، محبت کرنا بہادری ہے۔" ماریہ نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"لیکن میرے اندر اتنا دھواں بھرا ہوا ہے کہ مجھے اس میں محبت کی کوئی شکل دکھائی نہیں دیتی، بس آنکھوں کے سامنے دھند ہی دھند ہے۔ گہری دبیز دھند۔"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

اس نے پلنگ پر پڑی ڈائری اٹھاتے ہوئے لکھا۔

"اور میرے اندر اتنا زہر بھرا ہے کہ اس میں کسی بھی مہربان جذبے کی کونپل پھوٹتے مرجھا جاتی ہے اور صرف خاردار جھاڑیاں اور کسیلے تھور رہ جاتے ہیں۔"

لکھتے لکھتے سر اٹھا کر اس نے کریم بخش کی طرف دیکھا۔ جو پانی کا گلاس اٹھائے بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اچھا بابا! اب جاؤ۔" گلاس ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے کہا۔

کریم بخش مڑ مڑ کر اسے دیکھتا ہوا باہر نکل گیا تو اس نے ایک ہی سانس میں گلاس خا کر دیا۔ مگر پیاس پھر بھی نہیں بجھی تھی۔ اندر آگ سی لگی تھی۔ ایسی آگ جو آنسوؤں سے بجھ سکتی ہے۔ مگر آنسو، آنسو کہاں تھے، اس کے پاس۔

برسوں پہلے جب وہ نانو کا گھر چھوڑ رہا تھا تو آخری بار رویا تھا اس رات۔ شاید اس آنکھوں کا سارا پانی ختم ہو گیا تھا کہ پھر وہ کبھی نہ رو سکا۔ حالانکہ اس رات کے بعد کئی بار اس رونے کو جی چاہا تھا۔ جب اس نے عطیہ بیگم کو ممی کے بیڈ روم میں ان کی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بال بناتے دیکھا تھا اور انہوں نے ممی کی نیوی بلو مقیش کے کام والی وہ ساڑھی باند رکھی تھی، جو ہاسپٹل جانے سے کچھ دن پہلے انہوں نے اس کی سالگرہ پر باندھی تھی...... او جب اس نے ان کے گلے میں ہیرے کا وہ ننھا سا لاکٹ دیکھا تھا، جو پان کی شکل کا تھا او جس پر ننھے ننھے ہیرے جڑے ہوئے تھے اور جو ذرا سا دباؤ ڈالنے پر ایک کھٹکے سے کھل جا تا اور جس کے اندر ممی اور پاپا کی شادی کی تصویر تھی اور جب اس نے ان کے بیڈ روم کو ممی کی تصویروں سے خالی دیکھا، وہاں صرف ایک تصویر تھی، عطیہ بیگم کی۔

اور پھر تب بھی اسے بہت رونا آیا تھا۔ جب عطیہ بیگم نے اس کا بیڈ روم فرح کو دے دیا تھا اور اسے دوسرے بیڈ روم میں منتقل ہونا پڑا تھا، جو کوریڈور کے آخری سرے پر تھا۔ ممی اور پاپا کے بیڈ روم سے دور لیکن وہ رو نہیں سکا تھا۔ بس اس کی آنکھیں جلتی رہی تھیں اور کہیں اندر سلگتی آگ دہکنے لگی تھی۔

آج مدت بعد پھر وہ رونا چاہ رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں......؟ حالانکہ کچھ نہیں ہوا تھا، بس ایک نازک سی خوبصورت لڑکی نے اس کے دل کے ایک کونے میں سوئی کے ناکے کے برابر سوراخ کر دیا تھا اور اب وہ بڑی تندہی سے اسے بڑا کرنے کی سعی کر رہی تھی۔

اس نے اپنی آنکھوں کو رگڑا۔ لیکن وہ بے آب و گیاہ صحراؤں کی طرح خشک تھیں اور ان میں گرم ریت اڑ رہی تھی۔

وہ برآمدے کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور خالی برآمدے کو تکنے لگا نہ جانے کتنی دیر تک وہ یونہی بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ باہر اندھیرا پھیل گیا۔ کسی نے آ کر برآمدے کی لائٹ جلا دی۔ مگر وہ یونہی بیٹھا خلا میں گھورتا رہا۔ پھر اچانک اس کی نظر فرح اور ماریہ پر پڑی، جو عین اس کے کمرے کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ ماریہ نے کچھ کہا تھا، لیکن فرحی نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا۔

"نہیں، رما پلیز نہیں! انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔" وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔ تب ہی ماریہ نے سسکی لی اور بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا رما؟"

فرحی کی گھبرائی سی آواز اس کے کانوں میں پڑی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ شاید جب فرحی نے اسے کھینچا تھا تو اس کا پاؤں چپل سے نکل گیا تھا۔

"شاید کانچ کا کوئی ٹکڑا چبھ گیا ہے۔" اس کے ذہن میں گلدان ٹوٹنے کا چھناکا ہوا' شاید کریم بخش نے کرچیاں اچھی طرح نہیں سمیٹی تھیں۔

وہ باہر نکل آیا۔ ماریہ کا پاؤں خون سے رنگین ہو رہا تھا اور فرحی گھبرائی گھبرائی سی اسے دیکھ رہی تھی۔ بالکل غیر ارادی طور پر اس نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے، اس کے پاؤں سے شیشے کا ننھا سا ٹکڑا باہر کھینچ لیا اور ہاتھ سے دبا کر خون کے بہاؤ کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے فرحی کی طرف دیکھا۔

"میرے کمرے سے اسپرٹ اور پٹی لے آؤ۔ سامنے ہی شیلف کے نیچے فرسٹ ایڈ باکس پڑا ہوگا۔"

وہ حیران حیران سی کمرے کی طرف چل دی۔

"عجیب آدمی ہیں، خود ہی کرچیاں بکھیرتے ہیں اور پھر خود ہی۔"

فرہاج حیدر نے کھوئی کھوئی نظروں سے اسے دیکھا اور فرحی کے ہاتھ سے اسپرٹ اور پٹی لے لی' پٹی باندھ کر وہ بغیر کچھ کہے اٹھ کھڑا ہوا، تو وہ ہولے سے مسکرائی۔

"آپ جھوٹ کیوں بولتے ہیں؟"۔

اس نے بھنویں اچکا کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"آپ جھوٹ بولتے تھے کہ آپ مجھ سے نفرت کرتے ہیں' نہیں!" اس نے بے یقین سے کہا۔

"آپ نفرت نہیں کر سکتے۔"

اور پاؤں میں چپل ڈال کر کھڑی ہو گئی۔

"نہیں ماریہ احسن! میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ یہ سچ ہے کہ میں آپ سے نفرت کرتا ہوں۔"

"اچھا!" ماریہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تو پھر اس سب کا کیا جواز ہے، آپ کے پاس۔"

اس نے اپنے پاؤں کی طرف اشارہ کیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور ان میں شرارت ناچتی دیکھ کر سٹپٹا گیا۔

"یہ......؟"

"ہاں یہ۔" اس کی آنکھیں اب بھی شرارت سے ہنس رہی تھیں۔

"میں آپ کو بتا چکا ہوں مس ماریہ احسن! کہ مجھے آپ سے اور ان لوگوں سے نفرت ہے۔"

وہ زور سے چیخا، تو فرحی نے ہولے سے ماریہ کا بازو کھینچا۔

"چلو رما۔"

اس نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی' وہ تنا تنا سا کھڑا تھا، لیکن اس کی سیاہ گمبھیر آنکھوں میں نہ جانے کیسے سناٹے تھے، کہ وہ اندر ہی اندر کانپ گئی۔

"نفرت آدمی کو خود بھی جلا دیتی ہے۔ کیا آپ کو اپنے آپ سے بھی محبت نہیں ہے۔"

اس نے آہستگی سے پوچھا تو فرہاج نے گھبرا کر اپنے آپ پر نظر ڈالی۔

"جو لوگ دوسروں سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ خود سے بھی محبت نہیں کر سکتے' مجھ سے آپ کو نفرت سہی، مگر ان سارے لوگوں سے جو آپ کے اپنے ہیں' ان سے تو آپ کو نفرت نہیں ہونی چاہیے۔"

"اور آپ مجھے نصیحتیں کر رہی ہیں؟"

وہ ایک دم چڑ گیا۔

"میں محبت کروں ان لوگوں سے' یہ لوگ آپ کو کیا پتا مس ماریہ احسن! ان سب لوگوں نے ہی تو مل جل کر میرے اندر نفرت کا یہ زہر پھیلایا ہے۔"

"معاف کر دینے والا بڑا آدمی ہوتا ہے فرہاج حیدر!"

"معاف کر دوں!"

وہ زور سے چیخا۔ اس کے ماتھے کی رگیں تن گئیں اور آنکھیں لہو رنگ ہو گئیں۔

"آپ کون ہوتی ہیں میرے معاملات میں دخل دینے والی؟ کس نے بھیجا ہے آپ کو یہاں! مجھے مشورے دینے کے لئے۔ میں سب سمجھتا ہوں، مت اس غلط فہمی میں رہیں کہ آپ اپنے حسن کی اداؤں سے مجھے پھانس لیں گی۔"

"شٹ اپ!" وہ زور سے بولی۔

"آپ حد سے گزرتے جا رہے ہیں اور آج آپ نے دوسری بار میری توہین کی ہے۔ کیا سمجھتے ہیں، آپ مجھے؟ شکل دیکھی ہے، کبھی آپ نے اپنی۔"

"رما......رما......پلیز!"

فرحی نے پھر اس کا بازو پکڑ کر کھینچا۔

اور اسے یوں غصے میں بولتے دیکھ کر اسے انجانی سی خوشی ہوئی اور اس نے زور سے قہقہہ لگایا۔

وہی ہڈیوں تک میں سنسناہٹ پیدا کرتا ہوا قہقہہ اور پھر ایڑیوں کے بل گھوم گیا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے مڑ کر ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ وہیں کچھ پریشان سی کھڑی ادھر ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ پھر ہنسا مخصوص وحشیانہ ہنسی اور زور سے دروازہ بند کر دیا اور آرام سے بیڈ پر لیٹ کر "THE CAPUTURED" پڑھنے لگا، جیسے اس کے اندر دہکتی آگ ٹھنڈی پڑ گئی ہو۔

● ● ●

وہ جب سے "فرہاج ولا" سے واپس آیا تھا۔ اس نے ایک دم چپ سادھ لی تھی۔ جیسے اپنے آپ باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ کٹ گیا ہو اور وہ اپنے اندر کی دنیا میں کھو گیا ہو' اپنے ارد گرد سے بے خبر چپ بیٹھا۔ وہ اپنے ہی اندر کچھ کھوجتا رہتا۔ نانو...... کہتیں ناشتا کر لو' وہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ناشتا کر لیتا۔ وہ کہتیں کپڑے تبدیل کر لو وہ کپڑے تبدیل کر لیتا۔ وہ کہتیں ہوم ورک کر
بیگ کھول کر بیٹھ جاتا' نہ ضد' نہ جھگڑا' نہ شکوہ' نہ شکایت' نانو کو اس کی ذات میں ہونے والی
بڑی تبدیلی کا احساس تک نہ ہوا، وہ اپنے ہی دُکھ میں ڈوبی رہتیں، بیٹھے بیٹھے ٹھنڈی آ
بھرتیں۔

ان کے ساتھ ہوا بھی تو کچھ ایسا تھا۔ صرف چند ماہ کے وقفے سے دو جوان ...... بیٹیو
کی موت کا دُکھ جھیلنا پڑا تھا' آصفہ کی شادی تیار تھی۔ جہیز ٹانکا جا رہا تھا کہ مارکیٹ سے آ
ہوئے وہ ایک حادثے کا شکار ہو گئی اور عاتکہ۔

"ہائے میری عاتو!"

وہ سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے ہولے ہولے بین کرتیں۔ آنسو ان کے جھریوں
رخساروں پر پھیلتے رہتے اور ہولے ہولے بین کی آواز اونچی ہو جاتی۔ صفدر مرزا بے بسی
انہیں دیکھتے۔

"اماں پلیز! حوصلہ کریں۔ آپ کے یوں رونے سے آصفہ اور عاتکہ لوٹ تو نہ
آئیں گی۔"

"ہائے کیسی بدنصیب ماں ہوں' میں صفدر' دو بیٹیوں کو جنم دیا اور دونوں ہی بڑھاپے
جدائی کا زخم دے گئیں۔"

نصرت جہاں ماتھے پر بل ڈالے ناک چڑھائے بیزاری سے انہیں دیکھتیں اور ہو
ہولے بڑبڑاتیں۔

"یہ ہر وقت کی نحوست' ہر وقت کا رونا دھونا خود تو مر گئیں' لیکن اپنے پیچھے عذاب چھ
گئیں۔"

مگر نانو کو ان کی بڑبڑاہٹ کی پروا ہی کب تھی۔ وہ اسی رفتار سے روئے چلی جاتیں ا
وہ ہاتھوں کی کٹوریوں پر چہرہ ٹکائے چپ چاپ نونو کو دیکھا رہتا۔

نانو سمجھتی تھیں وہ بچہ ہے اور ماں کی موت کے دُکھ سے ناآشنا ہے۔ مگر صفدر مرزا
اس دُکھ اور اس کرب کو محسوس کر لیا تھا' جو اس کے ننھے سے دل پر آ گرا تھا۔ کئی بار اس
پیشانی چوم کر اسے بانہوں میں بھر کر انہوں نے اسے دلاسا دیا تھا۔

"ہمارا بیٹا اپنے پاپا کے لئے اداس ہے، ناں! جیسے ہی آپ کے پاپا لاہور سے آ

گے۔ ہم اپنے بیٹے کو پاپا کے پاس لے چلیں گے۔"

"اچھا۔"

وہ آہستگی سے کہتا تو صفدر مرزا حیرانی سے اسے دیکھتے۔

"کیوں کیا ہمارے بیٹے کو اپنے پاپا یاد نہیں آتے، پھر پاپا کے ساتھ آپ کی نئی ممی بھی تو
آئیں گی، ناں جو اپنے بیٹے سے بہت پیار کریں گی۔"

"دماغ خراب ہو گیا ہے، تمہارا صفو! میں اپنے بچے کو کبھی بھی وہاں نہ بھیجوں گی۔
ارے وہ ڈائن تو میرے بچے کا کلیجہ ہی چبا ڈالے گی۔ اذیتیں دے دے کر مار ڈالے گی
اسے۔"

اور اس کی رنگت یک دم سفید پڑ جاتی اور اندر پورے وجود پر کپکپی سی طاری ہو جاتی۔

"اماں پلیز! بچے کے ذہن کو خراب نہ کریں۔" صفدر مرزا التجا کرتے۔ "اسے وہیں
رہنا ہے۔ اس کے دل میں نفرت نہ پیدا کریں۔"

"ادھر آؤ بیٹا!" وہ اسے قریب بلاتے "آپ کی نئی ممی بہت اچھی ہیں اور وہ ہمارے
بیٹے سے بہت پیار کریں گی۔"

اور اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ ماموں کی بات کا یقین کرے یا نانو کا...... اور اسے
خاموش دیکھ کر وہ پھر اماں کو سمجھاتے۔

"اماں! میں نہیں چاہتا کہ وہ ماں کے بعد باپ کی شفقت سے بھی محروم ہو جائے' آپ
اس کا دھیان رکھا کریں اماں!"

"باپ!" نانو نفرت سے ایک طرف تھوک دیتیں۔

"ایسے ہوتے ہیں باپ! لاپروا' بے حس' ارے میں ہوں، اس کی ماں تم ہو اس کے
باپ۔"

اور نصرت جہاں پیر پٹختی باہر نکل جاتیں۔

اور صفدر مرزا اسے بہلانے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔ مگر پتا نہیں اس کے دل میں کیسا
ڈر کیسا غم سا گیا تھا کہ ان کی ساری کوششیں رائیگاں چلی جاتیں۔ نہ وہ پہلے کی طرح سیر کر
کے خوش ہوتا' نہ ٹافیاں اور چیونگم لے کر' حتیٰ کہ اس روز پاپا کے فون کا سن کر بھی اس نے کسی
خوشی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ بڑی بے تابی سے بول رہے تھے۔

"ہیلو کیسے ہو میری جان!.....؟"

"ٹھیک ہوں۔"

"آئی ایم سوری بیٹا! مجھے اچانک لاہور آنا پڑا۔" انہوں نے معذرت کی۔

"شاید کچھ دن اور لگ جائیں گے، لیکن تم اداس نہ ہونا میرے چاند۔"

"جی اچھا!"

"اب بتاؤ! اپنے بیٹے کے لئے وہاں سے کیا لائیں؟"

"کچھ نہیں!" اس نے مختصراً کہا۔

صفدر مرزا غور سے قریب کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ نہ سوال نہ جواب نہ ہی متعلق کوئی استفسار نہ بغیر بتائے چلے جانے پر ناراضگی کا اظہار۔

صفدر مرزا کو اپنی طرف دیکھتے پا کر اس نے ریسیور انہیں پکڑا دیا اور خود باہر نکل گیا۔

صفدر مرزا نے اسے باہر جاتے ہوئے تشویش سے دیکھا۔

"وہ آپ کے لئے اداس ہے، رضوان بھائی اور......"

"ہاں ہاں کیا ہوا؟ اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا!" دوسری طرف رضوان حیدر بے چینی سے ہو گئے۔

"میرا خیال ہے، وہ کچھ اپ سیٹ ہے۔ آپ آئیں گے تو ٹھیک ہو جائے گا۔ یوں بڑا سمجھدار بچہ ہے، اس نے عاتکہ کی موت کو قبول کر لیا ہے۔"

"تو آپ نے اسے بتا دیا۔" انہوں نے گہری سانس لی۔

"یہ ضروری تھا، رضوان بھائی۔" صفدر مرزا نے انہیں سمجھایا اور پوچھا۔

"آپ کب تک آ رہے ہیں؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا، عطیہ کے والد سخت بیمار ہیں۔"

"جو بھی ہے، آپ جلد آنے کی کوشش کریں۔ مجھے ڈر ہے، کہیں وہ بیمار نہ پڑ جائے۔"

بات ختم کر کے صفدر مرزا اسے ڈھونڈتے ہوئے اس کے کمرے میں آ گئے، جہاں کھولے، کتابیں بکھرائے وہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔

رضوان حیدر نے چند دنوں بعد آنے کا کہا تھا، مگر نہ آ سکے۔ انہوں نے فون کر کے دیا تھا کہ عطیہ بیگم کے والد کا انتقال ہو گیا ہے، اس لیے انہیں مزید کچھ دن رکنا پڑے گا۔

صفدر مرزا ان کے مزید رکنے کا سن کر پریشان ہو گئے تھے۔ کیونکہ اس کی خاموشی نے انہیں فکر مند کر دیا تھا۔ وہ چاہتے تھے عام بچوں کی طرح وہ ہنسے کھیلے کودے، شور مچائے ضدیں کرے پہلے کی طرح گھر جانے کی ضد کرے، مگر وہ تو جیسے ہر چیز سے بیزار ہو گیا تھا۔ ٹی وی کے وہ سارے پروگرام جو پہلے وہ بڑے شوق سے دیکھتا تھا، اب اس نے چھوڑ دیئے تھے اور سرشام بستر پر پڑ جاتا تھا۔

صفدر مرزا اسے ڈاکٹر کے پاس بھی لے گئے تھے، کیونکہ ان کے خیال میں اس کی عمر کے بچے ماں یا باپ کی موت کو اتنی شدت سے محسوس نہیں کرتے، جیسے اس نے کیا تھا۔ جب خیال آیا، افسردہ ہوئے پھر تھوڑی دیر بعد بھول کر کھیل کود میں لگ گئے، لیکن اس نے تو جیسے عاتکہ بیگم کی جدائی کے دکھ کو دل سے لگا لیا تھا۔

صفدر مرزا زیادہ سے زیادہ وقت اسے دینے لگے۔

صبح خود اسکول لے جاتے اور چھٹی کے وقت بھی آفس سے جلدی اٹھ آتے تاکہ خود گھر لائیں۔ پاس بیٹھ کر ہوم ورک کراتے، اس کے ساتھ لڈو کھیلتے، کرکٹ کھیلتے اور اسے کہانیاں سناتے، یوں ہولے ہولے اس کے چہرے کی چمک لوٹنے لگی۔ لیکن نصرت جہاں ان کی اس کی زیادہ توجہ پر جل بھن اٹھتیں اور ان کی عدم موجودگی میں سارا غصہ اس پر نکالتیں۔ ان کی زبان پر کانٹے اُگ آئے تھے اور آتے جاتے وہ یہ کانٹے اس کے جسم میں چبھوتی رہتیں۔

"اللہ جانے رضوان کہاں مر گئے۔" وہ آپ ہی آپ بڑبڑاتی رہتیں۔

"نئی نویلی بیوی کے چونچلوں میں بچے کو بھلا بیٹھے اور ہمارے سر پر مصیبت ڈال دی۔"

مگر رضوان حیدر نے اسے بھلایا نہیں تھا۔ کراچی آتے ہی وہ سیدھے ادھر آئے تھے، لان میں اپنی مخصوص جگہ پر موتیا کی کیاری کے پاس بیٹھا، بلاکس سے کھیل رہا تھا۔ رضوان حیدر نے بے اختیار اسے لپٹا لیا۔

"میرا بیٹا! میری جان!"

اور اس کے مضطرب آنکھوں میں سکون سا اتر آیا۔ وہ اسے گود میں اٹھائے اٹھائے اندر گئے۔ نانو انہیں دیکھتے ہی پھٹ پڑیں۔ بہت کوسنے دیئے، بہت روئیں پیٹیں۔

"ہائے رضوان! تو نے میری بچی کا کفن بھی میلا نہیں ہونے دیا۔ کچھ تو خیال کیا ہوتا۔"

وہ سر جھکائے نادم سے بیٹھے رہے۔

"خالہ جان میں مجبور تھا' یقین کریں مجھے شادی کی بالکل جلدی نہیں تھی، تایا ابا نے مجبور کیا تھا۔"

"ہائے تمہارے تایا کو مجھ بدنصیب کی بیٹی سے کیا دشمنی تھی۔"

"کوئی دشمنی نہیں تھی خالہ جان! آپ میری بات تو سنیں۔ عطیہ کے والد بیما عطیہ کے لئے رشتوں کی کمی نہیں تھی۔ مگر تایا ابا کے سامنے وہ انکار نہ کر سکے اور تایا ابا تھا کہ مجھے اچھی بیوی تو کبھی بھی مل جائے گی۔ مگر فرہاج کو شاید اچھی ماں نہ مل سکے۔ اپنے بیٹے کی خاطر اتنی جلدی کی ہے۔ خالہ جان آپ عطیہ سے مل کر تو دیکھیں، وہ بہت نرم دل اور اچھی ہے۔ مجھے یقین ہے، وہ فرہاج کو عاتکہ کی کمی محسوس نہیں ہونے دے گا"

"ارے رہنے دو یہ بہانے بازیاں' کبھی سوتیلی ماں بھی اپنی ہوئی ہے۔"

انہوں نے کھینچ کر فرہاج کو اپنے قریب کر لیا۔ تب ہی صفدر مرزا بھی جو کسی کا مارکیٹ تک گئے تھے، آ گئے۔ پہلے کی طرح وہ بڑے خلوص سے رضوان حیدر سے ملے مسکرا کر فرہاج کی طرف دیکھا، جو نانو کے پاس چپ بیٹھا تھا۔

"بھئی ہمارا بیٹا اپنے پاپا سے مل کر خوش نہیں ہوا۔" پھر وہ رضوان حیدر کی مڑے۔

"رضوان بھائی! یہ گھر جانے کے لئے بہت بے چین تھا۔"

"ہاں میں اپنے بیٹے کو لینے ہی تو آیا ہوں۔ جاؤ اپنی چیزیں اکٹھی کرو اپنے کپڑے سب۔"

"مگر رضوان! میں اسے تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گی۔ غضب خدا کا سوتیلی جھڑکیاں سننے کے لئے بھیج دوں۔"

رضوان حیدر کے چہرے کا رنگ لمحے بھر کو بدلا، مگر پھر فوراً ہی انہوں نے خود پالیا۔

"خالہ جان پلیز! آپ بار بار یہ تکلیف دہ لفظ مت دہرائیں۔"

"مگر سن لو! میں اسے تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گی۔ ابھی میری ہڈیوں میں اتنا کہ میں اس کی پرورش کر سکوں۔"

"مگر وہ میرا بیٹا ہے خالہ جان اور میں اسے اپنے پاس ہی رکھنا چاہوں گا۔"

"ایسا ہی تمہیں اپنے بیٹے کا خیال تھا تو شادی کیوں رچائی تھی۔"

"اس لیے کہ میں مرد ہوں اور بچے کی مناسب تربیت ایک عورت ہی کر سکتی ہے۔"

وہ کھڑے ہو گئے۔

"چلو بیٹا!"

"بیٹھیے تو سہی رضوان بھائی! چائے بن رہی ہے۔"

"نہیں پھر سہی۔"

ان کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ انہوں نے فرہاج کی طرف دیکھا۔

"چلو بیٹا! اپنا اسکول بیگ لے آؤ۔"

اور انہیں یوں جانے کے لئے تیار دیکھ کر نانو کا سارا طنطنہ ختم ہو گیا اور وہ بھربھری ریت کی دیوار کی طرح ڈھے گئیں اور انہوں نے اپنی جھولی رضوان حیدر کے سامنے پھیلا دی۔

"میری عاتو کی نشانی میری جھولی میں ڈال دے رضوان! ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھوں گی۔"

"خالہ جان!"

رضوان نرم پڑ گئے۔

"جانتا ہوں آپ اسے بہت چاہتی ہیں، مگر میں اسے اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔"

"عطیہ لاکھ اچھی سہی رضوان! پر ہے تو سوتیلی ناں فرہاج کی بہتری کے لئے اسے میرے پاس چھوڑ جاؤ۔"

وہ شش و پنج میں پڑ گئے۔ وہ فرہاج کو ساتھ لے جانا چاہتے تھے، مگر نانو نے بھی ان کے دل میں وہم اور شک کے کانٹے اگا دیئے تھے، کیا پتا عطیہ اسے وہ محبت نہ دے سکے، جو نانو دے سکتی ہیں۔

اور انہیں الجھے دیکھ کر صفدر مرزا نے ان کی مدد کی۔

"بھئی یہ فرہاج سے پوچھیں کہ وہ کہاں رہنا چاہتا ہے، نانو کے پاس یا اپنے پاپا کے پاس۔"

"کیوں بیٹا؟"

وہ ایک دم ہی رضوان حیدر کی طرف بڑھا، مگر پھر نانو کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

”ارے وہ ڈائن کلیجہ چبا ڈالے گی، میرے بچے کا۔“

اور وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کے اندر وہی لرزا دینے والی کپکپی طاری ہوگئی۔ اس
بے بسی سے ان کی طرف دیکھا اور دوڑ کر نانو کی گود میں چھپ گیا۔ رضوان حیدر کے چہرے
پر مایوسی چھا گئی۔

”میں نانو کے پاس رہوں گا۔“

اس نے ان کی گود میں منہ چھپائے چھپائے کہا اور رضوان حیدر کھڑے ہو گئے۔
اس پر سختی نہیں کرنا چاہتے تھے، اس کی خوشی کی خاطر انہوں نے اپنے دل پر جبر کر لیا۔

”اچھا بیٹے! جہاں آپ کی مرضی آپ وہاں ہی رہیں۔ میں آپ کے پاس آتا رہوں
گا۔“

انہوں نے اسے نانو کی گود سے لے کر پیار کیا۔

”ہاں، ہم اپنے بیٹے کے لئے بہت سی چیزیں لائیں گے۔“

اور جب وہ جا رہے تھے، تو اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں اور اس نے خود ہی سوچ لیا
پاپا کو اب اس سے محبت نہیں رہی، ورنہ وہ اسے زبردستی ساتھ لے جاتے۔ وہ تو ان سے
تھا، ناراض تھا کہ وہ اسے بتائے بغیر اس سے ملے بغیر لاہور چلے گئے تھے، مگر انہیں پتا ہی نہ
چلا تھا۔ وہ آنکھوں میں آنسو چھپائے باہر کیاریوں کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور پھر سے بلاکس
ترتیب دینے لگا اور اندر نانو اور نصرت جہاں میں تیسری عالمی جنگ چھڑ گئی تھی۔

”مجھ سے نہیں پالے جاتے کسی کے بچے۔“

”مت پالو۔“ نانو بہت پرسکون تھیں، ”میں خود پالوں گی۔“

”اٹھ کر پانی تو پیا نہیں جاتا، خود پالیں گی۔ اے میں کہتی ہوں، بھجوا دو اسے باپ کے
پاس۔ یتیم خانہ نہیں کھول رکھا ہم نے۔“

”نصرت جہاں!“ صفدر مرزا کو غصہ آ گیا۔

”حد سے مت بڑھو۔ فرہاج یہیں رہے گا، اسی گھر میں۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔“

وہ غصے سے تلملاتے ہوئے، باہر نکل گئے اور وہ بلاکس کے پاس بیٹھا گھٹنوں پر سر رکھ کر
گھٹ گھٹ کر رونے لگا۔

صفدر مرزا کا غصہ جب ذرا کم ہوا، تو انہوں نے بڑی محبت اور نرمی سے نصرت جہاں

سمجھایا۔

”دیکھو نصرت! خدا نے ہمیں اولاد نہیں دی تھی، مگر اللہ نے ہماری جھولی میں فرہاج کو
ڈال دیا ہے، ناشکری نہ کرو اور اسے مت ٹھکراؤ، اسے اپنا بیٹا بنا لو، اس سے نفرت نہ کرو۔ کیا پتا
اس کی ذات کی برکت سے تمہاری جھولی بھر جائے۔“

نصرت جہاں خاموش رہی تھیں اور صفدر مرزا مطمئن سے ہوگئے، کہ انہوں نے اس کا
فیصلہ قبول کر لیا ہے، لیکن نصرت جہاں نے یہ فیصلہ قبول نہیں کیا تھا، انہوں نے اس معصوم
بچے پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔ جب بھی نانو اِدھر اُدھر ہوتیں اور صفدر مرزا گھر پر نہ ہوتے تو
وہ اس کی پیٹھ پر دھموکے لگاتیں تو وہ بلبلا اٹھتا اس کے رخساروں پر تھپڑ مارتیں تو اس کی
آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگتے اور وہ گھٹنوں چھپ چھپ کر روتا رہتا، لیکن رضوان حیدر
یا صفدر مرزا سے ان کی شکایت نہ کرتا حالانکہ رضوان روز ہی لدے پھندے اس سے ملنے
آتے تھے۔

پتا نہیں اس کے اندر عجیب سا خوف بیٹھ گیا تھا، اسے ڈر تھا، کہ اگر اس نے نصرت
جہاں کی شکایت کی، تو وہ اس کا گلا ہی گھونٹ دیں گی، اسے ان کی لانبی پتلی انگلیوں والے
ہاتھوں سے بہت ڈر لگتا تھا، مگر اس روز صفدر مرزا نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، وہ کچن کا
دروازہ بند کیے اسے مار رہی تھیں، صفدر مرزا باہر جانے کے لئے نکلے تھے، مگر پھر کوئی بات
پوچھنے کے لئے پلٹ آئے۔ بجائے اس کے کہ وہ اندر آتے انہوں نے باہر لان کی طرف
کھلنے والی کھڑکی میں سے اندر جھانکا تا کہ نصرت جہاں سے بات کر سکیں اور پھر کھڑکی کی جالی
میں سے انہوں نے جو منظر دیکھا، اس سے ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ اس کے بال
پکڑے اس کے رخساروں پر تھپڑ مار رہی تھیں اور وہ چپ چاپ پٹ رہا تھا۔

”چائے کیوں گرائی ہے ہاتھ کانپتے ہیں تیرے، تیری ممی قبر سے آ کر میل صاف کرے
گی۔“

”نصرت۔“ وہ وہیں سے دہاڑے اور تقریباً بھاگتے ہوئے، چکر کاٹ کر کچن کے
دروازے تک آئے اور بغیر کچھ کہے فرہاج کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور یونہی بازوؤں
میں سمیٹے سمیٹے ایک غصیلی نظر نصرت جہاں پر ڈال کر وہ اپنے کمرے میں آ گئے۔

کتنی ہی دیر تک وہ اس کے پھول جیسے رخساروں پر انگلیوں کے نشان دیکھتے رہے، پھر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

بے اختیار اس کے رخسار پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے اور ان کی آنکھیں نم ہو گئیں، وہ اسے بازوؤں میں لیے بے تحاشا چومتے رہے اور ان کی اس بے انداز محبت پر اس کی آنکھو آنسو اتر آئے اور وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔ بڑی دیر بعد انہوں نے اسے خو الگ کیا اور پیار سے پوچھا۔

"کیا آنٹی نے پہلے بھی کبھی آپ کو مارا ہے؟"

"جی! وہ تو روز ہی مارتی ہیں"

وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔

"آپ نے ہمیں بتایا کیوں نہیں؟"

"آنٹی کہتی تھیں، اگر میں نے آپ کو بتایا، تو وہ مجھے جنگل میں پھنکوا دیں گی اور مجھے شیر کھا جائیں گے۔"

صفدر مرزا غصے سے پیچ و تاب کھا کر رہ گئے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا، کہ وہ لھ جہاں کا گلا گھونٹ دیں، مگر وہ صبر کیے اسے اپنے سامنے بٹھائے غور سے دیکھتے رہے۔ و کمزور ہو گیا تھا اور کس قدر خوفزدہ اور سہما سہما لگ رہا تھا، یہ وہی فرہاج تھا، جو کچھ دن تک بڑا با اعتماد دکھائی دیتا تھا، جس کی آنکھیں بھی ہنستی تھیں، مگر اب ان آنکھوں کی جوت گئی تھی اور ساری خود اعتمادی ختم ہو گئی تھی۔

"سوری عاتو!" انہوں نے دل ہی دل میں بہن سے معذرت چاہی "میں ٹھیک ط تمہاری امانت کی حفاظت نہیں کر سکا۔"

اس روز وہ سارا دن کمرے ہی میں رہے' نہ کھانے کے لیے باہر نکلے اور نہ ہی کم باہر گئے' خادم حسین ان کے کہنے پر کھانا کمرے میں ہی لے آیا تھا، وہ سارا دن ایک ہی با سوچتے رہے، کہ انہیں کیا کرنا چاہیے، فرہاج کی بہتری کے لیے اس کی بھلائی کے لئے ا ابھی وہ کسی حتمی فیصلے پر نہیں پہنچے تھے، کہ رضوان احمد کا فون آ گیا۔ وہ فرہاج سے معذرت رہے تھے، کہ آج وہ اس سے ملنے نہیں آ سکتے تھے۔

"ماموں جان! میں گھر چلا جاؤں پاپا کے پاس؟"

اس نے رضوان حیدر سے باتیں کرتے کرتے مڑ کر صفدر مرزا سے پوچھا۔

"ہاں!" صفدر مرزا چونکے۔

"ٹھیک ہے' یہی بہتر ہے' اس کے لئے ورنہ یہاں رہ کر تو اس کی شخصیت مسخ ہو جائے گی۔"

"ہاں ہاں بیٹا! ضرور آپ کے پاپا تو آپ کے بغیر بہت اداس رہتے ہیں"

وہ ریسیور ہاتھ میں پکڑے لمحہ بھر کچھ سوچتا رہا۔

"ہیلو ہیلو بیٹا" رضوان حیدر نے اسے بلایا۔

"پاپا!" وہ کچھ جھجک سا گیا۔

"میں گھر آنا چاہتا ہوں پاپا! آپ کے ساتھ میں آپ کے پاس رہنا چاہتا ہوں۔"

اس کی آواز بھرا گئی۔ تو اس نے ریسیور صفدر مرزا کو پکڑا دیا اور رضوان حیدر انہیں بتانے لگے، کہ وہ صبح آ کر اسے لے جائیں گے۔ وہ بہت خوش ہو رہے تھے، لیکن صفدر مرزا کا دل ان کی جدائی کے خیال سے ڈوبا جا رہا تھا' وہ ریسیور کریڈل پر ڈال کر چپ چاپ باہر نکل گئے۔ تاکہ نانو کو بتا سکیں اور انہیں سمجھا سکیں، کہ بہر حال فرہاج کو واپس جانا ہے اور یہی اس کے لیے بہتر ہے۔"

اور صفدر مرزا کے باہر نکلتے ہی وہ بیڈ پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، شاید ماموں جان اور نانو سے بچھڑنے کا دکھ تھا' جو اسے رلائے جا رہا تھا اور اس رات وہ اتنا رویا کہ کبھی نہیں رویا تھا۔ جب صفدر مرزا کمرے میں آئے، تو وہ سوتے میں بھی سسکیاں لے رہا تھا۔ انہوں نے اپنے ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ دیئے اور پھر نائٹ بلب جلاتے ہوئے' اس کے برابر ہی لیٹ گئے۔

● ● ●

وہ آخری شو دیکھ کر لوٹا تو خلاف معمول گیٹ کھلا تھا اور باہر کی ساری لائٹیں جل رہی تھیں۔ اسے لمحہ بھر کو حیرت ہوئی' پچھلے کئی دنوں سے وہ آخری شو دیکھ کر ہی گھر لوٹتا تھا، مگر بابا کریم بخش کے سب ہی سو رہے ہوتے تھے، مگر آج نہ صرف گیٹ کھلا تھا، بلکہ ساری لائٹیں بھی جل رہی تھیں اور کریم بخش بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"ہو گا کچھ!"

وہ ہولے سے سر جھٹک کر مدھم سروں میں سیٹی بجاتا ہوا کوریڈور میں آ گیا۔ وہ جان بوجھ کر دیر تک باہر رہتا تھا، تاکہ ماریہ کا سامنا نہ ہو سکے، پتا نہیں کیوں وہ اندر ہی اندر اس

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

سے خوفزدہ ہو گیا تھا، حالانکہ سامنے ہونے پر وہ اس سے بڑی بداخلاقی سے پیش آتا
پھر بھی اسے محسوس ہوتا تھا، جیسے وہ اندر سے کمزور ہوتا جا رہا ہو، اسے سامنے دیکھ کر اس
مضطرب سا ہو جاتا، جی چاہتا، وہ اس سے باتیں کرے، ہلکی پھلکی دلچسپ باتیں اور پھر
دل کی اس خواہش کو بری طرح دبا کر وہ کوئی نہ کوئی ایسی بات کہہ دیتا تھا، کہ وہ بری طرح
جاتی تھی اور اسے یوں تلملاتے دیکھ کر اسے انجانی سی خوشی ہوتی۔

وہی کمینی خوشی جو علیمہ بیگم کو اذیت میں دیکھ کر ہوتی تھی، جو رضوان حیدر کو پریشا
فرح، ثوبی کو خوف زدہ دیکھ کر ہوتی تھی اور اب تو کئی دنوں سے اس نے اسے دیکھا تک
تھا۔ پتا نہیں وہ یہاں پر ہی تھی یا چلی گئی تھی۔ وہ تو رات گئے، آ کر بیڈ پر گر جاتا تھا، نہ کسی
کھانے کے لئے پوچھا نہ اس نے خود کھانے کے لیے کہا، کریم بخش گیٹ بند کر کے نیند
جھونکے کھاتا، اپنے کمرے میں چلا جاتا، مگر آج اسے بھوک لگ رہی تھی۔ کیونکہ اس
دوپہر کو بھی کچھ نہیں کھایا تھا، مسلسل بازار کے چنے، پائے اور اوٹ پٹانگ چیزیں کھا کھا کر
کے سینے میں جلن ہو رہی تھی۔ اس لیے آج اس نے فاقہ کیا تھا۔ مگر اس وقت پیٹ
چوہے دوڑ رہے تھے۔ اس لیے وہ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے کچن میں چلا آیا
فریج کھول کر کوئی کھانے کی چیز تلاش کر رہا تھا، کہ گلاس ہاتھ میں لیے ماریہ نے کچن میں
رکھا اور اسے وہاں کھڑے دیکھ کر ذرا سی حیران ہوئی۔

”آپ کب آئے؟“

”ابھی......!“

اس نے نرمی سے کہا اور بغیر کچھ کھائے پیئے فریج بند کر کے اپنے کمرے میں آ گیا
کرسی کی پشت پر سر رکھتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

”میں اس سے نفرت کرنا چاہتا ہوں، لیکن پتا نہیں کیوں میرے اندر اس کے لئے
نفرت پیدا ہوتی ہے۔ خود بخود ہی ختم ہو جاتی ہے۔“

تب ہی ٹرالی دھکیلتی ہوئی، ماریہ اندر آ گئی اور کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو محسوس کر
اس نے آنکھیں کھول دیں۔

”آپ نے کیوں تکلیف کی؟“

اگرچہ پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے، لیکن اس نے تکلفاً

”تکلیف کی کیا بات ہے، اتفاق سے میں جاگ رہی تھی، ورنہ کئی راتوں سے شاید آپ
ہو کے سو رہے ہیں۔“

”نہیں!“ وہ جلدی سے بولا ”میں باہر سے کھا کر آتا ہوں۔“

وہ خاموشی سے پلٹی تو اس کا جی چاہا، وہ اسے بلا کر کہے، کہ وہ کھانا واپس لے جائے،
وہ اس کا احسان نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ مگر تب تک وہ جا چکی تھی اور ہری مرچ قیمے کی خوشبو اس
کی بھوک کو بڑھا رہی تھی۔

ابھی اس نے کھانا ختم ہی کیا تھا، کہ وہ چائے لے کر آ گئی۔

”تھینک یو!“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ وہ اس وقت چائے کی ضرورت محسوس کر
رہا تھا۔

”کوئی بات نہیں۔ مجھے اپنے لیے بھی بنانی تھی۔“

ماریہ نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

دراصل وہ اس کی طرف سے قطعی طور پر مایوس ہو چکی تھی اور اسے یقین ہو گیا تھا، کہ
اس کے اندر سب کے لیے نفرت کی اتنی گہری تہیں ہیں، کہ اگر وہ ساری عمر بھی کوشش کرتی
رہے تو اسے کھرچ نہیں سکے گی۔ پتا نہیں اتنی نفرت کہاں سے اس کے اندر اکٹھی ہو گئی تھی۔

لحہ بھر کچھ سوچنے کے بعد اس نے فرہاج کی طرف دیکھا۔

”آپ کو پتا ہے، آج آنٹی کی طبیعت بہت خراب ہے، ان کا بلڈ پریشر بہت ہائی ہو گیا
تھا، کتنی دیر بے ہوش رہیں، ابھی ڈاکٹر انہیں دیکھ کر گیا ہے۔“

”اچھا، جب ہی سب لوگ جاگ رہے ہیں۔“

”آپ کو پریشانی نہیں ہوئی، اگر آنٹی کو کچھ ہو جاتا تو۔“

”تو کیا ہوتا؟“ وہ زور سے ہنس پڑا۔

اس نے ماریہ کی آنکھوں میں دیکھا۔

”وہ میری کیا لگتی ہیں، صرف سوتیلی ماں اور اگر وہ مر بھی جائیں تو بھی۔“

”نہیں......!“

ماریہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

”آپ اتنے ظالم نہیں ہو سکتے۔“

"میں ظالم ہوں ماریہ احسن!"

اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر وہی وحشی سی چمک لہرانے لگی تھی۔

"جب یہ عورت کبھی میرے لیے پریشان نہیں ہوئی تو میں کیوں اس کے لئے پریشان ہوتا پھروں۔"

اس نے چائے کی پیالی میز پر رکھ دی اور کسی نامعلوم نکتے پر نگاہیں جمائے جیسے خود سے بولا۔

"میرے بیمار پڑنے پر اس عورت نے کبھی میرے سرہانے بیٹھ کر میری زندگی کی دعائیں نہیں مانگیں' کبھی میرا حال نہیں پوچھا تو پھر میں......."

اس نے سوالیہ نظروں سے ماریہ کی طرف دیکھا اور پھر خود ہی ہنس دیا۔

"بھلا میں آپ سے یہ کیوں کہہ رہا ہوں۔ آپ بھی تو اسی قبیلے سے ہیں۔"

ماریہ کا دل اس کی لمحہ بہ لمحہ بدلتی کیفیت پر دکھ سا گیا۔

اور اس نے بات بدلنے کے لئے پوچھا۔

"اور چائے پئیں گے آپ؟"

"نہیں بس اب آپ یہاں سے جائیں۔ میں آپ کی اس مہربانی کے لئے ممنون ہوں۔"

"کیا آپ آنٹی کا حال پوچھنے نہیں جائیں گے؟۔"

"نہیں۔" وہ دہاڑا۔

"کیوں جاؤں میں؟ کیا ناتا ہے، میرا ان سے۔"

"وہ آپ کی بہنوں کی ماں ہیں۔ آپ کے ڈیڈی کی بیوی ہیں، پھر آپ برسوں سے ایک ہی گھر میں رہ رہے ہیں، رسمی طور پر ہی سہی چل کر ان کا حال دریافت کر لیجیے۔"

وہ بات مکمل کر کے جلدی سے باہر نکل گئی، کہ کہیں وہ غصے میں اسے دھکے مار کر باہر ہی نہ نکال دے۔

اور وہ کسی مقناطیسی کشش سے کھنچتا ہوا، اس کے پیچھے ہی باہر نکل آیا اور کھوئی کھوئی سی کیفیت میں چلتا ہوا وہ جب ان کے بیڈ روم میں پہنچا تو نادم سا ہو گیا۔ رضوان حیدر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ علیمہ بیگم شاید دوا کے زیر اثر سو رہی تھیں۔ فرحی ان کے سرہانے بیٹھی

تھی۔ اندر ہی اندر وہ بل کھا کر رہ گیا۔

یہ میں اتنا کمزور ہو گیا ہوں، کہ ایک بالشت بھر کی لڑکی کے سامنے ہار جاتا ہوں، کیا ضرورت تھی، مجھے یہاں آنے کی۔

"بیٹھو بیٹا۔" رضوان حیدر نے کہا، تو وہ بادل نخواستہ بیٹھ گیا۔

"کیسی طبیعت ہے ان کی؟۔"

اور رضوان حیدر اسے تفصیل بتانے لگے اور وہ بیزاری سے سنتا رہا۔

ماریہ نے اندر آ کر اسے بیٹھے دیکھا، تو اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ وہ خاموشی سے علیمہ بیگم کے بیڈ پر جا کر بیٹھ گئی، تو بالآخر میں تمہارے آئینے پر ضرب لگانے میں کامیاب ہو گئی ہوں، بس ایک آخری ضرب ایک آخری چوٹ اور پھر۔

فرہاج نے سامنے بیٹھی اپنی طرف دیکھتی ہوئی ماریہ احسن پر ایک غصیلی نظر ڈالی اور اٹھ کھڑا ہوا' اپنے کمرے میں آ کر وہ بہت دیر تک ٹہلتا رہا، لیکن اس کا غصہ کم نہ ہوا، تو اس نے چیزیں اٹھا اٹھا کر زمین پر پٹخنی شروع کر دیں۔ اس پر عجیب سا جنون طاری ہو گیا تھا اور پھر تھک ہار کر وہ اوندھے بیڈ پر گر پڑا۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو کمرے کی ابتر حالت دیکھ کر لمحہ بھر کو تو وہ حیران رہ گیا، پھر رات کی بات یاد کرتے ہی وہ یونہی بغیر منہ ہاتھ دھوئے اس کے کمرے میں جا پہنچا وہ جائے نماز تہہ کر رہی تھی، اتنی صبح اسے اپنے کمرے میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"خیریت؟"

"جی میں آپ سے یہ پوچھنے آیا ہوں، کہ آپ یہاں سے کب تشریف لے جائیں گی؟۔"

"اتنی سی بات کے لئے آپ نے ناحق اتنی صبح تکلیف کی' ویسے اطلاعاً عرض ہے، کہ میرا فی الحال جانے کا کوئی ارادہ نہیں' آنٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور فرحی ڈوبی کے امتحانات ہونے والے ہیں۔"

اس نے لاپروائی سے کہا، تو وہ پیر پٹختا ہوا واپس آ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کہ وہ کیا کرے اس سارے فساد کی جڑ یہ لڑکی تھی۔ جس نے اس کے وجود کی پوری عمارت کو ہلا ڈالا تھا' اس روز وہ ناشتا کیے بغیر ہی نکل گیا اور اس کا خیال بھلانے کے لئے اپنے آفس میں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

کام کرنے والی چپٹی ناک اور طباق جیسے چہرے والی بدصورت لڑکی کے ساتھ گھومتا پھر اس کے ساتھ سے بے حد خوش ہو رہی تھی۔ شام کو اسے اس کے گھر پہنچا کر وہ کلب چلا گ وہاں سے اٹھا، تو آخری شو دیکھنے لگا، آخری شو دیکھ کر جب وہ پلٹا تو حسبِ معمول کریم نے گیٹ کھولا۔ برآمدے میں مدھم روشنی والا بلب جل رہا تھا اور سب کمرے اندھیرے ڈوبے ہوئے تھے۔ سوائے ماریہ اور فرحی، ٹوبی کے کمرے کے۔ شاید وہ اس کے انتظار جاگ رہی تھی۔

اس کے دل میں خوشگوار سی دھڑکن ہوئی اور وہ جان بوجھ کر زور زور سے پاؤں ما اس کے کمرے کے پاس سے گزرا، اپنے کمرے میں آ کر بہت دیر تک وہ کرسی پر لاشعوری طور پر اس کا انتظار کرتا رہا، کہ شاید وہ ابھی کھانا لے کر آئے گی، مگر جب وہ نہیں آ تو غصے سے اس کا دماغ کھولنے لگا، اس نے میز پر پڑی ہوئی نیلی جلد والی ڈائری کو اٹھا زور سے سامنے کی دیوار پر دے مارا اور وہ دیوار سے لگ کر الماری کے نیچے چلی گئی، تو یونہی سلگتا ہوا بیڈ پر گر گیا اور تکیہ سر پر رکھ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

● ● ●

رضوان حیدر صبح ہی صبح اسے لینے آ گئے تھے۔ نانو اسے رخصت کرتے ہوئے بہ روئیں، مگر وہ بہت خاموش اور سنجیدہ لگ رہا تھا، رضوان حیدر سارا راستہ اس سے باتیں کر رہے۔ مگر وہ کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔

عطیہ بیگم گاڑی کی آواز سن کر برآمدے تک آ گئی تھیں۔ چہرے پر نرم سی مسکراہٹ لے انہوں نے بڑے پیار سے اسے پکارا۔

"ادھر آؤ بیٹا! میرے پاس۔"

فرہاج جھجک کر رضوان حیدر کے پیچھے چھپ گیا۔

"ارے بیٹا' شرماؤ نہیں' یہ تمہاری نئی ممی ہیں۔"

"ڈائن کلیجہ چبا جائے گی' میرے بچے کا۔"

نانو کی آواز اس کے کانوں میں گونجی تو وہی لرزا دینے والی کپکپی اس کے اندر طاری ہو گئی اور رنگ زرد پڑ گیا۔

"بیٹا! ممی کو سلام کرو۔"

"نہیں یہ میری ممی نہیں ہیں، یہ تو ڈائن ہیں' میری ممی مر گئی ہیں۔"

عطیہ بیگم کا مسکراتا چہرہ پھیکا پڑ گیا اور رضوان حیدر کے دل میں جیسے کسی نے تیز دھار آلے کی انی اتار دی۔

"نہیں بیٹا! بری بات۔" انہوں نے پیار سے اسے سمجھایا۔

"ایسے نہیں کہتے میری جان چلو شاباش ممی کو سلام کرو۔"

وہ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا۔

"السلام علیکم!"

عطیہ بیگم نے مسکرانا چاہا لیکن مسکرا نہ سکیں اور نہ ہی ان کے ہاتھ اسے گود میں لینے کے لئے آگے پھیلے۔ جب رضوان حیدر اس سے باتیں کرتے کرتے اسے کمرے میں لے کر آ گئے۔

اپنے کمرے میں آ کر اسے خوشی کا احساس ہوا' وہیں ایک طرف کونے میں اس کا بیڈ لگا ہوا تھا۔ بیڈ کے قریب سیاہ منقش لکڑی کا شیلف تھا، جس پر اس کی کتابیں وغیرہ پڑی تھیں۔ کارنس پر کھلونے پڑے تھے اور ایک طرف اس کی بڑی سی رنگین تصویر پڑی تھی۔ رضوان حیدر نے خود ہی وارڈ روب میں اس کے کپڑے رکھے۔ شیلف میں اس کی کتابیں سجائیں اور بہت دیر تک اس کے پاس بیٹھے رہے۔

پھر اسی شام وہ اسے گھمانے لے گئے۔ عطیہ بیگم بھی ان کے ساتھ تھیں۔ کبھی کبھی جب وہ ان کی طرف متوجہ ہو جاتے، تو اسے بہت غصہ آتا اور وہ دل ہی دل میں چڑ سا جاتا۔ مگر اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا کیونکہ اتنے عرصے بعد اسے پپا کے ساتھ ساحل سمندر پر آنا اچھا لگا تھا۔ کبھی کبھی جب ممی زندہ تھیں، تو وہ سب مل کر یہاں آتے تھے۔ ممی کے تصور نے اسے افسردہ کر دیا تھا، مگر پھر بھی۔ اس رات وہ بڑی پرسکون نیند سویا' سونے سے پہلے پاپا نے اس کی پیشانی چومی تھی اور اس کو کمبل اوڑھا دیا تھا، بالکل ممی کی طرح بلکہ نیم غنودگی میں اس نے رات کے کسی پہر محسوس کیا تھا، کہ پاپا اس کے کمرے میں آئے ہیں، اس کا کمبل درست کیا ہے اور پھر چلے گئے ہیں، اس کے کمرے کا دروازہ پاپا کے بیڈ روم میں کھلتا تھا۔

صبح پاپا خود ہی اسے جگانے آئے تھے اور تیار ہونے میں اس کی مدد کی تھی۔ جب وہ پاپا کے ساتھ ڈائننگ ہال میں آیا، تو عطیہ بیگم میز پر ان کی منتظر تھیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

وہ پاپا کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ انہوں نے سلائس پر مکھن لگا کر اس کی پلیٹ رکھا۔

"لو بیٹے! یہ انڈوں کا حلوہ کھاؤ۔" علیہ بیگم نے ڈونگہ اس کی طرف کھسکایا۔
"آپ کے پپا نے بتایا ہے، آپ کو انڈوں کا حلوہ بہت پسند ہے۔"
"جی!"

اس نے سر ہلا دیا اور تب ہی نانو اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگیں۔
"خدا کے لئے منحوست بھیجو! میرے بچے کو ادھر، وہ ڈائن کسی دن کھانے میں زہر دے گی۔" اس کا رنگ زرد ہوا اور اس کے اندر کپکپی طاری ہوگئی اور اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"نہیں۔ میں نہیں کھاؤں گا۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔"
"اچھا تو پھر یہ سیب کا مربہ لو۔"
"نہیں۔" وہ خوف زدہ ہوگیا "مجھے کچھ نہیں کھانا۔
اور بغیر کچھ کھائے پیئے اٹھ گیا۔ رضوان حیدر نے تشویش سے اسے دیکھا اور پھر ا کے پیچھے چلے آئے۔
"بیٹا! آپ نے کچھ نہیں کھایا۔"
"مجھے بھوک نہیں ہے پپا۔"
اس نے بے نیازی سے کہا اور جھک کر تسمے باندھنے لگا۔
"کیوں بھوک نہیں ہے؟"
"پتا نہیں۔"
اس نے اپنا اسکول بیگ گلے میں لٹکا لیا اور کھڑا ہوگیا۔
"نہیں بیٹے! اس طرح خالی پیٹ اسکول نہیں جاتے۔ دودھ پی لو' کریم بخش۔"
انہوں نے آواز دی۔
"فرہاج کے لئے دودھ لاؤ۔"
"آپ مجھے اسکول چھوڑنے جائیں گے پاپا! یا میں بابا کے ساتھ چلا جاؤں؟"
"پہلے آپ کس کے ساتھ جاتے تھے؟"

"پہلے کی بات اور تھی پپا۔"
اس نے اتنی سنجیدگی سے کہا، کہ رضوان حیدر کو یوں لگا جیسے کسی نے ان کا دل مٹھی میں لے لیا ہو۔
"یہ میرے اور میرے بیٹے کے درمیان اتنا فاصلہ کیوں ہوگیا ہے، صرف عاتکہ کے بیچ سے چلے جانے سے۔"
"عاتکہ! کاش تم ہمیں یوں چھوڑ کر نہ جاتیں"
انہوں نے ایک گہری سانس لی۔
"پہلے اور اب میں کوئی فرق نہیں پڑا میری جان! سب کچھ ویسا ہی ہے بس!"
اور انہوں نے بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔ "اچھا آپ دودھ پئیں میں گاڑی نکلواتا ہوں۔" وہ باہر نکل گئے اور وہ دودھ پیتے ہوئے ان کی بات پر غور کرتا رہا۔
پھر کئی دن گزر گئے، علیہ بیگم نے اسے اپنے ساتھ مانوس کرنے کی بہت کوشش کی، مگر وہ الگ تھلگ ہی رہا، کبھی نانو کی آواز اس کے کانوں میں گونجتی "ڈائن کلیجہ چبا جائے گی، میرے بچے کا۔" تو وہ سہم کر ان سے دور چلا جاتا، کبھی وہ اسے کھانے کے لئے کچھ دیتیں تو وہ سوچتا کہیں زہر نہ ملا ہو، پیار سے اسے اپنے پاس بلاتیں تو خوفزدہ ہو جاتا، کہ کہیں پپا کی نظر بچا کر گلا نہ گھونٹ دیں۔
اس روز بھی وہ بازار سے اس کے لئے پستول لائی تھیں۔ اس نے پستول لے تو لیا، لیکن پھر اسے زمین پر پھینک کر پاؤں تلے کچل دیا، تو علیہ بیگم نے شکوہ کیا۔
"آپ کا بیٹا مجھ سے نفرت کرتا ہے، رضوان! آپ نے کبھی غور کیا، کبھی اس خیال سے دیکھا اپنے بیٹے کو۔"
"ہاں!" وہ چونکے۔
"پتا نہیں وہ ایسا کیوں ہوگیا ہے' وہ ایسا نہیں تھا' علیہ بیگم! وہ تو اجنبیوں سے بھی گھل مل جاتا تھا۔"
"اسے میرے خلاف سکھایا پڑھایا گیا ہے۔ نفرت کا یہ زہر اس کے اندر انجیکٹ کیا گیا ہے۔ وہ میری طرف دیکھتا ہی نہیں رضوان! میرے پیار سے بڑھے ہوئے ہاتھوں کو جھٹک دیتا ہے' وہ اپنے ہر عمل سے نفرت کا اظہار کرتا ہے، یوں کیسے گزر ہوگی رضوان۔"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

’’سب ٹھیک ہو جائے گا، عطیہ! بچہ ہے‘ شاید اسے مجھ پر غصہ ہے، مجھے یقین ہولے ہولے اس کا غصہ کم ہوگا، تو وہ تمہیں بطور ماں کے قبول کر لے گا۔‘‘

انہوں نے عطیہ بیگم کو تو سمجھایا، مگر سارا غصہ صفدر مرزا پر اتار دیا، جو فرہاج سے ملنے آئے تھے اور اسے نانو سے ملانے کے لئے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔

’’تم سب نے مل کر میرے بچے کو تباہ کر ڈالا ہے‘ کیسی نفرت بھر دی ہے، اس کے اندر کہ۔‘‘

’’ہم نے رضوان بھائی! اس سے کچھ نہیں کہا‘ وہ خود ہی بہت حساس ہے۔‘‘

صفدر مرزا نے سمجھایا‘ لیکن وہ بہت ناراض تھے اور انہوں نے فرہاج کو ان کے ساتھ بھیجنے سے صاف انکار کر دیا اور یہ بھی کہہ دیا، کہ وہ آئندہ اس سے ملنے نہ آئیں، فرہاج جو ان کے آنے کا سن کر ان سے ملنے آ رہا تھا، اس نے جب دیکھا، کہ وہ اس سے ملے بغیر ہی واپس جا رہے ہیں، تو اسے بہت دُکھ ہوا۔ یقیناً ممی نے انہیں واپس کر دیا ہوگا، مجھ سے ملنے نہیں دیا ہوگا۔ وہ واپس اپنے کمرے میں چلا گیا اور بیڈ کی چادر اتار کر موڑ توڑ کر میز کے نیچے پھینک دی۔ وارڈ روب سے سارے کپڑے نکال کر کمرے کے وسط میں پھینک دیئے، تکیہ کونے میں اچھال دیا‘ کتابیں شیلف سے اتار دیں‘ مار کر توڑ پھوڑ دیے اور جب...... بھی اس کا غصہ اور دُکھ کم نہ ہوا، تو لان میں آ گیا اور بہت سے پھول نوچ کر پھینک دیئے اور پھر کمرے میں لوٹ آیا۔

لیکن رضوان حیدر کے سمجھانے پر جب عطیہ بیگم اس کے کمرے میں آئیں، تو مارے خوف کے‘ وہ دروازے کے پیچھے چھپ گیا۔ لیکن عطیہ بیگم نے اس سے کچھ نہیں کہا، بس ایک نظر اسے دیکھا اور کریم بخش کی مدد سے کمرہ درست کر دیا۔ اس کا خیال تھا، اب وہ پپا سے ضرور اس کی شکایت کر دیں گی اور پپا اسے ماریں گے۔ نانو بھی تو کہتی تھیں نا! کہ جب سوتیلی ماں آ جائے تو باپ بھی پرائے ہو جاتے ہیں، لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔

پپا نے کچھ بھی نہ کہا، شاید عطیہ بیگم نے انہیں بتایا ہی نہ تھا۔ یا پھر اگر بتایا بھی تھا، تو انہوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا تھا‘ شاید عطیہ بیگم ویسی سوتیلی ممی نہ ہوں۔ جیسی نانو کہتی تھیں، اس روز اس نے سوچا تھا اور پھر جانے کس خیال سے وہ ان کے بیڈ روم میں چلا آیا۔ یہ بیڈ روم جو اس سے پہلے پپا اور ممی کا تھا اور جس کی چاروں دیواروں پر ممی کی تصویریں لگی تھیں۔ دلہن بنی ہوئی

ممی‘ سالگرہ کا کیک کاٹتی ہوئی‘ ہنستی ہوئی‘ اسے گود میں بٹھائے پپا کے ساتھ کھڑے‘ ڈھیروں تصویریں تھیں۔ اب وہاں ممی کی کوئی تصویر نہیں تھی‘ صرف سامنے والی دیوار پر عطیہ بیگم کی شادی کی بڑی سی رنگین تصویر لگی تھی‘ یقیناً عطیہ بیگم نے ہی سب تصویریں اتار دی ہوں گی۔

اس کا دل چاہا‘ وہ چیخ چیخ کر روئے۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا اور پھر اپنے بیڈ پر گر کر وہ رونے کی کوشش کرتا رہا‘ لیکن آنسو نہ جانے کہاں چلے گئے تھے، جب وہ رو نہ سکا‘ تو اس کی آنکھیں جلنے لگیں اور اندر آگ سی دہک اٹھی اور سارا بدن جلنے لگا۔

رضوان حیدر آفس سے آئے‘ تو اسے بے وقت سوتے دیکھ کر اس کی پیشانی چھوئی تو حرارت محسوس ہوئی۔ اسے بخار تھا۔ تھرما میٹر لگا کر دیکھا تو سو ٹمپریچر تھا۔ پریشانی کی کوئی بات نہ تھی‘ مگر پھر بھی وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ لیکن یہ بخار تو اس کی جان سے ہی چمٹ گیا تھا‘ جب بھی وہ چیک کرتے اسے ننانوے یا ٹمپریچر ہوتا‘ انہوں نے دواؤں کے ڈھیر لگا دیئے‘ وہ خود اسے اپنے ہاتھوں سے دوا کھلاتے تھے‘ مگر کبھی انہیں یاد نہ رہتا‘ تو وہ آفس سے فون کرتے اور عطیہ بیگم اسے دوا دیتیں‘ تو وہ ان کی نظر بچا کر پھینک دیتا۔

انہوں نے شہر کے بڑے بڑے ڈاکٹروں کو دکھایا اور آخر میں چائلڈ اسپیشلسٹ ڈاکٹر عظمیٰ کے پاس لے گئے۔

’’فکر کی کوئی بات نہیں‘ آپ کا بیٹا بالکل صحت مند ہے۔‘‘ پھر تنہائی میں انہوں نے اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد پوچھا کہ۔

’’بیٹا! آپ کیا چاہتے ہیں؟۔‘‘

’’میں اپنی ممی کے پاس رہنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’کیا آپ کی ممی آپ کے پاس نہیں رہتیں۔‘‘

’’نہیں‘ وہ اللہ میاں کے پاس چلی گئی ہیں۔‘‘

’’اوہ!۔‘‘ ڈاکٹر عظمیٰ کو دُکھ سا ہوا اور انہوں نے رضوان حیدر کو سمجھایا۔

’’آپ کا بیٹا صحت مند ہے‘ اسے کوئی بیماری نہیں‘ آپ اسے کسی بھرے پرے گھر میں رکھیں‘ جہاں یہ خوش رہے۔‘‘

تب واپسی پر انہوں نے دل پر جبر کرتے ہوئے‘ اس سے پوچھا کہ کیا وہ نانو کے پاس جا کر رہنا چاہتا ہے‘ تو اس نے خوفزدہ ہو کر کہا۔ ’’نہیں!‘‘

"کچھ دنوں کے لئے چلے جاؤ پھر آ جانا۔"

"نہیں۔" وہ چیخنے لگا۔ "مجھے وہاں مت بھیجیں' آنٹی مجھے مارتی ہیں۔ وہ میرا گلا دبا دیں گی۔ شیر کے آگے پھینک دیں گی۔"

"اچھا' اچھا۔" وہ اسے پیار سے تھپکنے لگے۔ "ہم اپنے بیٹے کو وہاں نہیں بھیجیں گے مگر ان کا دماغ کھول اٹھا تھا' اس روز واپس آ کر انہوں نے فون پر صفدر مرزا کو خط سنائیں اور صفدر مرزا چپ چاپ سنتے رہے، کہ انہوں نے کچھ غلط بھی نہیں کہا تھا۔

وہ اپنی دنیا میں مگن ہو گیا تھا۔ اس کی حرکتوں کی وجہ سے عطیہ بیگم نے اسے مکمل طور نظر انداز کر دیا تھا اور اسے ان کی کہی ہوئی بات کی نفی کر کے انجانی سی خوشی ہوتی تھی؛ ذرا سی دیر کے لئے وہ پریشان ہوتیں تو اندر ہی اندر وہ خوش ہو جاتا۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس کے اور رضوان حیدر کے درمیان بھی فاصلہ بڑھ گیا تھا' لیکن وہ اور عطیہ بیگم ندی کے دو کناروں کی طرح بالکل الگ الگ کھڑے ہو گئے تھے۔ اب تو عطیہ بیگم اس پر ذرا بھی توجہ نہ دیتی تھیں' نہ کبھی اس کے لئے بازار سے لاتیں، نہ کبھی اپنی نگرانی میں اس کے کمرے کی صفائی کرواتیں' نہ کبھی اس سے اسکول رپورٹس وغیرہ کا کچھ پوچھا۔ نہ کبھی ہوم ورک کرنے کے لئے کہا' کریم بخش نے خود بخود اس کی ساری ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں۔ اس کا یونیفارم تیار کرتا' جوتے پالش کرتا اور اسے تیار ہونے میں مدد دیتا۔

صفدر مرزا کبھی کبھی اس سے اسکول ملنے آیا کرتے تھے۔ لیکن نہ انہوں نے خود اسے چلنے کے لئے کہا اور نہ کبھی اس نے نانو سے ملنے کی خواہش ظاہر کی' بس وہ اس سے ملنے آتے اور ہمیشہ پڑھنے اور اچھا بچہ بننے کی تلقین کرتے۔ وہ پڑھائی میں اب بھی اچھا تھا' بلکہ اس کا تعلیمی ریکارڈ پہلے کی نسبت زیادہ اچھا ہو گیا تھا اور حسب معمول اس بار بھی اس نے فرسٹ پوزیشن ہی لی تھی۔ وہ بہت خوش خوش گھر آیا تھا' لیکن گھر میں سناٹا تھا۔ کریم بخش نے اسے بتایا کہ اس کے پپا اس کی ممی کو ہاسپٹل لے کر گئے ہیں۔ آپ کے لئے بھائی یا بہن لینے۔"

"ممی بھی تو بہن لینے گئی تھیں' مگر پھر واپس ہی نہیں آئیں۔" اس نے سوچا اور افسردہ ہو گیا۔

"کیا نئی ممی بھی اب واپس نہیں آئیں گی؟"

اور اس کا دل کانپ اٹھا۔

"نہیں!"

اس نے چاروں طرف دیکھا' گھر ایک دم سونا سونا لگ رہا تھا' ممی نے آج تک اسے ڈانٹا نہیں تھا۔ پپا سے شکایتیں نہیں کی تھیں۔ نانو جھوٹ بولتی تھیں' نئی ممی اچھی ہیں۔ اس نے دل ہی دل میں اعتراف کیا۔

"خدا کرے نئی ممی جلدی سے گھر آ جائیں' تو میں ان کی ہر بات مانوں گا' ان کو بالکل تنگ نہیں کروں گا۔"

جانے کہاں سے اس کے اندر محبتوں کے سوتے پھوٹ پڑے تھے۔ وہ جتنے دن ہاسپٹل رہیں۔ وہ بہت مضطرب اور بے چین رہا اور دل ہی دل میں خدا سے دعا مانگتا رہا کہ وہ جلدی سے گھر لوٹ آئیں۔ یوں لگتا تھا' جیسے اس کے اندر لگے سارے جالے اتر گئے تھے۔ سارا اندھیرا دور ہو گیا تھا' وہ ایک دم بہت خوش نظر آنے لگا تھا اور پپا کے ساتھ اپنی چھوٹی سی بہن کو دیکھنے ہاسپٹل گیا تھا اور کتنی ہی دیر تک اس کے پنگھوڑے کے پاس کھڑے ہو کر اس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں اور چھوٹا سا منہ دیکھتا رہا تھا' بڑی حیرت اور خوشی سے۔ وہ اسے بہت اچھی لگی تھی اور اس روز اس نے بڑے سلیقے سے ممی کو سلام بھی کیا تھا اور پھر جس روز ممی گھر آئی تھیں' اس نے پاپا سے کہہ کر ان کے بیڈ روم میں پھول سجائے تھے اور کتنی ہی دیر تک ان کے بیڈ روم میں ان کے ارد گرد منڈلاتا رہا تھا۔ مگر انہوں نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں تھا اور نہ ہی اس سے کوئی بات کی تھی۔ پھر بھی وہ ان کے چھوٹے چھوٹے کام کر کے خوشی محسوس کرتا رہا۔ کبھی نیپکن پکڑا دیا۔ کبھی فیڈر اور کبھی کچھ۔

ہولے ہولے وہ ٹھیک ہو گئیں اور بستر سے اٹھ گئیں۔ لیکن وہ ان کے گرد اسی طرح چکراتا رہا' اب وہ کھانا کھانے بیٹھتا تو اس کا دل چاہتا ممی اسے کھانا کھانے کے لئے کہیں۔ اس کی پلیٹ میں کھانا ڈالیں' مگر ممی نے کبھی کچھ نہ کہا۔ البتہ اسے خاموش بیٹھے دیکھ کر رضوان حیدر کبھی کبھی اس کی پلیٹ میں کھانا ڈال دیتے۔

"کھاؤ نا بیٹے! چپ کیوں بیٹھے ہو؟"۔

کئی بار وہ یونہی میلا یونیفارم پہن کر اسکول چلا گیا۔ کہ ممی اسے ٹوکیں گی' مگر عطیہ بیگم تو شاید اب اس کی طرف دیکھتی ہی نہیں تھیں اور نہ ہی بلا ضرورت اس سے کوئی بات کرتی

تھیں۔ ایک بار پھر مکڑی نے اس کے اندر جالے بنانے شروع کر دیے تھے' ایک بار پھر اس کے اندر اندھیرا ہونے لگا' لیکن اب فرحی کی ذات اس اندھیرے میں روشنی کا ذریعہ بن گئی تھی۔

وہ اسکول سے آتے ہی اس کے ساتھ مشغول ہو جاتا' کبھی اس کے ننھے ننھے ہاتھوں کو ہاتھ میں لیتا۔ کبھی اسے گدگدا کر ہنساتا۔ کبھی گود میں لے کر بیٹھ جاتا' وہ بھی اس کے ساتھ خوش ہوتی تھی۔ اب وہ عطیہ بیگم کے رویے کا عادی ہو گیا تھا اور اس نے خود کو بہت حد تک ایڈجسٹ کر لیا تھا' زندگی کے دو ہی محور رہ گئے تھے' پڑھائی اور فرحی اب تو وہ اس کی انگلی پکڑ کر اسے لان میں لاتا اور اسکول کی ساری باتیں ہولے ہولے اس سے کرتا رہتا کہ آج یہ ہوا آج مسز ہیلن نے یہ کہا' مدر ٹریسا بہت غصے میں تھیں' وغیرہ وغیرہ۔

ممی ایک بار پھر ہاسپٹل چلی گئیں اور جب واپس آئیں تو ان کی گود میں ثوبی تھی ابھی وہ ثوبی کی آمد پر پوری طرح خوش بھی نہیں ہو سکا تھا کہ ایک روز جب وہ اسکول سے واپس آیا' تو اس کے کمرے میں فرحی کی کاٹ پڑی تھی۔ ٹیبل پر فرحی کے کھلونے تھے اور اس کا سامان کہیں نہیں تھا۔ کریم بخش نے اسے بتایا کہ اس کا کمرہ فرحی کو دے دیا گیا ہے' کیونکہ یہ ممی کے بیڈ روم سے ملحق ہے اور اسے سب سے آخر والا بیڈ روم ملا تھا۔

یہ کمرہ اس کا تھا' بچپن سے جب ممی زندہ تھیں' تب سے اور اب بغیر اس سے پوچھے بغیر بتائے اس کا کمرہ فرحی کو دے دیا گیا تھا۔ اگر ممی اس سے پوچھتیں تو کیا وہ خود ہی اپنا کمرہ فرحی کے لئے خالی نہ کر دیتا' مگر وہ اس کی اپنی ممی تو نہیں تھیں' جو اس سے پوچھتیں' وہ فرحی اور ثوبی کی ممی تھیں' اس کا تو کوئی بھی نہیں تھا' حتیٰ کہ پاپا بھی اب اس کے نہیں تھے۔ وہ بھی اب صرف فرحی اور ثوبی کے پاپا تھے۔

اس روز اس نے فرحی سے بھی بات نہیں کی' جو برآمدے میں چاروں طرف اسی کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا آیا اور چپ بیٹھے بیٹھے اس کا ذہن کھولنے لگا۔ تو اس نے بیڈ کی چادر' تکیے سب کمرے کے وسط میں پھینک دیئے' کھلونے توڑ دیئے' کتابیں اٹھا اٹھا کر پھینکیں' مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ اندر پھیلتا اندھیرا کم ہونے کے بجائے بڑھتا گیا اور ہولے ہولے وہ فرحی سے بھی متنفر ہو گیا۔

ایک بار پھر وہ اکیلا اور تنہا تھا۔ صرف صفدر ماموں تھے' جو کبھی کبھی اس تنہائی میں روشنی

کی کرن بن کر آتے اور پھر اندھیرا کر کے چلے جاتے' کبھی کبھی وہ گھنٹوں اسکول کے گیٹ پر ان کا انتظار کرتا اور وہ نہ آتے تو اندھیرا اور گہرا ہو جاتا' گھر آ کر غصے میں وہ کوئی نہ کوئی ایسی حرکت کرتا' جس پر عطیہ بیگم تلملا جاتیں اور انہیں تلملاتے دیکھ کر اس کے اندر سکون اتر آتا۔

صفدر ماموں بہت دنوں سے نہیں آئے تھے۔ شاید وہ بھی اسے بھول گئے ہیں' گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے اس نے افسردگی سے سوچا' ورنہ پہلے تو ہر ہفتے اس سے ملنے آتے تھے۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ ڈرائیور اسے لینے آیا یا نہیں کہ صفدر ماموں کا ڈرائیور اسے پکارتا ہوا قریب آ گیا۔

''صفدر ماموں کہاں ہیں؟''

اس نے بے چینی سے پوچھا۔

''وہ بہت دنوں سے بیمار ہیں اور ہاسپٹل میں ہیں۔ آپ کو بلایا ہے۔''

''اوہ!'' وہ پریشان ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

ہاسپٹل میں نصرت جہاں کے علاوہ نانو بھی تھیں' کتنی کمزور اور بوڑھی ہو گئی تھیں۔ اس نے پورے آٹھ سال بعد انہیں دیکھا تھا' وہ تو اسے پہچان ہی نہ سکی تھیں اور جب انہیں پتا چلا کہ وہ فرہاج ہے' تو انہوں نے بے اختیار اسے اپنے کمزور بازوؤں میں بھینچ لیا۔

''ارے بوڑھی نانو کو بھلا دیا تو نے'' وہ بے تحاشا اسے چوم رہی تھیں اور رو رہی تھیں۔

وہ شرمندہ ہو گیا۔

کیسی خوشبو اٹھ رہی تھی' ان کے پاس سے۔ مدھم مدھم جیسے ماں کے وجود کی خوشبو' وہ کتنی ہی دیر تک یوں ہی ان کے سینے پر سر رکھے رہا۔

صفدر مرزا نے حسرت سے اسے دیکھتے ہوئے نصرت جہاں سے شکوہ کیا' جو حیرت سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

''اگر آپ نے اس وقت اپنا دامن نہ سمیٹ لیا ہوتا تو آج میں کتنا مضبوط ہوتا اور میرے بعد آپ بھی بے سہارا نہ ہوتیں۔ یہ خوبصورت وجیہ لڑکا آپ کا سہارا ہوتا۔''

''ماموں جان!'' اس نے بے اختیار ان کے ہاتھ تھام لیے۔

''میں اب بھی آپ کا بیٹا ہوں۔''

اس کی آنکھوں کی سطح پر نمی پھیل گئی' لیکن وہ مسکراتا رہا۔

"آپ کیوں گھبراتے ہیں ماموں جان! آپ ٹھیک ہو جائیں گے اور میں بھی اب
نہیں ہوں' دسویں جماعت میں پڑھتا ہوں' آپ سے اور نانو سے روز ملنے آیا کروں گا۔"

اتنے سالوں بعد نانو سے مل کر اور ان کی محبت کی شدت محسوس کر کے اس کا سینہ گر
لگا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ نانو کی گود میں سر رکھ کر بہت سا رو لے اور انہیں ان آٹھ سالو
تنہائی کے ایک ایک لمحے کی کہانی سنائے۔ انہیں بتائے کہ وہ بہت اکیلا بہت تنہا ہو گیا ہے
لیکن وہ نانو کو تسلی دیتا رہا' جو بار بار اس کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگاتی تھیں
جھولی پھیلا کر صفدر مرزا کی زندگی کی دعا مانگتی تھیں۔

"اللہ مجھ بوڑھی کو کوئی اور دُکھ نہ دکھانا۔"

نانو سے مل کر اسے یوں لگا تھا' جیسے وہ ایک بوجھ سا جو اس کے سینے پر دھرا تھا' ہو
ہولے سرک رہا ہو۔

وہ تقریباً روز ہی ہاسپٹل جاتا تھا اور گھنٹوں صفدر ماموں سے بیٹھ کر باتیں کرتا ر
ہمیشہ کی طرح وہ اسے سمجھاتے اس سے وعدہ لیتے کہ وہ دل لگا کر پڑھے گا اور کبھی راستے
بھٹکے گا نہیں۔ وہ اس سے کہتے کہ عطیہ بیگم کو ستایا نہ کرو' رضوان حیدر کی بات مانا کرو'
اور ٹوبی تمہاری چھوٹی بہنیں ہیں اور بہنوں کے بڑے حقوق ہوتے ہیں' ان کا خیال رکھا کرو
اور اب صفدر مرزا کی باتیں اس کے دل پر اثر انداز ہو رہی تھیں۔ شاید یہ نانو کی قر
کا اثر تھا یا پھر وہ خود ہی سمجھدار ہو گیا تھا کہ اس کے دل پر جمی سرد مہری کی برف ہولے ہو
پگھل رہی تھی' مگر نانو نے جن کے پاس سے اسے ماں کی محبت کی مہک آتی تھی' ایک
چپکے سے آنکھیں بند کر لیں۔ نہ بیمار ہوئیں نہ کچھ' بس نصرت جہاں صبح اٹھانے گئیں تو وہ ا
مالک حقیقی کے پاس پہنچ گئی تھیں۔ شاید اللہ تعالیٰ نے ان کی دعائیں سن لی تھیں کہ کوئی
گھڑی دیکھنے سے پہلے ہی انہیں دنیا سے اٹھا لے۔

صفدر مرزا انتہائی نگہداشت کے شعبے میں تھے۔ اس لیے انہیں نانو کی موت کے بار
میں بتایا نہیں گیا اور جب انہیں انتہائی نگہداشت کے شعبے سے نکال کر دوبارہ اپنے کمر
میں بھیج دیا گیا۔ تب بھی ان سے نانو کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ فرہاج اب بھی انتہا
باقاعدگی سے دیکھنے آتا۔ اس روز ان کی طبیعت کچھ بہتر تھی اور وہ تکیے کے سہارے ٹیک
لگائے بیٹھے تھے۔ فرہاج انہیں جوس پلا رہا تھا اور نصرت جہاں قریب ہی کرسی بچھائے بیٹھ

تھیں' یکا یک انہوں نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

"کیا ہوا ماموں جان!......؟"

"کچھ نہیں۔" وہ مسکرائے۔

"ماموں جان! آپ باہر کیوں نہیں چلے جاتے۔"

"کیا کروں گا جا کر بیٹے! اب اندر کچھ نہیں بچا۔ تیسری بار اٹیک ہوا ہے' ڈاکٹر تو خود
حیران ہیں کہ بچ کیسے گیا ہوں۔ شاید تمہارے لیے' بس ایک ہی تمنا ہے کہ تمہیں زندگی میں
کسی مقام پر دیکھوں۔ تمہارا ایک گھر ہو' جہاں تم اپنی بیوی بچوں کے ساتھ خوش وخرم اور نارمل
زندگی بسر کر سکو۔"

اس کا رنگ سُرخ پڑ گیا اور اس نے یوں ہی بچوں جیسی بات کی۔

"ماموں جان! آپ کو آخر ہارٹ اٹیک کیوں ہوا ہے۔"

انہوں نے نصرت جہاں کی طرف دیکھا۔

"اس عورت نے میرے دل کو چھلنی کر دیا ہے۔ کچھ بھی نہیں بچا اب اس میں۔"

وہ جانے کس کیفیت میں تھے' نصرت جہاں گھبرا کر ان کے قریب چلی آئیں۔

"کیا بات ہے؟ ڈاکٹر کو بلاؤں۔"

انہوں نے زخمی نظروں سے انہیں دیکھا۔

"شاید میں کچھ مدت اور زندہ رہتا' مگر تم نے وقت سے پہلے مجھے مار دیا ہے۔"

ان کے ہاتھوں میں جوس کا کپ کانپ گیا تو فرہاج نے جلدی سے پکڑ کر میز پر رکھ دیا
اور کھڑا ہو گیا۔

"میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔"

"نہیں!" انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کرنا چاہا' مگر ان کا ہاتھ نیچے گر گیا
اور ان میں روح کا ناتا جسم سے ٹوٹ گیا۔ تھوڑی دیر تو وہ یونہی ساکت کھڑا رہا' پھر اس نے
نم آلود نظروں سے نصرت جہاں کی طرف دیکھا اور اس کے اندر آگ بھڑک اٹھی نفرت' دشمنی'
غصہ اور غم کی آگ پھر اس آگ کے شعلے سارے وجود میں پھیل گئے اور پھیلتے پھیلتے آتش
فشاں بن گئے۔

* * *

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ماریہ نے ڈائری بند کر کے چپکے سے اسے دیکھا۔

دواؤں کے زیر اثر وہ نیند میں تھا۔ اس کے سیاہ بال اس کی کشادہ پیشانی پر بکھ
تھے۔ گزری ہوئی رتوں کے جبر کی ساری کہانیاں، زندگی کی محرومیوں، تنہائیوں اور صعو
کے سارے فسانے اس کے چہرے پر رقم تھے، جو بتا رہے تھے کہ اس شخص نے درد کے
سے جام پیئے ہیں، برسوں آبلہ پا تپتی زمین پر ننگے پاؤں چلا ہے۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور ہتھیلیوں کی پشت سے اپنی آنکھوں کو صاف
جو آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

اس کا تحریر کردہ ایک ایک لفظ نوکیلے تیروں کی طرح اس کی روح میں پیوست
تھا۔

"مجھے...... مجھے تو خبر ہی نہیں تھی، فرہاج حیدر! کہ تم اندر سے اتنے تنہا، اتنے
ہو گے، میں تو سمجھ رہی تھی کہ بس ایک ذرا سی محرومی نے تمہیں نارمل نہیں رہنے دیا۔"

وہ ابھی تک اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"مگر تم تو بڑی کڑی منزلوں سے گزرے ہو، فرہاج حیدر! کاش میں تمہارے چ
سے ان کڑی مسافتوں کی ساری دھول دھو سکتی۔ تمہاری آنکھوں میں خوشیوں کے وہ رنگ
سکتی، جو سات سال کی عمر میں تم سے بچھڑ گئے تھے۔"

فرہاج نے کراہ کر کروٹ بدلی تو وہ چونکی اور جھک کر اس کی پیشانی کو چھوا۔

اب بخار قدرے کم تھا۔ ورنہ پچھلے تین دن سے تو وہ بے سدھ پڑا تھا اور یہ تین
سب نے اس کے سرہانے بیٹھ کر کاٹ دیئے تھے۔ جب بھی اس کی آنکھ کھلتی اور سوئی
کیفیت میں وہ کسی کو سر پر پٹیاں رکھتے، کسی کو دوا پلاتے اور سر دباتے دیکھتا تو جھلا
بار اس نے سب کو جانے کے لئے کہا تھا۔ زور زور سے چلایا تھا اور پھر بے ہوش ہو گیا۔
نے بھی سب کے ساتھ مل کر چپکے چپکے اس کی زندگی کی دعائیں مانگی تھیں۔ وہ جو اس
نہیں تھا، مگر پتا نہیں کیوں اس کے لئے اس کا دل دُکھتا تھا۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی فرحی نے اسے بتایا تھا کہ وہ خطرے سے باہر ہے اور ا
زبردستی سب کو آرام کرنے کے لئے بھیج دیا تھا اور خود اس کی اِدھر اُدھر بکھری ہوئی چ
اکٹھا کرنے لگی تھی اور کمرے کی صفائی کرتے ہوئے ہی الماری کے نیچے سے اسے یہ

لی تھی، جس نے فرہاج حیدر کی زندگی کے ایک ایک لمحے کو اس پر عیاں کر دیا تھا۔

تین دن پہلے رات کا کھانا کھانے کے لئے جب وہ فرحی کے ساتھ اپنے کمرے سے
باہر نکلی تھی تو کریم بخش نے گھبرائے گھبرائے آ کر بتایا تھا کہ وہ اپنے کمرے میں بے ہوش پڑا
ہے۔ رضوان حیدر کا رنگ یک دم سفید پڑ گیا تھا اور اس کے اپنے جسم سے جیسے جان نکل گئی
تھی۔

"کہیں...... کہیں اس نے۔"

دونوں نے بیک وقت ایک ہی بات سوچی تھی اور بھاگتے ہوئے اس کے کمرے میں
آئے تھے۔ وہ اپنے بیڈ پر ترچھا لیٹا تھا اور اس کے پاؤں زمین پر لگ رہے تھے اور بدن بخار
میں جل رہا تھا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔ بخار بہت تیز تھا۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ اگر بخار
صبح تک کم ہو گیا تو پھر وہ خطرے سے باہر ہوگا۔

رضوان حیدر کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ لاکھ وہ اس سے بے پروا رہے تھے، اس
کے روّیے نے فاصلے پیدا کر دیئے تھے، لیکن تھا تو وہ ان کا اکلوتا بیٹا۔ ان کے بڑھاپے کا
سہارا۔

"بعض اوقات لوگ انجانے میں دوسروں پر ظلم کر جاتے ہیں، جیسے آنٹی نے فرہاج پر
کیا۔"

اس نے دل گرفتگی سے سوچا اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی ڈائری ٹیبل پر رکھ دی۔ تب ہی
ڈبی نے اندر جھانکا۔

"بھیا جاگ گئے؟"

"نہیں مگر تم اتنی جلدی اٹھ گئیں۔"

"ہاں مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ ممی اور فرحی سو رہے ہیں۔"

"تم نے بھی سو لینا تھا۔"

"آپ جا کر سو جائیں۔ میں بھیا کے پاس بیٹھتی ہوں۔"

"نہیں! میں نے تو رات پوری نیند لے لی تھی۔"

تب ہی فرہاج نے آنکھیں کھول دیں اور اسے بیٹھے دیکھ کر اندر ہی اندر نادم ہو گیا۔
اس سے پہلے بھی تو وہ کئی بار بیمار پڑا تھا، لیکن کسی نے کبھی اس کی یوں تیمارداری نہیں کی تھی تو

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

کیا یہ سب کچھ اس کی وجہ سے تھا' اس پیاری سی دلکش لڑکی کی وجہ سے جو خواہ مخواہ ہی اس
مہربان تھی اور وہ اس کی مہربانیوں سے دامن بچاتا پھرتا تھا' بھاگتا پھرتا تھا اس سے اور جا
کبھی اس کا سامنا ہو جاتا تو سارا غصہ اس پر نکال دیتا اور اب بھی وہ لبوں پر نرم اور مہربا
مسکراہٹ لیے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے ممنون نظروں سے اسے دیکھا۔

"اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" ثوبی نے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں' تم لوگ جاؤ اب' شاید میری طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی۔"

"جی بھیا!" ثوبی اس کے یوں نرمی سے بولنے پر خوش ہو گئی۔

"آپ کو بہت تیز بخار تھا۔ تقریباً تین دن سے آپ نیم بے ہوشی کی سی کیفیت میں
تھے۔"

اسے یاد آیا کہ اس روز اس کی طبیعت بہت بے چین تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ کسی
سے لڑے جھگڑے اور کچھ نہیں تو دیواروں پر ہی مکے برسائے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا
کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ بس یوں لگ رہا تھا' جیسے کوئی اس کے دل کو مسل رہا ہو اور اسی کیفیت
میں وہ ناشتا کیے بغیر آفس چلا گیا تھا اور جب آفس سے اٹھا تو سر بوجھل ہو رہا تھا' لیکن پھر
بھی وہ بہت دیر تک چپٹی ناک والی لڑکی کے ساتھ ساحل سمندر پر گھومتا رہا اور جب گھر آیا
جوتوں سمیت ہی بیڈ پر گر پڑا تھا' دو تین بار اس نے کریم بخش کو آواز دینے کی کوشش کی تھی
لیکن آواز حلق سے نہیں نکلی تھی' پھر کیا ہوا تھا۔ کیسے سب کو خبر ہوئی تھی۔ اسے کچھ علم نہیں تھا۔

"آپ نے تو ہمیں ڈرا ہی دیا تھا۔"

ماریہ نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔ تو وہ چونک پڑا اور کہنی کا سہارا لیتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔

"میں آپ کے لئے دودھ گرم کر کے لاتی ہوں۔" ثوبی مڑی۔

"رہنے دو۔ بابا کو کہہ دو لے آئے گا۔" اس نے آہستگی سے کہا۔ لیکن ثوبی جا چکی تھی۔

"آپ محبتوں سے اتنا بھاگتے کیوں ہیں؟"

"محبتیں۔" اس نے سوالیہ نظروں سے ماریہ کی طرف دیکھا اور پلنگ کی پشت سے
سر ٹیک لیا۔

"یہ لفظ میرے لیے اجنبی ہے۔ مجھ سے تو آپ نفرتوں کی باتیں کریں' میرا دامن ان
ہی کانٹوں سے بھرا ہوا ہے۔"

اس نے سوچا اور نقاہت سے آنکھیں بند کر لیں۔

"ہاں محبتیں!"

ماریہ نے اپنی بات دہرائی۔

"ان سب کی محبتیں جو آپ کے اپنے ہیں۔" فرہاج نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

ماریہ کی پلکیں جھک گئیں اور رخساروں پر سرخی دوڑ گئی۔ مگر وہ یوں ہی اسے دیکھتا رہا۔ اس کے
اندر عجیب سی ٹوٹ پھوٹ اور شکست و ریخت ہو رہی تھی۔ ذرا سی دیر کو اس کا جی چاہا۔

کہ اپنا آپ اس کے سامنے کھول کر رکھ دے۔ اپنے سینے کے سارے زخم اور پاؤں
کے سارے چھالے اسے دکھائے اور پھر پوچھے اب بتاؤ کیا میں نفرت کرنے میں حق بجانب
نہیں ہوں' کیا یہ میرا حق نہیں ہے کہ میں ان سب سے نفرت کروں جنہوں نے سوائے
محرومیوں کے مجھے کچھ نہیں دیا' مگر دوسرے ہی لمحے اس کا دل چاہا کہ وہ اس سے التجا کرے
کہ اگر تم اتنی مہربان ہو تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دو میں ان مہربانیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا
اور یہ کہ اتنی بے نیازیوں کے بعد اب یہ توجہ مجھے اندر سے اور توڑ رہی ہے اور میں خود سے
لڑتے لڑتے تھک گیا ہوں۔"

"آپ کو یقین کیوں نہیں آتا۔"

ماریہ نے اپنی بوجھل پلکیں اٹھائیں۔

"سب آپ کو چاہتے ہیں' آپ سے محبت کرتے ہیں' فرحی' ثوبی' انکل۔"

"نہیں ہے' مجھے کسی پر یقین۔" وہ ایک دم ہی چیخ پڑا۔

"کیوں آپ میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی ہیں' نہیں کرنا مجھے کسی کا یقین۔"

وہ پھر اپنے خول میں سمٹ گیا تھا' ماریہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔

"پلیز! آپ چلی جائیں' یہاں سے اور بابا کو بھیج دیں۔"

اس نے پھر اپنی آواز نرم کر لی اور التجا کی۔

"آپ اپنے ذہن پر بوجھ نہ ڈالیں' میں جا رہی ہوں۔" مگر وہ جاتے جاتے پلٹی۔

"یہ محبتیں جو بانہیں پھیلائے آپ کی منتظر ہیں' انہیں اپنے دامن میں سمیٹ لیجئے۔ مت
ٹھکرائیے انہیں' ایسا نہ ہو کہ کبھی آپ ان کی تمنا کریں اور یہ آپ سے دور ہوں۔"

وہ کتنی ہی دیر تک الجھا الجھا سا بیٹھا اس کے آخری جملے پر غور کرتا رہا اور تھک کر اس

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

نے اپنا سر تکیے پر رکھ دیا۔

اس کا بخار تو اتر گیا تھا' لیکن کمزوری بہت تھی۔ زیادہ تر وہ اپنے بیڈ پر ہی پڑا رہتا۔ ا
دن کے بعد ماریہ پھر اس کے کمرے میں نہیں آئی تھی۔ البتہ باقی لوگ ایک دو بار ضرور اس
حال دریافت کرنے آتے۔ رضوان حیدر' علیہ بیگم' فرحی' ثوبی سب اور جب تک وہ اس
کمرے میں بیٹھے رہتے' وہ آنکھیں بند کیے پڑا رہتا' پتا نہیں کیوں کسی سے بھی بات کرنے
اس کا جی نہیں چاہتا تھا۔ کبھی کبھی اسے لگتا جیسے اس کے اندر پھیلی دھند کم ہو گئی ہو اور کبھی یو
محسوس ہوتا' جیسے یہ دھند پہلے سے بھی زیادہ دبیز ہو گئی ہو۔

اتنی دبیز کہ سب کے چہرے چھپ گئے ہوں۔ ایسے میں اس کا دل چاہتا سب کچھ
چھوڑ کر چلا جائے۔ کہیں دور جہاں ماضی کی کوئی ایک یاد بھی پاس نہ ہو۔

• • •

اس وقت بھی وہ کتاب سامنے رکھے سوچ رہا تھا کہ اسے اب یہاں سے چلے ہی جا
چاہیے کہ یکایک باہر ثوبی اور فرحی کے زور زور سے رونے اور چیخنے کی آوازیں آئیں اور
گھبرا کر ننگے پاؤں باہر نکل آیا اور سامنے سے آتے ہوئے کریم بخش نے اسے دیکھتے ہی رو
شروع کر دیا۔

"صاحب کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ ابھی ابھی کسی نے فون کیا ہے کہ وہ......"

"نہیں......!"

وہ لڑکھڑا گیا! اسے لگا جیسے کسی نے اس کا دل سینے سے نوچ لیا ہو' اندر کہرام مچا ہوا تھا
فرحی' ثوبی اور ممی کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"ابو چلے گئے۔"

ثوبی اسے دیکھتے ہی اس کے گلے آ لگی۔ اس نے بے اختیار دونوں کو اپنے بازوؤں
کے گھیرے میں لے لیا۔

علیہ بیگم' پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ وہ تھوڑی دیر تک انہیں بازوؤں میں لیے روتا رہا۔ پھر
علیہ بیگم کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ جو بے حال ہو رہی تھیں۔

"ممی...... ممی...... پلیز! حوصلہ رکھیں۔ آپ ہمت ہار گئیں تو ان کو کون سنبھالے گا۔"

اس نے روتی ہوئی فرحی اور ثوبی کی طرف اشارہ کیا' مگر علیہ بیگم روئے چلی گئیں۔

"ہائے رضوان! کون ہمارا سہارا بنے گا۔ ابھی تو تمہیں بیٹیوں کو بھی رخصت کرنا تھا۔
اب کون ان کے سروں پر ہاتھ دھرے گا۔"

"ممی......!"

اس نے تڑپ کر ایک بار پھر تینوں کو ایک ساتھ اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا۔

"میں جو ہوں ممی! آپ کا بیٹا ان کا سہارا۔"

"میرا بیٹا!" ممی نے کہا تو وہ ان کے سینے سے لگ کر بلکنے لگا۔

تب ہی خود پر قابو پاتے بڑے حوصلے سے کسی سے فون پر بات کرتی ہوئی ماریہ وہیں
سے چیخی۔

"آنٹی...... آنٹی...... انکل زندہ ہیں' وہ زخمی ہیں صرف' انہیں ہوش آ گیا ہے۔" ممی اور
ثوبی کو چھوڑ کر وہ فون کی طرف لپکا۔

حادثہ ہولناک تھا' مگر خدا نے رضوان حیدر کو زندگی دی تھی۔ اطلاع دینے والے کو غلط
فہمی ہوئی تھی' ہلاک ہونے والے رضوان حیدر نہیں' بلکہ ٹکر مارنے والی ویگن کا ڈرائیور تھا۔ چند
دنوں بعد وہ ہاسپٹل سے گھر آ گئے۔ خدا نے جہاں انہیں نئی زندگی دی تھی' وہاں فرہاج حیدر کی
زندگی میں بھی انقلاب آ گیا تھا۔ پہلی بار اس نے علیہ بیگم کو ممی کہہ کر بلایا تھا۔ پہلی بار اس نے
اپنے دل میں ان کے لئے سچی محبت محسوس کی تھی اور اس کے دل پر چھایا غبار چھٹ گیا تھا۔

• • •

اس حادثے کی خبر اس کے آئینے پر آخری ضرب ثابت ہوئی تھی۔ لیکن اب اس کے
دل میں ایک اور درد جاگ اٹھا تھا۔ ماریہ کی محبت کا درد اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ
کیسے اس سے اپنے گزشتہ رویے کی معافی مانگے کیسے اسے بتائے کہ وہ اپنا دل اس کے
قدموں میں ہار گیا ہے۔ مگر جب فرحی نے بتایا کہ ماریہ واپس لاہور جا رہی ہے تو وہ بے چین
ہو گیا۔ بڑے دنوں بعد اس نے اپنی ڈائری اٹھائی اور لکھا۔

"شاید میں بھی جارج برناڈ شا کا رچرڈ ہوں۔ اندر سے نرم دل اور حساس اور میں نفرت
کرنے کے باوجود نفرت نہیں کر سکا' ایک حادثے نے رچرڈ کی طرح مجھ پر بھی میرا اپنا آپ
کھول دیا ہے اور میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے ماریہ احسن سے محبت ہے۔" تب ہی اچانک
اس کی نظر دوسرے صفحے پر پڑی جہاں بڑی خوبصورت لکھائی میں لکھا تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

هوائے نفرت سے اپنے دل کو بچائے رکھنا
اسے محبت کے آبِ زم زم سے سرد رکھنا

فرہاج کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔ یقیناً یہ ماریہ نے ہی لکھا ہوگا۔ ڈائری کھلی چھوڑ کر باہر نکل آیا اور سیدھا فرحی کے کمرے میں آ گیا۔ ماریہ اکیلی اپنے کپڑے بیگ میں رکھ رہی تھی۔

"آپ جا رہی ہیں، مس ماریہ؟"

اس نے قریب جا کر پوچھا، تو ماریہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"جی ہاں.....! میں کل صبح چلی جاؤں گی۔ آپ کو تو بہت خوشی ہو رہی ہو گی میرے جانے سے۔"

"نہیں۔" وہ سٹپٹا گیا۔ "بھلا مجھے کیوں خوشی ہو گی؟"

"کیوں، کیا آپ نہیں چاہتے تھے میں چلی جاؤں۔"

"میں..... میں کیا چاہتا ہوں، ماریہ! کاش میں آپ کو سمجھا سکتا۔"

اس نے ہولے سے کہا۔ مگر ماریہ نے سن لیا اور اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ اٹھی۔

"آپ یہی چاہتے ہیں کہ میں چلی جاؤں اور میں جا رہی ہوں۔"

"نہیں..... میں ایسا نہیں چاہتا ماریہ! بلکہ میں....."

اس نے بے بسی سے ہاتھ ملے۔

"میں اندھیروں میں بھٹک رہا تھا ماریہ!"

وہ وہیں ایک طرف کرسی پر بیٹھ گیا۔

"صفدر ماموں کی موت نے میرے اندر الاؤ جلا دیئے تھے۔ میرا دل چاہتا تھا! اس ساری کائنات کو توڑ پھوڑ کر رکھ دوں، تباہ کر دوں اسے لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا تھا اور تب دوسروں کو دکھ دے کر اذیت پہنچا کر مجھے خوشی ہوتی تھی۔ میں سمجھتا تھا، اپنی محرومیوں کا ازالہ کر رہا ہوں۔ صرف ایک چیز مجھے سکون پہنچاتی تھی اور وہ تھیں میری کتابیں، جن میں کھو کر میں سب کچھ بھول جاتا تھا۔ پھر میں نے تعلیم مکمل کر لی سروس کر لی، مگر پھر بھی میرے اندر دہکتا الاؤ کم نہ ہوا، یہ آگ روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر آپ آ گئیں۔"

ماریہ بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر ٹھوڑی ٹکائے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کی آنکھوں

ایک سلگتا ہوا احساس تھا اور چہرے پر ایک پرسوز کیفیت تھی، جو اسے پگھلائے دے رہی تھی۔

"میں نے بے اعتنائی کے بڑے زخم سہے تھے۔ میں اپنائیت کے جذبوں سے ناآشنا تھا۔ خون کے رشتے میرے نزدیک بے معنی تھے۔ ماریہ احسن! لیکن آپ نے میرے اندر ان رشتوں کی محبتوں کا احساس جگایا۔ آپ نے ماریہ میرے دل پر جمی کائی کو اتارا، آپ میرے لیے سنگ میل ہیں۔ میں بھٹک گیا تھا۔ آپ نے راستہ دکھایا۔ روشنی کا مینار ہیں، میرے لئے آپ، میں آپ کا شکریہ کس طرح ادا کروں۔"

"اوہ!" ماریہ نے چونک کر اسے دیکھا اور اس کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑ گئی۔

"اس میں شکریہ کی کیا بات ہے۔ آپ اندر سے ایسے نہیں تھے، جیسے کہ نظر آنے کی کوشش کرتے تھے۔ میں نے تو بس آپ کو آپ کی پہچان کروائی ہے، یہ محبت تو آپ کے دل میں ہمیشہ سے تھی۔ لیکن آپ خود اس سے بے خبر تھے۔" وہ جھک کر بیگ بند کرنے لگی۔

"تو آپ سچ مچ چلی جائیں گی ماریہ؟" اس کے لہجے میں شکستگی تھی۔

"ظاہر ہے، اپنے گھر تو جانا ہی ہوتا ہے۔"

"آپ رک نہیں سکتیں، میرے لیے، میری خاطر۔"

"آپ کی خاطر......؟"

اس نے پلکیں اٹھائیں، لیکن وہ بوجھل ہو کر جھک گئیں۔ اس کے رخسار گلنار ہو گئے اور دل میں ایک خوشگوار سی دھڑکن جاگ اٹھی۔ وہی دھڑکن جو پہلی بار فرہاج کی تصویر دیکھ کر اس کے دل میں بیدار ہوئی تھی۔

"ہاں میری خاطر!"

وہ اس کے قریب ہی دو زانو بیٹھ گیا۔

"میں نے تم سے اپنی منزل کا نشان پایا ہے، ماریہ! مجھے کہنے دو کہ اگر تم چلی گئیں، تو میں پھر بھٹک نہ جاؤں۔"

"خدا نہ کرے۔"

اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ لیکن اس نے فوراً ہی سر جھکا لیا۔

"تو پھر مت جایئے ماریہ پلیز!"

"لیکن میں کیسے رک سکتی ہوں؟"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"بڑا آسان طریقہ ہے۔"

فری ہنستی ہوئی اندر آ گئی۔

فرہاج اور ماریہ جھینپ گئے۔

"فرہاج بھائی! آپ فوراً ممی' ڈیڈی کے حضور اپنی درخواست پیش کر دیجئے اور باضابطہ طور پر بینڈ باجے کے ساتھ سہرا باندھ کر ماریہ کو لے آیئے کہ ہم بھی اب اپنی اس پیاری سی بھابی کی جدائی برداشت نہیں کر سکتے' جن کی کوشش سے ہمیں اپنا بھائی واپس مل گیا ہے"

"کیوں اجازت ہے۔ میں یہ درخواست پیش کر دوں؟"

فرہاج کے ہونٹوں پر بھی شوخ سی مسکراہٹ آ کر ٹھہر گئی۔

ماریہ کا سر اور بھی جھک گیا۔

اور وہ بڑی محبت اور دلچسپی سے اس کے چہرے پر جگمگاتے رنگوں کو دیکھنے لگا اور اسے یوں لگا' جیسے زندگی بھر کی ساری محرومیوں' ساری صعوبتوں اور سارے دکھوں کا ازالہ ہو ہو۔

● ● ●

اک عمر کی ریاضت

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نا کہ عمر بھر کی ریاضت رائیگاں چلی جاتی ہے اور آدمی سوچتا ہی رہ جاتا ہے کہ یہ کیا ہو گیا اور کیوں ہو گیا۔

میری بھی سالوں کی ریاضت رائیگاں چلی گئی ہے۔ ابلیس نے سالوں اللہ کی عبادت کی تھی اور بس ایک لمحہ میں راندۂ درگاہ ہو گیا۔ بس ایک لمحہ کی لغزش...... ایک لمحہ کی غلطی آدمی کی عمر بھر کی ریاضتوں پر پانی پھیر دیتی ہے۔ میرے ساتھ بھی تو ایسا ہی ہوا ہے۔ بس ایک لمحہ کی لغزش سے کیا کچھ کھو دیا ہے میں نے۔

درشین کی محبت کو' اس کے یقین و اعتماد کو۔

عابی کی محبت و چاہت کو۔

جب وہ آنکھوں میں ڈھیروں شکوے لئے مجھے دیکھتی ہے تو میں اندر سے پانی پانی ہو جاتی ہوں۔ پھر وہ درشین تو نہیں ہے جو خاموش رہتی ہے' جس نے آج تک زبان سے شکوے کا ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ وہ عابی ہے میری اکلوتی بیٹی۔

نانا' باپ اور دادی کی لاڈلی اور جو ہر بات بچپن سے ہی ڈنکے کی چوٹ پر کہنے کی عادی ہے۔ کبھی کبھی شکوہ اس کے لبوں پر آ جاتا ہے۔

"ماما! آپ نے درشین کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ آپ نے بہت ظلم کیا ممّا!"

"عابی......!" میں اس سے کچھ کہنا چاہتی ہوں لیکن وہ تو میری بات سنے بغیر ہی ٹھک ٹھک کرتی درشین کے کمرے کی طرف چلی جاتی ہے اور میں درشین کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھتی رہ جاتی ہوں......

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

اندر سے ان کے پسندیدہ گانوں کی آوازیں عابی کی ہنسی، سرگوشیاں سنتے ہوئے
جلے پاؤں کی بلی کی طرح ٹی وی لاؤنج سے لیونگ اور لیونگ روم سے ٹی وی لاؤنج تک
چکر لگاتی رہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں اب بہت دیر تک ان کے کمرے کا دروازہ نہیں کھلے
عابی جب بھی آتی ہے، اپنے ساتھ اپنے پسندیدہ گانوں کی سی ڈیز ضرور ساتھ لاتی ہے
جب تک سارے گیت ثمین کو سنا نہ لے اسے چین نہیں آتا۔

شادی سے پہلے بھی وہ ایسی ہی تھی اور اب بھی۔ فرق صرف اتنا پڑا ہے کہ پہلے وہ
بھی ثمین کے کمرے میں گھسیٹ لے جاتی تھی لیکن اب وہ مجھے دیکھتی بھی نہیں۔ بعض ا
تو وہ میرے پاس رکتی بھی نہیں۔ میں جانتی ہوں وہ مجھ سے بہت خفا ہے، بہت ناراض
لیکن پھر بھی جب وہ آتی ہے تو میرا جی چاہتا ہے کہ وہ میرے پاس رکے۔ میری با
میں اسے بتاؤں کہ...... لیکن اگر میں سب کچھ اسے بتا بھی دوں تو......

تو کیا گزرے ہوئے لمحے واپس آسکتے ہیں؟

کیا عباس اعوان پھر سے زندہ ہوسکتا ہے؟

"کیا...... در ثمین کے ہونٹوں کی ہنسی واپس آسکتی ہے؟

پھر بھی میں چاہتی ہوں کہ در ثمین مجھے معاف کردے اور عابی مجھ سے خفا نہ رہے۔

کہ ساری زندگی تو میری محبتوں کا محور یہ ہی دونوں رہی ہیں...... در ثمین اور عابی۔

اور میں نے تو کبھی ان دونوں کو تکلیف پہنچانے کا سوچا ہی نہیں پھر......
ہوگیا...... اک ذرا سی لغزش......

ذرا سی انسانی کمزوری۔

اور اس انسانی کمزوری نے مجھے کتنا تنہا کردیا ہے کتنا اکیلا...... یہ اتنا بڑا گھر......
کھانے کو دوڑتا ہے۔ میں صبح سے شام تک بے مقصد پورے گھر میں چکراتی پھرتی ہو
رقیہ نہ صرف گھر کی صفائی ستھرائی کرتی ہے بلکہ کھانا بھی وہی پکاتی ہے۔ دو بندوں کا کا
کتنا ہوتا ہے۔ ثمین تو صبح سویرے ہی ناشتہ کرکے کالج چلی جاتی ہے اور پھر اس کا ناشتہ ا
ہوتا ہے۔

ایک کپ دودھ اور ایک سلائس

"سارا دن ایک سلائس پر کیسے گزارا کرتی ہو ثمو! ٹھیک طرح سے ناشتہ کرو۔

آتے آتے چار تو بج ہی جاتے ہیں۔"

"نہیں آپا! چائے وغیرہ پی لیتے ہیں وہاں۔"

حالانکہ ثمین کو تو شروع سے ہی میرے ہاتھ کے بنے پراٹھوں کا ناشتہ پسند تھا، ہری
مرچوں والے آملیٹ کے ساتھ۔

"دیکھنا ثمو! تم موٹی بھینس ہوجاؤ گی۔ مما کے ہاتھ سے پکے یہ گھی میں تر بتر پراٹھے کھا
کر۔" عابی اسے ڈراتی تھی۔

"کچھ نہیں ہوتا عابی! ارے پھر کہاں آپا کے ہاتھ کے پراٹھے کھانے کو ملیں گے۔"

"کیوں...... کیا آپ کہیں جا رہی ہیں؟"

عابی کا انداز پراسرار ہوجاتا اور ثمین کی آنکھوں میں جگنو اتر آتے۔ وہ سر جھکا کر نوالہ
توڑنے لگتی۔

"ثمو! کیا تمہارے اسکالرشپ کے پیپرز آگئے؟

میرا دل ہول جاتا...... وہ آرٹس کی مزید تعلیم کے لیے باہر جانا چاہ رہی تھی اور میری
سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس کی جدائی کیسے برداشت کروں گی۔"

"نہیں آپا! ابھی تو نہیں، مجھ سے سینئرز بھی ہیں۔ میرے امکانات تو بہت کم ہیں۔"

"ثمو! میں تمہارے بنا کیسے رہوں گی۔"

"جیسے اس کی شادی کے بعد رہیں گی۔ اچھا ہے ریہرسل ہوجائے گی۔" عابی کو تو چپ
رہنا آتا ہی نہ تھا۔

"اور رہی ہماری بات، تو ہم تو کسی ایسے بندے سے شادی کریں گے جو گھر داماد بن کر
رہے گا۔ ٹھیک ہے نا مما!" وہ اٹھ کر میرے گلے میں بانہیں ڈال دیتی۔

"ثمو کو سسرال بھیج کر ہم دونوں ماں بیٹی مزے سے رہیں گے اور ثمو کا کمرہ تو میں لے
لوں گی۔ ہائے کھڑکیوں سے کیسا خوبصورت منظر دکھتا ہے۔ مرگلہ کی پہاڑیاں......"

"خبردار! جو میرے کمرے پر بری نظر ڈالی۔ میں بعد میں بھی تو آیا کروں گی آپا سے
ملنے تو اپنے کمرے میں ہی ٹھہروں گی۔ ہے نا آپا......؟"

وہ میری طرف دیکھتی تو میں مسکرا دیتی۔

"کیوں نہیں، ثمین کا کمرہ ہمیشہ اسی کا رہے گا۔"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

”ایک تو ہماری اماں کا ووٹ بھی ہمارا نہیں ہے۔“

عالی منہ بسورتی‘ مصنوعی ناراضی دکھاتی‘ لیکن میں جانتی تھی کہ وہ درثمین پر اور درثمین اس پر جان چھڑکتی ہے۔

اور اب عالی جسے یہاں ہی رہنا تھا میرے پاس۔ اپنے سسرال چلی گئی ہے اور درثمین ہے‘ جو پہلے سے زیادہ خاموش ہوگئی ہے‘ اس کی سنہری آنکھوں کی دمک ماند پڑ گئی ہے او ہونٹوں پر ایک جامد چپ ہے۔ دن بھر میں ہمارے درمیان بس اتنی گفتگو ہوتی ہے۔

صبح وہ میرے اٹھنے سے پہلے ہی اپنا ناشتہ کرلیتی ہے۔ میں جب ڈائننگ روم میں آتی ہوں تو وہ اپنی گاڑی کی چابی اٹھائے‘ جانے کو تیار کھڑی ہوتی ہے۔

”اچھا آپا! میں چلتی ہوں۔“

”ثمو! ناشتہ کرلیا۔“

”جی آپا......!“

کتنی مدتیں ہوگئی ہیں‘ اس نے مجھ سے پراٹھا بنانے کی فرمائش نہیں کی۔

”اچھا اللہ حافظ!“

وہ چلی جاتی ہے اور میں وہیں بیٹھی اسے جاتے دیکھتی رہتی ہوں اور پھر شام کو واپسی پر صرف ایک جملہ۔

”السلام علیکم آپا!“

”کھانا لگواؤں ثمو؟“

اگر اسے کھانا ہو تو ہاں...... نہیں تو منع کرکے اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ حالانکہ اس کی تو بچپن سے عادت تھی کھانا کھاتے ہوئے وہ سکول پھر کالج‘ کی ہر بات مجھے بتاتی جاتی‘ حتیٰ کہ جب اس نے کالج میں جاب بھی کرلی تھی تب بھی مزے لے لے کر کولیگز کی باتیں بتاتی جاتی اور کھانا کھاتی جاتی۔

”پتا ہے آپا! آج وہ مسز گلاب خان نے آتشی گلابی جوڑا پہنا ہوا تھا‘ اتنا چبھتا ہوا سا رنگ تھا کہ میں زیادہ دیر ان کے پاس کھڑی نہیں رہ سکی۔“

”اب ہر کوئی تمہاری طرح نفیس تو نہیں ہوتا نا جانو۔“

اس کی ڈریسنگ ہمیشہ سے بہت غضب کی تھی۔

”اور وہ مس باجوہ ان کے کپڑوں پر تو سالن کے داغ بھی لگے تھے‘ جیسے وہی رات والے کپڑے پہن کر چلی آئی ہوں۔“

”ثمو! تم اب پہلے کی طرح باتیں نہیں کرتی ہو۔“

کبھی کبھی میں بے چین ہوکر پوچھ لیتی ہوں۔

”کیا باتیں کروں آپا؟“

”یہی کالج کی‘ کولیگز کی۔“

میں گھر کی ویرانی سے گھبرا کر کہتی ہوں۔

”کوئی خاص بات نہیں ہوتی آپا۔ وہی روٹین لائف۔“

”لیکن پہلے تو تم بہت باتیں کرتی تھیں۔“

”عمر کا تقاضا ہے آپا! ہر عمر میں آدمی ایک جیسا نہیں ہوتا۔“

”اب تم ایسی بوڑھی بھی نہیں ہوگئی ہو۔ کل بھی مسز عثمان اپنے بیٹے کے لیے کہہ رہی تھیں۔“

اس بات پر اس کا چہرہ سخت ہو جاتا ہے‘ پتھر کی طرح۔

”آپا پلیز‘ اس موضوع پر مجھ سے بات نہ کریں۔ میں نے یہ چیپٹر کلوز کردیا ہے۔“

اور اندر ہی اندر میرے دل کا چور مجھے کچوکے لگاتا ہے۔ یہ تم ہو...... شائلہ شبیر...... تم...... جس نے اس کے ہونٹوں کی ہنسی چھینی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ایسی ہوگئی ہے۔ اگر تم‘ ہاں میں......

”لیکن مجھے کیا معلوم تھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ میں شائلہ شبیر جس نے صبح و شام اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے دن رات درثمین کی خواہشوں کی دعائیں کی ہیں۔ خود ہی اس کی زندگی میں اندھیرے بکھیر دوں گی۔“

● ● ●

درثمین‘ میری بہت پیاری چھوٹی لاڈلی بہن ہے‘ میری اور اس کی عمر میں پورے تیرہ سال کا فرق ہے۔ میری پیدائش کے ٹھیک تیرہ سال بعد جب وہ دنیا میں آئی تو ”مون پیلس“ میں خوشیاں ہی خوشیاں بکھر گئیں۔

ہر فرد خوش تھا۔ میری اور مون کی خوشی تو دیکھنے والی تھی۔ ہم تو اس کے پنگھوڑے کے

پاس سے ہٹ ہی نہیں رہے تھے۔ میری عمر تیرہ سال تھی اور مون کی اٹھارہ سال' لیکن میں ثمین کی دیوانی تھی اتنا ہی وہ' ثمین کا نام بھی اس نے ہی رکھا تھا۔ درثمین...... اور تایا ا تائی جان بھی جب تک اسے دیکھ نہ لیتے انہیں چین نہ آتا۔

چار کنال پر پھیلا ہوا یہ مون پیلس بابا اور تایا ابا کا مشترکہ گھر تھا۔ اسلام آباد کے ش میں' ایئر پورٹ سے نکلتے ہی اسلام آباد کی طرف جائیں تو دائیں طرف مون پیلس پوری وشوکت سے کھڑا تھا۔ اس کا وسیع گارڈن اتنا خوبصورت تھا کہ اکثر بابا کے دوست دیکھ کرتے تھے اور اس اتنے بڑے گھر میں صرف ہم دو ہی تھے۔

تایا ابا کے اکلوتے بیٹے شبیر حسن عرف مون اور میں شائلہ محسن۔

میرے بعد ایک منا بھائی دنیا میں آیا تھا اور صرف چند گھنٹے زندہ رہ کر چلا گیا۔ مجھے مون نے بھی میرے ساتھ مل کر اللہ تعالیٰ سے کسی منے بھائی بہن کی دعا کی تھی اور میں تو اب بھی اکثر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی تھی کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایک چھوٹی سی پیاری سی بہن د دے اور اب اللہ تعالیٰ نے میری دعا سن لی تھی۔

درثمین بہت پیاری تھی۔ بالکل سلولائیڈ کی گلابی سی گڑیا جیسی۔ لانبی لانبی آنکھیں بچپن میں سرمئی سرمئی اور پھر سنہری سنہری لگنے لگی تھیں۔ میں تو سکول سے آتے ہی اسے میں اٹھا لیتی۔ مون بھی کالج سے سیدھا اسے دیکھنے آتا اور کبھی کبھی ہم دونوں میں ا اٹھانے پر جھگڑا ہو جاتا۔

''تم صبح سے اسے اٹھائے بیٹی ہو' اب مجھے دو۔'' کبھی کبھی وہ مجھے چڑاتا۔

''دیکھ لینا ثمی! یہ ذرا سی بڑی ہو جائے تو میں اسے اپنی بائیک پر بٹھا کر سیر کرانے ل لے جایا کروں گا' پھر دیکھنا یہ تمہیں ذرا سی بھی لفٹ نہیں کرائے گی۔''

یوں ہی ہنستے کھیلتے وقت گزر رہا تھا۔ زندگی میں کہیں کوئی دکھ نہ تھا' میں نے میٹرک امتحان دیا' میرے میٹرک کا رزلٹ اور ثمین کی تیسری سالگرہ ایک ہی دن تھی۔ اس روز رات کے کھانے پر سب ہی اکٹھے تھے۔ ثمین کے ساتھ ساتھ تایا اور تائی نے مجھے بھی گفٹ د تھے۔ میں اچھے نمبر لے کر پاس ہو گئی تھی اور مون سے جھگڑ رہی تھی۔

''تم نے مجھے میٹرک میں پاس ہونے پر کون سا گفٹ دیا تھا' جو میں دیتا۔''

''لیکن تب تو میں چھوٹی تھی۔''

''اور اب میں چھوٹا ہوں۔''

''کہاں چھوٹے ہو لمبو! یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا ہے تم نے۔''

''تو جاب تو نہیں کرتا۔ جب کماؤں گا تو گفٹ دوں گا۔''

''تو اپنے جیب خرچ سے دے دو۔''

''اچھا دے دوں گا کل۔'' شبیر کی یہ اچھی عادت تھی کہ وہ جلد ہی ہار مان لیتا تھا۔

''میں اپنی پسند سے لوں گی' ٹھیک ہے نا' کل مجھے بھی مارکیٹ ساتھ لے چلنا۔''

''اب زیادہ پھیلو نہیں......'' شبیر اٹھ کر بابا کے پاس جا بیٹھا۔

''چچا! آپ ہی ابو کو سمجھائیں' ان کا ویٹ روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے۔ امی نے بھی کہا ہے لیکن یہ ڈاکٹر کے پاس نہیں جا رہے۔''

''میرا باپ بننے کی کوشش نہ کیا کرو یار۔'' تایا ہنسے۔

ان میں اور شبیر میں دوستوں ایسی بے تکلفی تھی۔

''نہیں بھائی صاحب! مون صحیح کہہ رہا ہے۔ آپ کو ڈاکٹر سے چیک اپ کروانا چاہئے بلکہ ایسا کرتے ہیں۔ صبح میں آپ کے ساتھ ہی چلوں گا' یوں بھی مجھے اپنی گاڑی ورکشاپ بھجوانی ہے۔ تو ڈاکٹر کو بھی دکھا دیں گے۔''

''چچا! اب اپنی ہلیلہ کو بیچ ہی دیں۔'' شبیر شرارت سے ہنسا۔

بابا نے اسے گھورا۔ ''میری گاڑی کے متعلق کوئی غلط بات مت کرنا ورنہ......''

''ورنہ یہ......'' بابا نے اس کے کان پکڑ لئے۔ میں انہیں ہنستا ہوا چھوڑ کر درثمین کے پاس آ گئی' جو آج سفید نیٹ کے فراک میں بالکل پریوں جیسی لگ رہی تھی۔

''آپا! یہ گڑیا ڈانس کرتی ہے۔'' وہ مجھے تایا ابا کا دیا ہوا گفٹ دکھنے لگی۔ ہم دونوں بار بار گڑیا کو چابی دے کر زمین پر چھوڑ دیتے اور پھر اسے ڈانس کرتے دیکھ رہے تھے کہ شبیر آ گیا۔ ہاتھ میں تایا ابا کی گاڑی کی چابی لئے۔

''چلو' تمہیں آئس کریم کھلا لاؤں۔''

''میں دو آئس کریم کھاؤں گی مون!'' ثمین نے فوراً کہا۔

''اچھا دو کھا لینا۔'' شبیر نے اسے گود میں اٹھا لیا۔

وہ مجھے تو آپا کہتی' لیکن شبیر کو مون ہی کہتی تھی۔ میں سارا راستہ کالج کی باتیں کرتی

رہی۔ کون سے کالج میں جانا ہے اور کون سے مضامین لینے ہیں اور شبیر مجھے مشورے د
اس روز ہم سب بہت خوش تھے' شبیر نے واپسی پر سب کے لیے آئس کریم لی
زبردستی بابا اور تایا جان کو کھلائی۔

"مون پیلس کی خوشیوں کے نام پر' آئس کریم کھانا پڑے گی آپ کو۔"

لیکن تب کیا خبر تھی کہ اس کے بعد کبھی مون پیلس میں کوئی خوشی مکمل نہیں
ادھوری خوشی...... آنسوؤں سے دھلی ہوئی...... اگلے چند دنوں میں یہ خبر سب کے لیے
اذیت ناک تھی کہ تایا ابا کو بلڈ کینسر ہو گیا ہے۔

"کیسے' کس طرح' تایا ابا تو کبھی بیمار نہیں پڑے تھے۔ اس موذی بیماری نے کب
تاڑ لیا۔ شبیر تو بچوں کی طرح ان کے گلے سے لپٹ لپٹ کر روتا۔

"تم سمجھ دار ہو بیٹا!" تایا ضبط کرتے۔

"نہیں ابو! میں ابھی بہت چھوٹا ہوں۔ بچہ ہوں' بالکل مجھے ہر قدم پر آپ کی ضر
ہے۔"

مون پیلس کے درودیوار پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے تو یاد ہی نہیں رہا تھا ک
کالج میں ایڈمیشن بھی لینا ہے کہ شبیر ایک شام یونیورسٹی سے واپس آتے ہوئے میرا ایڈ
فارم لے آیا۔ اس وقت تایا ہماری طرف ہی تھے۔ وہ اور بابا بیٹھے نہ جانے کون سے حسا
کتاب کر رہے تھے۔ اماں بھی قریب ہی بیٹھی تھیں اور بار بار دوپٹے کے پلو سے آنکھ
پونچھ رہی تھیں۔ تایا جان بوجھ کر اماں کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہے تھے اور بابا کو زمی
کا اور دوسرے مختلف حساب کتاب سمجھا رہے تھے۔

"یہ لو تمہارا ایڈمیشن فارم......" شبیر بابا کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

تایا ابا نے سر اٹھا کر پہلے اسے اور پھر مجھے دیکھا اور بابا سے کہنے لگے۔

"محسن! ثمی کو میری بیٹی بنا دو۔"

"بھائی صاحب! یہ آپ ہی کی بیٹی ہے۔"

ابا ان کی بات نہیں سمجھے تھے۔

"محسن! میں چاہتا ہوں' جانے سے پہلے اپنے بیٹے کی خوشی دیکھ لوں۔ اسے ہنستا
دیکھوں' میں نے بڑے بڑے خواب دیکھے تھے کہ یوں اس کی شادی کروں گا...... اتنی دھوم دھ

سے کہ لوگوں کو مدتیں یاد رہے گی۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے محسن......!"

"لیکن بھائی صاحب! ثمائلہ ابھی بہت کم عمر ہے۔ صرف سولہ سال کی اور مون بھی تو
پڑھ رہا ہے۔ ایک سال ہے اس کی پڑھائی میں ابھی۔ ثمی ایف اے کر لے تو...... دو سال ہی
کی تو بات ہے' انشاء اللہ آپ اپنے بیٹے کی خوشیاں ضرور دیکھیں گے۔"

"دو سال کس نے دیکھے ہیں محسن!"

تایا کی آواز میں جانے کیا تھا کہ اماں تڑپ اٹھیں۔

"ٹھیک ہے بھائی صاحب! آپ شادی کی تیاریاں کریں۔"

بابا نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"میری شادی چودہ سال کی عمر میں ہوئی تھی۔" اماں نے بابا کی حیرت کا جواب دیا۔

"اور اپنی ثمی تو سولہ سال کی ہے اور پھر کون سا اس نے کہیں دور جانا ہے۔ ایک آنگن
سے دوسرے آنگن تک۔ یہاں ایک لمحے کا اعتبار نہیں۔ پھر بھائی صاحب......!"

اماں رونے لگیں اور بابا کوئی احتجاج نہ کر سکے۔ تایا' صرف اماں کے جیٹھ ہی نہ تھے
خالہ زاد بھائی اور بہنوئی بھی تھے۔ تائی جان اور اماں دونوں بہنیں تھیں۔ اماں کا میکے میں کوئی
نہ تھا' سوائے خالہ کے' سو تایا نے ہمیشہ اماں کے میکے کا مان بھی رکھا اور بھائی بن کر ہر عید بقر
عید ان کے ساتھ برتتے اور بالکل چھوٹی بہنوں کی طرح ہی چاہتے تھے۔

"اور اس کی پڑھائی؟"

"پڑھتی رہے گی بعد میں اگر شوق ہوا تو۔"

اماں نے لاپروائی سے کہا اور شاید تائی اماں کو بتانے چلی گئیں۔ میں اور شبیر ساکت
بیٹھے تھے' حیران سے......

پھر اماں اور تایا نے سارے ارمان پورے کیے۔ کئی دن شادی کا ہنگامہ رہا' گھر میں
نے بابا' اماں اور شبیر کو روتے دیکھا۔ چھپ چھپ کر...... یوں میں اپنے کمرے سے شبیر کے
کمرے میں آ گئی۔ میں اس اچانک شادی سے حیران بھی تھی اور مجھے شبیر کا یہ نیا روپ اچھا
بھی لگ رہا تھا۔

تایا بہت خوش تھے' بابا بڑے بڑے ڈاکٹروں سے مشورے لے رہے تھے اور چاہتے
تھے کہ انہیں باہر لے جائیں اور تایا نہ جانے پر بضد تھے۔

”یار! جو چند دن ہیں زندگی کے انہیں اپنوں میں گزارنے دو۔ مجھے کہیں نہیں باہر...... یہ اپنا مون اور ثمی جائیں گے ہنی مون کیلئے' بھئی بچو! پروگرام بناؤ۔“

”ابا! میرے پیپرز ہو جائیں تو پھر سب چلیں گے۔“

”ہنی مون تمہارا ہے یا ہمارا۔“

تایا قہقہہ لگا کر ہنسے اور میرا دل جیسے رو پڑا۔ تایا ابا میں بڑا حوصلہ تھا۔ کتنا تھوڑا وقت ان کے پاس' ایک سال دو سال یا پتا نہیں پھر کتنے۔ مگر وہ بڑے حوصلے سے سارے کام رہے تھے۔ مون کبھی کبھی بہت ڈپریس ہو جاتا تو میں اسے حوصلہ دیتی۔

”تھینک گاڈ ثمائل! تم ہو میرے ساتھ ورنہ میں تو پاگل ہو جاتا۔ یہ سوچ سوچ کر کہ ایک روز مجھے چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ ثمی! تم مجھے حوصلہ دیا کرو۔ میری ہمت بڑھایا کرو۔ نہیں تو میں اس اتنے بڑے صدمے کو برداشت نہیں کر پاؤں گا۔“

اور میں یک دم سولہ سالہ الہڑ اور لاپرواسی ثمائلہ سے بہت باشعور اور سمجھ دار بن جا اور اسے سمجھانے لگتی' لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ تایا جنہیں بلڈ کینسر تھا۔ وہ تو دو تین برس جی لیں گے' لیکن اماں جو اچھی بھلی صحت مند تھیں' لمحوں میں چٹ پٹ ہو جائیں گی۔

میری شادی کے صرف پچیس دن بعد ایک صبح اچانک ہی ان کے سینے میں درد اٹھا' وہ گھبرایا تو شبیر انہیں ضد کر کے ہاسپٹل لے گئے۔ میں بھی ساتھ ہو لی۔ اماں تو منع ہی کر رہیں۔ ”گیس ٹربل ہے۔ صبح ناشتے میں پوریوں کے ساتھ چنے کھا لئے تھے۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔“

”لیکن دکھانے میں کیا حرج ہے چچی! تسلی ہو جائے گی۔“

”خواہ مخواہ ہی ضد کر رہے ہو بیٹا۔“

اماں اپنے قدموں سے چل کر گاڑی میں بیٹھیں۔ ثنین بھی' مون مون کرتی ہوئی ہمارے پیچھے چلی آئی تھی۔

کلینک میں پہنچتے ہی اماں گاڑی سے اتریں اور ان کے قدم لڑکھڑا گئے اور پسینہ پیشانی سے یوں بہنے لگا جیسے پانی......

”اماں!“ میں نے گھبرا کر انہیں سہارا دیا اور چند قدم آگے چلتے شبیر کو آواز دی۔

”مون......!“ شبیر نے پلٹ کر اماں کو سہارا دیا۔ اماں کی نظریں شبیر کی انگلی تھامے

ثنین پر پڑیں' پھر انہوں نے میری طرف دیکھا پھر ثنین کی طرف۔ ان کے ہونٹ ہلے لیکن آواز سنائی نہ دی۔

”اماں......!“ میں چیخی...... شبیر نے دونوں بازوؤں میں انہیں اٹھا لیا اور تیزی سے اندر لپکے۔ ڈاکٹر نے چیک کیا اور مایوسی سے سر ہلا دیا۔

● ● ●

مجھے تو کئی دن تک ہوش نہیں آیا۔ یہ لمحوں میں کیا ہو گیا تھا۔ بابا نے میری شادی کی مخالفت کی تھی' لیکن اماں جھٹ تیار ہو گئی تھیں۔ کیا اسی لئے کہ انہیں چلے جانا تھا۔ اتنی جلدی...... ورنہ تو اماں کہا کرتی تھیں۔

”میں شمو کی شادی کم عمری میں نہیں کروں گی۔ کم از کم بیس سال کی عمر سے پہلے نہیں۔ بڑے مسائل ہوتے ہیں۔“ خود ان کی شادی کم عمری میں ہوئی تھی شاید اس لئے لیکن پھر یک دم ہی تیار ہو گئی تھیں۔ شاید اندر کہیں ادراک ہو گیا تھا انہیں کہ اب انہیں نہیں رہنا۔

اماں تو بالکل جوان لگتی تھیں۔ نازک سی دبلی پتلی سی۔ میری سہیلیاں اماں کو میری بہن ہی سمجھتی تھیں۔ اکتیس بتیس سال کی عمر تھی اماں کی۔

مجھے سنبھلنے میں بہت وقت لگا۔ اس دوران ثنین کو تائی اماں نے ہی سنبھالا۔ لیکن سنبھلتے ہی میں نے ثنین کی ساری ذمہ داری اپنے ذمہ لے لی۔ اماں نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا' لیکن ان کی وہ آخری نظریں' مجھے یوں لگتا تھا جیسے انہوں نے نظروں ہی نظروں میں مجھ سے عہد لیا ہو کہ میں ان کے بعد ثنین کا خیال رکھوں گی۔ ثنین تو پہلے بھی مجھ بہت عزیز تھی۔ اب اور بھی پیاری ہو گئی تھی۔ ثنین کے سارے کام اماں ہی کرتی تھیں۔ میں تو بہت ہوا تو سکول سے آ کر تھوڑا اس سے کھیل لیتی تھی۔ پاس لٹا کر کہانی سنا دی اور بس......

شروع شروع میں اس نے اماں کی کمی بہت محسوس کی اور بہت تنگ کیا' لیکن پھر ہولے ہولے سیٹ ہو گئی۔ سب ہی اسے چاہتے تھے شبیر' تایا ابا' تائی جان بابا اور میری تو اس میں جان تھی۔ مجھے تو یوں لگتا تھا جیسے میں نے خود کو اس کے لیے وقف کر دیا ہو۔

شبیر نے دو ایک بار مجھ سے کہا کہ اگر میں پڑھنا چاہوں تو لیکن میں نے منع کر دیا...... میں بھلا ثنین کو اکیلا چھوڑ سکتی تھی۔ ایسے میں عابی کی آمد کی خبر نے مجھے بوکھلا دیا۔

”مون! میں ثنین کو اور آنے والے بچے کو بیک وقت کیسے سنبھالوں گی۔ ثنین تھوڑی

بڑی ہو جاتی تو......"

"میں بھی ابھی اتنی جلدی تم پر بچے کی ذمہ داری نہیں ڈالنا چاہتا تھا شمو! لیکن شاید کی کوئی مصلحت تھی' شاید ابو کے نصیب میں میری اولاد دیکھنا تھا۔ کچھ فیصلے اوپر ہوتے آسمانوں پر' ہم میں سے تو کوئی بھی ذہنی طور پر شادی کے لیے تیار نہ تھا۔ حتیٰ کہ ہما والدین بھی' لیکن فیصلہ اوپر ہو چکا تھا...... سو اور اچھا ہی ہو گیا۔ چچی نے اپنے ہاتھوں......'

اس کی آواز بھرا گئی۔

"اسے بھی آسمان کا فیصلہ سمجھ کر قبول کر لو ڈیئر! وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک تم نے مزید بچے نہیں ہوں گے حالانکہ میں نے بہت پہلے سے سوچ رکھا تھا کہ ہر سال ایک آئے گا تاکہ مون پیلس میں ہنگامہ رہے ہر وقت۔"

میں جو بہت چڑچڑی ہو رہی تھی ہنس دی۔ سوچتی تو میں بھی تھی کہ کم از کم چار ضرور ہوں' تاکہ انہیں ہماری طرح تنہائی کا احساس نہ ہو۔ یوں جب ثمین چار سال کی عابی بھی اس دنیا میں آ گئی۔

تایا ابا بہت خوش تھے' اور بابا بھی۔ بابا اماں کے بعد بالکل اکیلے ہو گئے تھے۔ ہم چاہا کہ وہ شادی کر لیں' لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔

"لو بھلا' میں اب نانا بن کر شادی کرتا اچھا لگوں گا۔"

"تمہاری عمر ہی کیا ہے محسن! پینتیس سال' آج کل تو اکثر مرد اس عمر میں شاد کرتے ہیں۔"

تائی اماں بھی چاہتی تھیں کہ بابا شادی کر لیں' لیکن وہ نہیں مانے' وہ تو بس آفس آ کر سارا دن تایا کے پاس بیٹھے رہتے اور دونوں بھائی چپکے چپکے جانے کیا باتیں کر رہتے۔ کبھی بچپن کی کوئی بات یاد کرتے تو کبھی جوانی کی بات دہراتے' دونوں بھائیوں بے حد محبت تھی۔

اور جب میری شادی کو تیسرا سال ہوا تو تایا ابا' بابا کو اکیلا چھوڑ گئے۔

جانے والے چلے جاتے ہیں اور زندگی کا سفر رواں دواں رہتا ہے۔ اماں چلی گئیں تایا ابا چلے گئے لیکن زندگی کا سفر رواں دواں رہا۔

مون پیلس میں جہاں کبھی میں اور شبیر تتلیوں کے پیچھے بھاگا کرتے تھے' وہاں اب ثمین

اور عابی نے ہماری جگہ لے لی تھی اور یوں تتلیوں کے پیچھے' بھاگتے عابی اور ثمین میرے برابر آ پہنچیں۔

ثمین کا قد تو مجھ سے بھی نکلتا ہوا تھا۔ خوبصورت تو وہ تھی ہی اب تو نگاہ اس کے چہرے پر ٹھہرتی ہی نہ تھی۔ عابی بھی کم حسین نہ تھی اور دونوں میں بہت دوستی تھی' حالانکہ عابی ثمین سے پورے چار برس چھوٹی تھی۔ لیکن وہ مزے سے ثمین کا نام لے کر اسے پکارتی تھی۔ بلکہ ثمین کی دیکھا دیکھی اس نے بھی شبیر کو مون کہنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے کئی بار ٹوکا تو شبیر ہنس دیئے۔

"کہنے دو یار! یہ دونوں میری سہیلیاں ہیں۔ اب جو بچہ آئے گا اسے پاپا سکھا دینا۔"

لیکن عابی کے بعد خدا جانے کیا خرابی ہو گئی تھی کہ میرے ہاں اور کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ حالانکہ شبیر نے تائی اماں کی خواہش پر مجھے دو تین اچھی گائنی کی ڈاکٹرز کو بھی دکھایا' لیکن انہوں نے کہا کہ سب ٹھیک ہے خدا کی طرف سے ہی شاید کچھ دیر ہے۔ یوں ہماری محبتوں کا محور ثمین اور عابی ہی تھیں۔

عابی کے مزاج میں شوخی تھی۔ ثمین فطرتاً سنجیدہ تھی' لیکن اس کے سکوت میں بھی کلام کا گمان ہوتا تھا۔ عابی' دادی اور نانا کی لاڈلی تھی تو ثمین میری اور شبیر کی اور ثمین تو میری کمزوری تھی' اسے ذرا کچھ ہوتا تو میری جان پر بن آتی۔ میرا بس نہیں چلتا تھا کہ شہر کے سارے ڈاکٹرز اس کے سرہانے اکٹھا کر دوں۔

کبھی کبھی میں سوچتی تھی کہ یہ بھی اچھا ہوا تھا کہ میری شادی شبیر سے ہوئی تھی۔ ورنہ ثمین کا کیا ہوتا۔ شبیر نے تو کبھی ثمین اور عابی میں فرق نہیں کیا تھا بلکہ اکثر ثمین کو عابی پر ترجیح ہی دی تھی اور ثمین تائی جان کی بھی اتنی ہی لاڈلی تھی جتنی عابی' میں تو ثمین کو دیکھ کر جیتی تھی۔

ایک بار نہ جانے کس بات پر عابی نے کہا تھا۔

"اگر مجھے کچھ ہوا تو شاید مما برداشت کر لیں' لیکن ثمو کو کچھ ہوا تو مما تو ساتھ ہی مر جائیں گی۔"

"خدا نہ کرے تمہیں کچھ ہو۔" میں نے اس کو ڈانٹ دیا تھا۔ "الٹی سیدھی باتیں مت کیا کرو۔"

ثمین کو فائن آرٹس سے دلچسپی تھی۔ سو اس نے اسی میں اپنی ایجوکیشن مکمل کی تھی اور

اپنے کمرے کے ساتھ ہی اس نے اپنا اسٹوڈیو بنایا تھا' اور سارا دن اس میں گھسی
دراصل وہ اپنی تصویروں کی نمائش کرنا چاہتی تھی۔ عابی ایف' ایس سی کے پیپرز دے کر
تھی' سو وہ بھی اس کے پاس بیٹھی الٹے سیدھے مشوروں سے اس کا سر کھاتی رہتی' م
فارغ ہو کر وہیں آجاتی اور ثمین کام کرتے ہوئے مجھ سے بھی مشورے لیتی رہتی۔ کبھ
آجاتے تو گلہ کرتے۔

''میں بے چارہ اگنور ہو رہا ہوں شمو جی! مجھ غریب پر بھی کبھی نظر ڈال دیا کرو۔''

''نہیں...... میں آپ کو اگنور تو نہیں کرتی۔''

میں دل ہی دل میں نادم ہو جاتی۔ شبیر نے کتنا ساتھ دیا تھا۔ کبھی گلہ نہیں کیا تھا۔
ایسا ہوا کہ شبیر کمرے میں آئے اور ثمین نے رونا شروع کر دیا اور میں ان کی بات سے
کمرے سے نکل گئی۔ حالانکہ وہ شادی کے ابتدائی دن تھے۔

''شبیر! میں شمو کے سلسلے میں تمہاری بہت ممنون ہوں۔''

''یہ بات دوبارہ مت کہنا شائل! کیا ثمین میری کچھ نہیں ہے۔ وہ میری بھی ایسے
بہن ہے جیسے تمہاری۔''

اور کبھی کبھی ثمین جذباتی ہو جاتی۔

''آپا! میں کیسے آپ کی محبتوں کا قرض ادا کروں گی۔''

''کوئی ضرورت نہیں قرض ادا کرنے کی۔'' شبیر اسے ہولے سے ڈانٹ دیتے۔

''یہ آپا ہیں تمہاری اور میں بھائی ہوں تمہارا۔''

زندگی میں ایک سکون سا تھا' جس میں عابی اور ثمین کی ہنسی جلترنگ بجاتی رہتی۔ د
ایک دوسرے کا اٹوٹ انگ بنی رہتیں۔

''اللہ شمو! جب تمہاری شادی ہو جائے گی تو میں کیا کروں گی۔''

عابی کو ہر وقت یہ ہی فکر لگی رہتی تھی۔ جب سے ثمین نے اپنی تعلیم مکمل کی تھی۔

''تم بے فکر رہو عابی! فی الحال میرا شادی کا ارادہ نہیں' ابھی مجھے بہت سا کام
ہے۔''

''بس پھر وعدہ...... میرے ایم بی بی ایس کرنے تک تم شادی نہیں کرو گی۔ میں تم
شادی کی خوب انجوائے کرنا چاہتی ہوں۔ اب میڈیکل کی بھاری کتابوں کے بوجھ تلے

کر میں کہاں صحیح طرح سے انجوائے کر سکوں گی...... اور میرے تو بہت پروگرام ہیں' شمو کی
شادی کے سلسلے میں۔ ٹھیک ہے نا مما!''

وہ مجھے بھی شامل کر لیتی۔

''تو تم سے کس نے کہا ہے اپنی نازک جان پر اتنا بوجھ ڈالو۔ ویسے ہی ملک میں
بیروزگار ڈاکٹروں کی تعداد ہر سال بڑھ رہی ہے۔''

''مجبوری ہے' موم کی خواہش ہے نا۔''

وہ جو بظاہر بڑی کھلنڈری تھی اندر سے بہت حساس تھی۔

ایک بار شبیر نے جانے کس بات پر کہا تھا کہ اگر ان کا بیٹا ہوتا تو وہ اسے ڈاکٹر بناتے۔

''ارے تو کیا ہوا۔ میں آپ کی خواہش پوری کر دوں گی۔'' تب عابی نے کہا تھا اور
شاید تب سے ہی اس نے اپنے دل میں ٹھان لیا تھا کہ وہ ڈاکٹر بنے گی۔

''بھئی......تم اگر کہو تو میں ساری زندگی شادی نہیں کروں گی۔'' ثمین کہہ رہی تھی۔

''ارے نہیں پھر میں جوتا چھپائی اور دودھ پلائی کا نیگ کس سے لوں گی۔''

عابی کے پاس تو ہر بات کا جواب موجود تھا۔ تب میں نے سوچا تھا بھلا میں ثمین کی
شادی کس سے کروں گی۔ ایک دو پرپوزل تو تھے لیکن پتا نہیں کیوں کوئی بھی دل کو جچا نہیں
تھا۔

''ہائے میری ثمین تو بہت نازک دل ہے شبیر! اور وہ لوگ تو کرخت سے ہیں۔''

''لڑکا اچھا ہے...... اعلیٰ پوسٹ پر ہے۔''

''پر اس کے گھر والے تو اجڈ سے ہیں نا۔''

❋ ❋ ❋

جب میں نے عباس اعوان کو دیکھا تو مجھے وہ ثمین کے لیے بہت موزوں لگا۔ بلکہ پہلی
بار جب میں نے اسے دیکھا تو وہ دونوں ساتھ ساتھ کھڑے تھے اور بے اختیار میں نے سوچا
تھا کہ کیا ہی اچھا ہو اگر یہ لڑکا عباس اعوان ثمین کو پرپوز کر دے۔

عباس شبیر کے بہت اچھے اور گہرے دوست کا چھوٹا بھائی تھا۔ ثمین کی تصاویر کی نمائش
کراچی میں ہونا تھی۔ کراچی کی ایک گیلری کے ساتھ سب معاملہ شبیر کے دوست خضر اعوان
نے ہی طے کیا تھا۔ ہم سب کو ہی کراچی جانا تھا لیکن ثمین نمائش کے انتظامات کے سلسلے میں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

کچھ دن پہلے ہی چلی گئی تھی اور عابی کے ایگزام کی وجہ سے ہم کچھ تاخیر سے گئے تھے۔
خضر نے شبیر سے کہا تھا کہ اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔
ثمین کو اس کے گھر میں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ ثمین نے بھی وہاں پہنچ کر تسلی دی تھ
یوں ہم اس کی نمائش شروع ہونے سے ایک دن پہلے وہاں پہنچے تھے۔
ثمین اور عباس ہمیں لینے ایئرپورٹ آئے تھے اور وہیں ایئرپورٹ پر میں نے دونو
ساتھ ساتھ کھڑے دیکھ کر سوچا کہ کیا ہی اچھا ہو کہ ثمین کا رشتہ اس کے ساتھ طے ہو جائے۔
ہم تقریباً ایک ہفتہ وہاں رہے۔ ثمین کی نمائش بہت کامیاب رہی تھی۔ اسے بہت ا
رسپانس ملا تھا' کئی تصاویر فروخت بھی ہوگئی تھیں۔ اس ایک ہفتے میں عباس کو میں نے ہر طر
سے بہت اچھا پایا۔
دھیمے مزاج کا سنجیدہ سا لڑکا تھا۔
نرم لہجے میں نگاہ جھکا کر بات کرتا تھا۔
اسے اپنی تعلیم مکمل کیے دو سال ہی ہوئے تھے اور فی الحال اسے اپنے مطلب کی جا
نہیں ملی تھی۔ وہ آرکیٹیکٹ تھا۔ اس کی شخصیت میں ایک عجب طرح کا وقار تھا۔ وہ اپنے بھا
خضر کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ والدہ بھی ساتھ ہی تھیں۔ دونوں بھائی تھے اور ایک بہن تھی'
شادی شدہ تھی اور چونکہ اس کے شوہر ملک سے باہر تھے سو والدہ زیادہ تر بیٹی کے پاس ہو
تھیں' اور عباس یہاں بھائی بھاوج کے پاس رہتا تھا۔
بھاوج نے بھی اس کی بے حد تعریف کی تھی اور حقیقت تو یہ ہے کہ شبیر کو بھی عباس بہ
پسند آیا تھا۔ لیکن یہ تو قدرت کے فیصلے ہوتے ہیں۔ ہمیں تو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ عباس کس
سے منسوب ہے یا نہیں۔ نہ ہی بھابی نے اس سلسلے میں کوئی بات کی تھی۔
عابی عادت کے مطابق بہت جلد اس سے بے تکلف ہوگئی تھی۔ ایک ہفتے کے قیام کے
بعد ہم واپس آگئے۔ کچھ عرصہ بعد ثمین نے ہماری اجازت سے ایک کالج میں جاب کرلی۔
"عابی اپنی پڑھائی میں مصروف تھی اور ثمین اپنی جاب میں' فارغ وقت میں ثمین ا
سٹوڈیو میں مصروف ہو جاتی اور عابی اس کے پاس گھسی کچھ نہ کچھ بولتی رہتی۔ کراچی سے آ
میں نے کئی بار عباس کے متعلق سوچا' لیکن ظاہر ہے' خضر سے شبیر کی بے انتہا بے تکلفی ہو
کے باوجود ہم خود سے تو نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہم عباس کے ساتھ ثمین کے لیے خواہش

یں۔ ان کی والدہ' بھابی' بہن سب ثمین سے ملی ہوئی تھیں' اگر ان کی خواہش ہوتی تو وہ خود ہی
رشتہ ڈال دیتیں۔ سو ایک سال دل ہی دل میں انتظار کرنے کے بعد میں پھر سے اِدھر اُدھر
جاننے والوں میں ثمین کے لیے رشتہ دیکھنے لگی۔
کئی لوگ آئے بھی مگر وہی کہ کوئی دل کو نہ جچا۔ میری پریشانی سے قطع نظر دونوں مگن
تھیں۔ عابی فائنل ایئر میں تھی جب اچانک ایک شام عباس آگیا۔ اسے یہاں اسلام آباد
میں بہت اچھی جاب مل گئی تھی اور وہ ملنے آیا تھا۔ اس کا قیام آفیسرز ہاسٹل میں تھا' لیکن شبیر
نے اصرار کرکے اسے روک لیا تھا۔ اسے کہیں اور ٹھہرنے کی ضرورت نہیں' لیکن اس نے
سہولت سے انکار کر دیا۔
"میں آتا رہوں گا شبیر بھائی۔"
"تو پھر یوں کرو عباس! ہر ویک اینڈ ہمارے ساتھ گزارو۔" اور عباس مان گیا۔
"یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے عباس...... رہنا تو تمہیں یہاں ہی چاہیے تھا لیکن اب تمہاری
ضد ہے تو خضر کیا سوچے گا کہ۔"
"بھائی جان کچھ نہیں سوچیں گے' میں انہیں بتادوں گا کہ آپ نے بہت اصرار کیا تھا۔"
میں جاننا چاہتی تھی کہ ان بیتے سالوں میں اس کی منگنی وغیرہ تو نہیں ہوئی سو میں نے
پوچھا۔
"کیا کرتے رہے ہو اس دوران؟"
"کچھ نہیں آپا! بس تین چار جگہ جاب کی لیکن عارضی طور پر کوئی بھی مطلب کی نہ تھی۔
اب اپنے مطلب کی جاب ملی ہے' اتنے عرصے بعد۔"
"مل تو گئی یار! شکر کرو۔"
شبیر کہہ کر چلے گئے کیونکہ ضروری کام سے جانا تھا تب ہی ثمین اور عابی سٹوڈیو سے
نکلیں۔
"ارے آپ......!" عابی چیخی۔
خوشی اس کے رخساروں سے پھوٹی پڑتی تھی۔ عباس بھی احتراماً کھڑا ہو گیا تھا۔ میں
نے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک یک دم بڑھ گئی تھی اور ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔
"کیسے ہیں آپ...... ہم اکثر آپ کو یاد کیا کرتے تھے۔" عابی کا انداز وہی تھا بے

تکلفانہ سا۔

''اچھا' میں بھی یاد کرتا تھا۔''

''عباس نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا اور ثمین کی طرف دیکھا۔

''آپ کیسی ہی درثمین!''

''فائن!'' وہ مسکرائی تو میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تم لوگ باتیں کرو' میں چائے بنواتی ہوں۔''

اور پھر ہر ویک اینڈ پر وہ آجاتا...... میں دیکھتی تھی کہ عابی اسے دیکھتے ہی مکمل اٹھ
اور پھر خواہ وہ پڑھ ہی کیوں نہ رہی ہوتی۔ پڑھائی چھوڑ چھاڑ کر اس کے پاس آ بیٹھتی' ا
ثمین سٹوڈیو میں مصروف ہوتی تو وہ دونوں لاؤنج میں بیٹھے ہولے ہولے باتیں کرتے ر
اور کبھی کبھی عابی کی بے ساختہ ہنسی بھی سنائی دیتی۔

اور وہ وقفے وقفے سے ثمین کو آوازیں بھی دیتی رہتی۔

''ثمو! اب آ بھی جاؤ۔''

اور پھر ثمین آجاتی اور وہ تینوں نہ جانے کن بحثوں میں کھو جاتے' کبھی پکاسو کی تص
زیر بحث ہوتیں تو کبھی مسلمانوں کا فن تعمیر اور کبھی کلنٹن کا قصہ اور کبھی عراق کا ذکر' غرض
بالکل مختلف موضوعات پر بات کرتے رہتے تھے اور یہ عابی کی عادت تھی کہ آسمان کی ب
کرتے کرتے یک دم زمین کی شروع ہو جاتی تھی۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ عباس کی اور عابی کی آپس میں بہت بنتی ہے۔ پتا نہیں ک
مجھے افسوس سا ہوا۔ شاید میں نے ثمین اور عباس کا سوچا تھا' لیکن ثمین میں کیا کمی تھی۔ ابھی
دن پہلے ہی ایک بہت اچھا رشتہ آیا تھا اس کیلئے' لڑکا انجینئر تھا...... اکلوتا بیٹا۔ باپ ڈاک
ماں ہاؤس وائف اور پھر وہ یہاں اسلام آباد میں ہی رہتے تھے۔ اچھا ہے شادی کے بعد
دور نہیں جائے گی میں نے سوچا تھا' لیکن چونکہ میرے ذہن میں عباس کا خیال بھی تھا ا
لئے میں نے سوچ کر جواب دینے کو کہا تھا اور ابھی میں نے شبیر سے اس رشتے کا ذکر نہیں
تھا۔ میری ایک جاننے والی کے طفیل وہ لوگ ہمارے گھر آئے تھے۔ ثمین کو لڑکے کی والد
کالج میں دیکھا تھا۔

ان دنوں عابی اور ثمین مسلسل سر جوڑے سرگوشیاں کرتی رہتیں۔ ٹی وی دیکھتے

ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے ہنس پڑتیں۔ دونوں کے گالوں پر گلال سا بکھرا ہوا لگتا' عابی کی اپنی شخصیت تھی اور ثمین کی اپنی' لیکن اپنی اپنی جگہ دونوں میں بے انتہا کشش تھی۔ میں ان دنوں اکثر بے دھیانی میں کتنی ہی دیر تک عابی کو دیکھتی رہتی۔ دو ایک بار اس نے مجھے ٹوکا بھی۔

''کیا بات ہے ماما! آج کل آپ مجھے بڑے دھیان سے دیکھتی ہیں۔ کیا میں بہت خوبصورت ہو گئی ہوں۔''

''خوبصورت تو تم ہمیشہ سے ہو۔''

میں چونک کر کہتی...... ''پتا نہیں انجانے میں اس کے چہرے پر کیا کھوج رہی ہوتی' شاید عباس کا عکس۔

لیکن عابی کے چہرے سے تو کچھ پتا نہیں چلتا تھا' وہ تو ہمیشہ کی طرح تھی...... چلبلی اور خوش باش۔

پارے کی طرح بے چین۔ ابھی میرے پاس بیٹھی ہے اور ابھی شبیر کے گلے میں بانہیں ڈالے سرگوشیاں کر رہی ہے اور ابھی ثمین سے بحث کر رہی ہے۔ شبیر کہتے تھے۔

''اگر عابی نہ ہوتی مون پیلس میں کتنی بے رونقی ہوتی۔''

بابا کی تو جیسے جان تھی اس میں' ذرا دیر وہ انہیں دکھائی نہ دیتی تو وہ بے چین ہو جاتے تھے' پتا نہیں کیا جادو تھا اس کے پاس۔ ہر ایک کو اسیر کر لیتی تھی منٹوں میں گھل مل جاتی تھی اور شاید عباس اعوان کو بھی اس نے اسیر کر لیا تھا۔ تب ہی تو وہ ہر ویک اینڈ پر بھاگا چلا آتا تھا۔

● ● ●

اور اس روز بھی برستی بارش میں وہ آ گیا تھا اور پھر لاؤنج میں دونوں پاؤں صوفے پر رکھے مونگ پھلیاں کھاتے ہوئے عابی مسلسل اس سے باتیں کر رہی تھیں اور ثمین اپنے سٹوڈیو میں مصروف تھی۔ عباس کے لیے چائے بھجوا کر میں خود بھی ذرا دیر کو لاؤنج میں آ بیٹھی تھی۔ چائے کی پیالی عباس کی طرف بڑھاتے ہوئے عابی نے بڑی معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''مما! کل صبح یہ واپس کراچی جا رہے ہیں۔ ایک ہفتے کی چھٹی پر اور......''

تب ہی عباس نے یک دم نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا تھا اور ایک مدہم سی مسکراہٹ اس کے

لبوں پر بکھر گئی تھی۔

''کیوں بیٹا! اچانک ہی پروگرام بنالیا۔''

''نہیں آپا! بہت دنوں سے ارادہ تھا۔ چھٹیاں ڈیو تھیں اماں اور بھائی بھابی کے۔ اداس ہو رہا تھا بہت' پہلی بار اتنے عرصہ تک دور رہا ہوں ان سے۔''

''اور یہاں جو لوگ اداس ہو جائیں گے۔''

عابی نے کہا۔ لیکن عباس نے جیسے سنی ان سنی کردی اور سر جھکائے چائے پینے لگا۔

''عابی......!'' پتا نہیں کیوں مجھے اس کا اس طرح کہنا برا لگا اور میں نے اسے ٹو

''میں دیکھ رہی ہوں کہ تم آج کل بہت وقت ضائع کر رہی ہو۔ میڈیکل کی پڑھائی اتنی آسا نہیں ہے جتنا تم نے سمجھ لیا ہے۔ ایک ثمین بھی تو تھی کبھی اس نے تمہاری طرح وقت ضا نہیں کیا۔''

''دیکھا' یہ ہماری ماما ہیں جنہوں نے ہمیشہ ثمین کو ہم پر ترجیح دی ہے' حالانکہ مابدولہ اکلوتے ہیں۔'' عابی نے عباس کی طرف دیکھا۔

''میں نے کہا تھا نا آپ سے کہ اگر کبھی ماما کو انتخاب کرنا پڑے مجھ میں اور ثمین میں وہ ثمین کو......''

''فضول مت بولا کرعابی!''

وہ تو ایسی باتیں کرتی رہتی تھی۔ اس کی تو عادت تھی ہنسی مذاق کی' لیکن پتا نہیں کیوں میرے دل میں اس کی بات چبھ گئی تھی۔ میں انہیں وہیں بیٹھا چھوڑ کر اٹھ آئی اور اپنے کمرے میں آکر بہت دیر تک سوچتی رہی۔ کیا میں نے عابی کے ساتھ زیادتی کی ہے' کیا ثمین کو میں نے عابی کی جگہ دی ہے؟

میرے دل پر پتا نہیں کیوں بوجھ سا آپڑا تھا' میں چپ چاپ اپنے بیڈ پر لیٹی سوچتی رہی۔ لیکن ثمین کی اپنی جگہ ہے' عابی کی اپنی اور دونوں ہی مجھے اپنی جان سے بڑھ کر عزیز ہیں۔ کچھ دیر بعد ثمین چلی آئی۔

''آپا! خیریت ہے نا؟ آپ بے وقت کیوں لیٹی ہیں۔'' پریشان لگ رہی تھی۔

''کچھ نہیں......'' میں اٹھ بیٹھی۔ ''یوں ہی تھک گئی تھی۔''

''نہیں آپا! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی' میں مون کو فون کرتی ہوں۔''

اور میرے منع کرنے کے باوجود اس نے شبیر کو آفس میں فون کردیا اور شبیر پریشانی سے اسی وقت بھاگے چلے آئے۔

''کیا ہوا شمو! چلو ڈاکٹر کی طرف......''

''ارے نہیں' کچھ نہیں ہوا' یونہی تھکن ہے۔''

''اگر اس آدمی ڈاکٹر کی خدمات مستعار لے لی جائیں تو......''

عابی بھی کمرے میں آگئی تھی اور پھر نہ نہ کرنے پر بھی اس نے میرا بی پی چیک کیا۔ نارمل سے تھوڑا زیادہ ہے۔ لیکن نو پرابلم۔''

''یار! کچھ گڑبڑ نہ کرنا۔ میں تو پہلے ہی بہت اکیلا ہوں۔'' شبیر سچ پریشان ہو گئے تھے۔

''عابی اور ثمین ہیں نا......'' میں مسکرائی۔

''ماما! ایک ہی جیسی روٹین لائف سے بور ہو چکی ہیں۔ کچھ چینج چاہتی ہیں۔ یوں کرتے ہیں کل بھوربن چلتے ہیں۔ بچی بڑا مزا۔ میں عباس سے بھی کہتی ہوں ایک روز رک جائے۔''

وہ تقریباً بھاگتی ہوئی باہر چلی گئی۔

''بالکل بچی ہے۔'' شبیر مسکرائے۔ ان کی آنکھوں میں اس کے لیے محبت و شفقت کے رنگ بکھر گئے اور میرے دل میں بھی یہ رنگ بکھر گئے تھے۔ میں بھی مسکرا دی۔

''چہکتی بلبل ہے یہ تو شمی! تائی اماں سچ کہتی تھیں ہمارے گھر کی رونق' خدا کرے یہ یونہی ہنستی مسکراتی رہے۔'' میں نے بے اختیار دعا کی۔

● ● ●

بھوربن میں وقت بہت اچھا گزرا۔ مدت بعد اس طرح ہم سب اکٹھے باہر آئے تھے۔ خوب انجوائے کیا۔

لیکن ایک چیز جو میں نے شدت سے محسوس کی وہ یہ تھی کہ عابی ہنستے ہنستے یک دم چپ ہو جاتی تھی۔ کچھ سوچنے لگتی تھی اور پھر ثمین یا عباس کے ٹوکنے پر چونکتی۔

ثمین ایک پتھر پر بیٹھی تھی اور عباس اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔ عابی تصویریں بناتی پھر رہی تھی' کچھ دیر پہلے ہی اس نے ثمین اور عباس کی تصویر بنائی تھی۔ میں نے ایک نظر عباس کو دیکھا۔ وہ ثمین کی طرف متوجہ نہیں تھا بلکہ سامنے پہاڑوں کی طرف دیکھ رہا تھا جبکہ ثمین نگاہیں

جھکائے تھی اور عابی' شبیر کے پاس کھڑی انہیں ہنانے کو کہہ رہی تھی۔ لیکن مجھے لگا جیسے عا[بی]
اداس ہو۔ اس کی آنکھوں میں جو ہر دم جگنو سے چمکتے رہتے تھے اس وقت مدھم تھے۔"
اسے عباس کا ثمین کے نزدیک کھڑا ہونا اچھا نہیں لگ رہا اور کیا وہ عباس سے محبت کرنے[لگی]
ہے۔"

ایک لمحہ کے لیے میرے دل میں خیال آیا تھا اور پھر اس خیال کو اس روز تقویت [ملی]
جب عباس کے جانے کے چند دن ایک روز میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔
وہ ٹیلیفون سٹینڈ کے پاس کھڑی تھی۔ شاید اس کی کسی دوست کا فون تھا۔ جب وہ مڑ[ی]
تو میں نے دیکھا' اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور مجھے اپنے پیچھے دیکھتے ہی اس نے فوراً [منہ]
موڑ لیا تھا اور آنسو صاف کرتے ہوئے ثمین کو آوازیں دینے لگی تھی۔
"شمو.....! کہاں ہو بھئی! باہر نکل کر دیکھو موسم کیسا غضب کا ہو رہا ہے۔"
اس نے مجھ سے اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کی تھی۔ کیوں...... وہ تو ایسا نہیں کر[تی]
تھی کبھی' اسے کوئی تکلیف ہوتی تو وہ کھلے عام روتی تھی۔ ثمین اور مون اس کا مذاق اڑاتے۔
"ارے ذرا سے سر درد پر رو رہی ہو۔"
"ہاں تو روؤں گی۔ روؤں گی نہیں تو مما کو پتا کیسے چلے گا کہ مجھے کتنی شدت سے سر د[رد]
ہو رہا ہے۔"

کوئی دوست ناراض ہو جاتی تب بھی یونہی دھواں دھار روتی تھی۔ ذرا سی تکلیف بھ[ی]
برداشت نہ کر پاتی تھی اور اب ایسا کیا تھا کہ وہ مجھ سے شیئر نہیں کر سکتی تھی۔
"کیا عباس نے اس سے کچھ کہا ہے۔ مگر کیا...... کیا ابھی عباس کا فون تھا۔"
میں نے سوچا" کیا عباس کی ماں اور بھائی نے عباس کی بات نہیں مانی' کیا خبر عباس
نے گھر جا کر عابی کی بات کی ہو اور انہوں نے انکار کر دیا ہو۔ شاید کراچی میں ہی انہوں نے
کسی کو عباس کے لیے پسند کر رکھا ہو۔ خاندان میں بھی کئی لڑکیاں ہو سکتی ہیں۔" میں نے کت[نی]
ہی باتیں سوچ ڈالیں۔

اور عابی وہ تو بہت نازک دل ہے اور شاید وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو بہت چا[ہنے]
لگے تھے۔ میرا دل عابی کے لیے دکھی ہو رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیسے
طرح عابی کا غم بٹاؤں...... عابی ثمین کو آوازیں دیتی ہوئی اس کے کمرے میں چلی گئی اور [میں]

جو نہ جانے کس کام سے ادھر آئی تھی وہاں ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ عابی کی میڈیکل کی کوئی
بھاری کتاب وہاں پڑی تھی۔ میں نے یونہی اٹھا کر اسے ٹیبل پر رکھا تو اس کے سادے صفحے پر
نظر پڑ گئی۔ I Love You دو تین بار لکھا ہوا تھا جیسے کسی نے بے خیالی میں لکھا ہو۔
تو میرا خیال صحیح تھا' عابی سے محبت کرنے لگی تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔ تب
ہی شبیر آ گئے اور میرے قریب ہی صوفے پر بیٹھ کر جوتے اتارتے ہوئے کہنے لگے۔
"آج آفس میں خضر کا فون آیا تھا۔ وہ لوگ آنا چاہ رہے ہیں یہاں عباس کے رشتے
کیلئے۔"

میں نے سکون کی ایک لمبی سانس لی۔
"تو پھر آپ نے کیا کہا۔"
"کیا کہا تھا بھئی...... کیا میں ان کو یا ان کے خاندان کو نہیں جانتا...... میں نے کہا بھئی
جب جی چاہے آ جائیں' بلکہ یہ سب رسمی باتیں ہیں۔ آپ نے درثمین کو دیکھ رکھا ہے۔ اسے
جانتے ہیں۔ مجھے عباس کے متعلق کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔"
"درثمین! مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا'
"ثمین...... شبیر آپ نے ثمین ہی کہا نا۔"
"ہاں! شبیر نے کسی قدر حیرت سے مجھے دیکھا ظاہر ہے ثمین ہی۔"
"لیکن میرا خیال تھا شاید عباس...... کیا عباس سے پوچھا ہو گا خضر بھائی نے۔"
"کمال کرتی ہو شمو...... عباس کوئی لڑکی تو نہیں ہے۔ ظاہر ہے اس کی آرزو ہو گی تو تب
ہی ان لوگوں نے خواہش ظاہر کی اور پھر اپنی ثمین میں کمی کیا ہے جو عباس اسے پسند نہ کرتا۔"
"آپ نے دھیان سے سنا تھا نا شبیر کہ انہوں نے ثمین ہی کہا تھا۔"
"ہاں اور تمہاری تسلی کے لیے یہ بھی بتا دوں کہ فرخ بھابی کہہ رہی تھیں کہ جب ثمین
کراچی آئی تھی تب ہی انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ عباس کے لیے اسے مانگیں گی لیکن عباس
چاہتا تھا کہ پہلے وہ سیٹل ہو جائے اور اپنی مرضی کی جاب اسے مل جائے تب......"
شبیر اٹھ کھڑے ہوئے۔
"میں کچھ دیر آرام کروں گا۔ تم چائے کمرے میں بھجوا دو اور ہاں بھابی رات میں فون
کریں گی۔ آنے کے سلسلے میں' میں نے کہہ دیا تھا انہیں کہ صحیح تاریخ وغیرہ تو وزیراعظم صاحبہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ہی طے کریں گی۔ میں نے تو کہہ دیا صاحب رسمی باتوں کی ضرورت نہیں' اتنے دور سے روز آنا آسان نہیں ہے۔ سیدھے سجاؤ آ کر انگوٹھی پہنا جائیں اور ساتھ ہی شادی کی بھی طے کر جائیں۔"

میں ہاتھ گود میں دھرے چپ بیٹھی تھی۔

"شمو......!" شبیر جاتے جاتے پلٹے اور میرے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔

"عباس بہت اچھا لڑکا ہے۔ ہماری شئین اس کے ساتھ بہت خوش رہے گی اور بیٹی ایک دن ماں باپ سے جدا ہوتی ہی ہیں۔"

شبیر کی آواز بھرا گئی اور وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے' لیکن میں ... کے متعلق سوچ رہی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے عابی کا چہرہ آ رہا تھا۔

آنسوؤں سے بھری آنکھیں۔

عابی اور عباس کی بے تکلفی۔

عباس کا بے چینی سے انتظار کرنا۔

اس کی آمد پر بھاگ کر گیٹ تک جانا۔

جبکہ شئین نے کبھی کسی بے تابی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

عابی' عباس سے محبت کرتی ہے۔

اور شاید عباس بھی۔

"ممکن ہے اس کے بھائی بھاوج نے عباس کو نہ بتایا ہو کہ وہ کس کے لیے آرزو ہیں۔ شاید کوئی غلط فہمی......

مجھے یقین سا ہو گیا۔ میں اٹھی تا کہ شئین سے اس کے متعلق بات کروں' یقیناً شئین کو ... اور عباس کی ایک دوسرے سے دلچسپی کا پتا ہو گا۔ میں نے سوچا شبیر سے بات کرنے سے ... شئین سے پوچھ لوں۔ لیکن جب میں نے شئین کے کمرے میں قدم رکھا تو شئین نے عابی ... گرد بازو حمائل کیے ہوئے تھے اور وہ رو رہی تھی۔

"شمو! عابی کو کیا ہوا؟"

میں نے تڑپ کر پوچھا۔ یقیناً اس نے میری اور شبیر کی گفتگو سن لی ہو گی۔

"کچھ نہیں......" عابی یک دم سیدھی ہو گئی اور جلدی سے ہاتھوں کی پشت سے آ...

پونچھے۔

"کچھ نہیں آپا!" شئین نے بھی مجھے تسلی دی۔

"پاگل ہے یہ' سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"پھر بھی کیا ہوا ہے اسے؟"

"میں نے کہا نا پاگل ہے یہ۔ فضول باتیں سوچتی رہتی ہے۔ آپ کو تو پتا ہے ناں ذرا ذرا سی بات پر رونے لگ جاتی ہے۔" شئین مسکرائی۔

"جی نہیں' یہ پاگل پن نہیں ہے۔"

عابی کے لبوں پر ایک شرمگیں سی مسکراہٹ آ گئی' لیکن فوراً ہی وہ منہ بسورنے لگی تو شئین نے اسے نرمی سے ڈانٹا۔

"اب کوئی فضول حرکت نہیں ہو گی۔ چلو منہ ہاتھ دھو لو جا کر۔"

"لیکن شمو!"

شئین نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے تنبیہ کی اور وہ ہونٹ لٹکاتے ہوئے واش روم میں چلی گئی۔

"کیا ہوا ہے اسے شمو!"

"کچھ نہیں آپا! یوں ہی......"

شئین' شاید مجھے بتانا نہیں چاہتی تھی۔ میں الجھی الجھی سی باہر آ گئی اور کیا وہ جانتی ہے کہ عابی عباس کو پسند کرتی ہے۔ اگر جانتی ہے تو اسے مجھے بتانا چاہیے' لیکن اس نے کہا تھا سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپا آپ فکر نہ کریں۔ کیا ٹھیک ہو جائے گا۔ کیا اس کا ارادہ خود عباس سے بات کرنے کا ہے۔ لیکن اسے مجھ سے بات تو کرنا چاہیے۔ میں یوں ہی الجھی الجھی سی پھر لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی۔

تب ہی بیل ہوئی۔ دوسری طرف عباس کی بھابی تھیں اور پوچھ رہی تھیں کہ شبیر نے مجھ سے عباس کے رشتے کی بات کی۔

"بھابی! میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"آپ نے عباس سے ... پوچھا۔"

پتا نہیں کیوں مجھے یقین تھا کہ انہوں نے عباس کو یہ نہیں بتایا ہو گا کہ عباس کے لیے وہ

ثمین کا رشتہ مانگ رہے ہیں۔

"ہاں...... ہاں کیوں نہیں۔" وہ خوش دلی سے بولیں۔

"عباس کی خواہش ہماری خواہش سے الگ نہیں ہے۔ ہم سب کو ہی ثمین بہت پ ہے۔"

"پھر بھی آپ پہلے عباس سے پوچھ لیں کہ وہ ثمین کے لیے ہی......"

"ارے آپ پتا نہیں کیوں متردد ہو رہی ہیں۔ عباس سے پوچھ لیا ہے ہم نے... دوبارہ بھی پوچھ لیں گے۔ بلکہ ثمین یہاں آئی تھی تب سے ہماری خواہش تھی کہ ہم ثمین کو آ سے مانگ لیں' لیکن پھر عباس نے ہی منع کر دیا تھا کہ پہلے اسے کوئی اچھی جاب مل جا تو......"

"کاش آپ نے تب ذکر کر دیا ہوتا۔" بے اختیار میرے لبوں سے نکلا۔ "میں نے چند دن ہوئے ثمین کے لیے اپنے ایک جاننے والے ہیں' ان کو ہاں کر دی ہے۔ لڑکا انجینئ ہے ہر لحاظ سے رشتہ مناسب تھا۔"

"لیکن...... لیکن شبیر بھائی نے تو ذکر نہیں کیا......"

"دراصل بابا کو لڑکا بہت پسند آیا تھا۔ ظاہر ہے ثمین کے معاملے میں فیصلہ تو بابا کو ہ کرنا تھا۔ ابھی باقاعدہ منگنی نہیں ہوئی۔ بس بابا نے زبان دے دی اور شبیر کسی دفتری کام سے لاہور گئے ہوئے تھے آج ہی آئے ہیں اور آتے ہی آفس چلے گئے' میں بات نہ کر سکی۔"

"مگر بھابی! ابھی باقاعدہ منگنی تو نہیں ہوئی نا۔ آپ پلیز......"

"لیکن بابا زبان دے چکے ہیں' عباس بہت عزیز ہے ہمیں' ثمین نہ سہی...... عابی بھی ت ہماری ہی بیٹی ہے نا۔

آپ چاہیں تو......"

دوسری طرف بھابی لمحہ بھر خاموش رہیں۔

"اگر آپ کہیں تو خضر آپ کے بابا جان سے خود بات کر لیں۔"

"نہیں...... پلیز۔ بابا شاید ہی مانیں۔"

میں نے فوراً کہا...... میں جانتی تھی کہ بابا نے تو سارے فیصلے ہم پر چھوڑ رکھے ہیں۔ دو دن پہلے ہی تو بابا سے ثمین کے رشتے کے سلسلے میں بات ہوئی تھی' میں نے اس پرپوزل کے

متعلق بابا کو بتایا تھا تو انہوں نے کہا۔

"ثمین تمہاری اور شبیر کی بیٹی ہے۔ تم جانو اور شبیر...... اگر شبیر کو لڑکا پسند ہے تو ٹھیک ہے۔"

"بھابی ہ......!" انہوں نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔

"عباس! ثمین کو بہت زیادہ پسند کرتا ہے۔ آپ یہ بھی تو کر سکتی ہیں نا کہ عابی کا رشتہ ادھر......"

"نہیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے' انہوں نے ثمین کے لیے ہی پرپوزل دیا ہے۔ پھر ممکن ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہو۔ میرے خیال میں تو عباس اور عابی میں بہت انڈرسٹینڈنگ ہے اور...... اور آپ عباس سے بات کر کے دیکھیں...... میں بھی بابا سے بات کرتی ہوں۔"

میں نے یونہی کہہ دیا۔ میرا ظاہر ہے بابا سے کوئی بات کرنے کا ارادہ نہ تھا اور نہ ہی شبیر سے۔

یہ سب جو کچھ میں نے کہا تھا' بالکل غیر ارادی طور پر کہا تھا۔ شاید عابی کے آنسوؤں نے مجھے ڈسٹرب کر دیا تھا' شاید میرے لاشعور میں کہیں یہ بات تھی کہ ثمین عباس کے لیے کوئی خاص جذبات نہیں رکھتی جبکہ عابی اس سے محبت کرتی ہے اور اگر عباس کی شادی عابی کے بجائے ثمین سے ہو گئی تو عابی بہت ہرٹ ہو گی۔ شاید وہ اتنا بڑا دکھ برداشت نہ کر سکے۔ ذرا سا سر درد تو اس سے برداشت نہیں ہوتا۔

بس وہ ایک کمزور لمحہ تھا جب عابی کی محبت مجھ پر غالب آ گئی تھی۔ حالانکہ میں نے ہمیشہ ثمین کو عابی سے زیادہ چاہا تھا اور بس اسی ایک کمزور لمحے نے میری عمر بھر کی ریاضتوں پر پانی پھیر دیا۔ میں نے جھوٹ بول دیا تھا اور اس ایک جھوٹ نے دو زندگیاں تباہ کر ڈالیں۔

عباس چلا گیا اور ثمین کے لیے زندگی مر گئی۔

اگلی صبح شبیر کو پھر لاہور جانا تھا۔ دراصل وہ اپنی کمپنی کی ایک برانچ لاہور میں قائم کرنا چاہ رہے تھے اور اس سلسلے میں دفتر کی خریداری وغیرہ کے لیے ان کی بات چیت ہو رہی تھی کسی ڈیلر سے اور تقریباً معاملہ طے پا ہی چکا تھا۔

"شاید ایک دو دن لگ جائیں......" شبیر نے جاتے جاتے کہا۔

"اگر کراچی سے فون آئے تو انہیں ایک ہفتہ بعد کی ڈیٹ دینا۔"

میں نے چاہا کہ شبیر کو ثمین کے اس پروپوزل اور عابی کی عباس میں دلچسپی کے متعلق بتاؤں۔ لیکن ایک تو وہ جلدی میں تھے دوسرے میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں بات کیسے اور کس طرح کروں' سو شبیر چلے گئے اور میں نے سوچا کہ شبیر واپس آئیں گے تو بات کرلوں گی اور اس دوران ممکن ہے کراچی سے عابی کے لیے فون آجائے۔

کراچی سے فون آیا تو سہی لیکن عابی کے لیے نہیں ثمین کے لیے ہی۔ خود عباس نے بھی مجھ سے بات کی۔ اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"آپا پلیز...... کچھ کریں...... میں ثمین کو بہت خوش رکھوں گا۔ وہ میرے ساتھ بہت خوش رہے گی۔ آپ یقین کریں......"

"لیکن عباس ایسا ممکن نہیں ہے۔ اب تم عابی سے شادی کرلو۔ کیا کمی ہے اس میں۔"

"اس میں کوئی کمی نہیں ہے آپا! وہ بہت پیاری ہے اور اس کا دل اس سے بھی زیادہ پیارا ہے۔ لیکن آپا......"

"وہ تم سے محبت کرتی ہے عباس......"

"نہیں......" عباس کو یقین نہیں آیا۔ "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی عباس! وہ میری بیٹی ہے۔"

"کیا اس نے آپ سے کہا کچھ......؟" عباس کی آواز میں لرزش تھی۔

"نہیں...... لیکن میں جانتی ہوں۔"

"آپ کچھ نہیں جانتیں۔" عباس نے میری بات کو رد کردیا۔ "آپ کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"ممکن ہے' ایسا ہی ہو۔"

میں نے زیادہ اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا کہ اس میں عابی کی بے عزتی تھی۔

"ایسا ہی ہے آپا......! پلیز آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں۔"

"یہ اب ممکن نہیں ہے عباس......!" میں نے حتمی بات کی۔

"تم مجھے بہت عزیز ہو' اس لئے میں نے عابی کی بات کی تم سے کہ ثمین نہ سہی۔ وہ سہی...... مگر ثمین......"

"آپ نے اس رشتے کے متعلق ثمین سے پوچھ کر ہاں کی تھی؟" اس کے لہجے میں

بےقراری تھی۔

"ہاں...... ظاہر ہے' اس کی رائے تو لینا تھی اور اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔"

"نہیں......" اس کے لہجے میں بے یقینی تھی اور ٹوٹے ہوئے کانچ کی چبھن۔

"نہیں......" اس نے دوبارہ کہا اور پھر یک دم فون رکھ دیا اور میرے دل پر انجانا سا بوجھ آن گرا۔ عابی کے دکھ کا احساس تھا شاید میں نے اپنی جاننے والی خاتون کو فون کیا اور کہا کہ شبیر آجائیں لاہور سے تو وہ باقاعدہ ثمین کے سلسلے میں بات کرنے آجائیں۔ "ممکن ہے ثمین کی طرف سے بالکل مایوس ہوکر وہ عابی کے لیے راضی ہوجائے۔" میں نے سوچا۔ شبیر آگئے تو انہیں سب بتا کر میں اس بات کے لیے راضی کرلوں گی کہ وہ منگنی کے بجائے نکاح ہی کردیں' رخصتی چند ماہ بعد کردیں گے۔ لڑکا اچھا تھا اور عباس سے کسی طرح کم نہ تھا۔

میں نے عابی کے لیے کبھی نہیں سوچا تھا' میں نے ہمیشہ پہلے ثمین کے لیے سوچا تھا' جب عباس کو پہلی بار دیکھا تھا تب بھی وہ مجھے ثمین کے لیے بہت اچھا لگا تھا۔ لیکن اب عابی کی خوشی میں ثمین...... بابا سے بات کرنے کے لیے دوسرے پورشن میں جانے لگی تو میں نے بابا والے پورشن سے عابی کو آتے دیکھا۔ اس کے ساتھ کوئی لڑکا تھا اور عابی کے چہرے پر گلال بکھرا ہوا تھا۔

"ماما! یہ جہاں زیب ہے۔ میرا کلاس فیلو' میں اس کو بابا سے ملوانے لے گئی تھی۔"

"اچھا! کیسے ہیں بیٹا آپ! میں نے ایک نظر اسے دیکھا۔

اچھا خاصا خوش شکل لڑکا تھا لیکن کچھ نروس لگ رہا تھا۔ گھبرایا گھبرایا سا۔

"جی ٹھیک ہوں......"

"بابا سے ملاقات ہوئی......؟" میں نے یونہی بات کرنے کی غرض سے پوچھا۔

"جی...... جی ہاں......"

"او کے بیٹا! تم چلو گھر' چائے وغیرہ پیو۔ میں بابا سے ایک ضروری بات کرکے آتی ہوں۔"

"چلو اب چائے بھی پلوانا پڑے گی تمہیں۔" عابی کے لہجے میں بے تکلفی تھی۔

"نہ پلواؤ......" جہاں زیب نے آہستگی سے کہا۔

"مجبوری ہے ماما نے جو کہہ دیا ہے...... مما پلیز شمو ہے ادھر بابا کے پاس۔ اس کو بھی

بھیج دیجئے گا۔"

میں سر ہلا کر سوچتے ہوئے کہ میں بابا سے کیا کہوں گی' کیسے بات کروں گی کہ وہ شمو کے لیے عباس کے بجائے مسز احمد کے لائے ہوئے پروپوزل کے لیے شبیر کو رضامند کریں بابا والے پورشن میں آئی تو ثمین بابا کے گھٹنے پر ہاتھ رکھے ہولے ہولے کچھ کہہ رہی تھی اس کی سنہری آنکھیں دمک رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی۔

"چلو اچھا ہوا آپ بھی آ گئیں۔" اور پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"آپا! آپ ملیں عابی کے کلاس فیلو سے؟"

"ہاں......" میں اثبات میں سر ہلا کر بابا کا احوال پوچھنے لگی۔

"کیسا لگا آپ کو؟"

"اچھا ہے' لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"دراصل زیب کے والدین عابی کے لیے آنا چاہ رہے تھے۔ لیکن عابی نے انہیں منع کر دیا ہے۔ فی الحال آپ سے اور مون سے بات کر لے تو......"

"کیا......؟" میں بیٹھتے بیٹھتے رک گئی۔ "ہاں بیٹا! جہاں زیب مجھے اچھا لگا' پھر ڈاکٹر اورنگزیب کے والد کو اور خود اورنگزیب کو میں اچھی طرح جانتا ہوں اورنگزیب نے میٹرک تک شبیر کے ساتھ ایک ہی سکول میں پڑھا بھی ہے۔"

"کیا یہ ڈاکٹر اورنگزیب کا بیٹا تھا۔"

میں نے کسی قدر حیرت سے پوچھا تو بابا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"لیکن کیا عابی...... میرا مطلب ہے عابی کی بھی یہی خواہش ہے۔"

"آپا! کیا آج تک عابی اس سے پہلے کسی کلاس فیلو لڑکے کو گھر لائی ہے۔"

ثمین نے مدھم لہجے میں کہا۔

"لیکن...... لیکن شمو وہ اس روز رو کیوں رہی تھی؟" میں نے بیوقوفی سے پوچھا۔

"دراصل......" ثمین مسکرائی۔ "زیب نے اس سے کہا تھا کہ اس کے والدین آنا چاہتے ہیں تو عابی نے شرط رکھ دی کہ وہ تو صرف اسی لڑکے سے شادی کرے گی جو گھر داماد بن کر رہے گا۔ ظاہر ہے یہ بیوقوفانہ بات تھی۔ زیب اکلوتا بیٹا ہے۔ تین بہنیں ہیں۔ یہ کہاں ممکن تھا...... اس نے عابی کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا' بس اتنی سی بات تھی۔ جس پر رو رہی تھیں محترمہ! اور اتنے دن اداس اداس منہ لٹکائے پھرتی رہیں اور اس شرط پر مانی ہے کہ......" میں نے ثمین کی پوری بات سنی ہی نہیں اور سر تھام کر بیٹھ گئی۔

اوہ خدایا...... یہ کیا کرنے والی تھی میں اور یہ کیا کر دیا میں نے۔

"کیا ہوا آپا؟" ثمین نے گھبرا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں......بس یونہی ذرا چکر آ گیا تھا۔"

میں نے مسکرانے کی کوشش کی' لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل جیسے اندر ہی اندر پاتال میں گرتا جا رہا تھا اور میں اسے تسلی دیئے جا رہی تھی کہ کچھ نہیں ہوا ابھی میں ابھی جا کر کراچی فون کر دیتی ہوں۔

"بابا!" ثمین نے میری شکایت کی۔ "آپا بالکل بھی اپنا خیال نہیں رکھتیں بس ہر وقت میری عابی اور مون کی فکر میں رہتی ہیں۔"

"میں ٹھیک ہوں بابا...... یونہی سر میں درد تھا نا۔" میں کھڑی ہو گئی۔ "ابھی جا کر کوئی ٹیبلٹ لے لیتی ہوں۔ پھر آؤں گی۔ دراصل ثمین کے لیے خضر' مون کے دوست ہیں نا ان کے بھائی کا پروپوزل آیا ہے۔ شبیر کو بہت پسند ہے آپ تو مل چکے ہیں نا عباس سے۔"

"بھئی! میں نے تو کہہ دیا تھا مون سے اور تم سے...... شمو تمہاری بیٹی ہے...... تم جو بھی فیصلہ کرو گے۔"

اور میں نے دیکھا ہمیشہ خاموش رہنے والی ثمین کی سنہری آنکھیں یک دم لو دینے لگی تھیں اور ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ آ کر ٹھہر گئی تھی اور رخسار گلرنگ ہو رہے تھے۔

اور میں بابا کو شام میں آنے کا کہہ کر واپس آ گئی۔ عابی اپنے مخصوص انداز میں دونوں پاؤں صوفے پر رکھے آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی اور سامنے ہی جہاں زیب دوسرے صوفے پر بیٹھا تھا۔ عابی کی آنکھیں' ہیروں کی طرح دمک رہی تھیں اور وہ مزے سے نہ جانے کیا اوٹ پٹانگ باتیں کیے جا رہی تھی۔ جہاں زیب کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ میں نے ایک نظر دونوں کو دیکھا۔

"ماما! میں نے چائے کا کہہ دیا ہے۔"

عابی نے یونہی بیٹھے بیٹھے کہا جب کہ جہاں زیب احتراماً کھڑا ہو گیا تھا۔

"بیٹھو بیٹھو تم......" میں نے اسے اشارے سے بیٹھنے کا کہا اور اپنے کمرے کی طرف

جانے لگی۔

''ماما! آپ ہمارے ساتھ چائے نہیں پئیں گی۔'' عابی نے حیرت سے پوچھا۔

''آج نہیں' میرے سر میں درد ہے۔ تم اور جہاں زیب پیو۔''

اور کمرے میں آتے ہی میں نے تیزی سے موبائل پر کراچی کا نمبر ملایا' دوسری ط بھابی تھیں۔

''ہیلو...... ہیلو...... بھابی میں نے ان لوگوں کو منع کر دیا ہے۔ آپ جب چاہیں ء کے لیے آجائیں...... بس آنے سے پہلے مطلع کر دیجئے گا۔'' دوسری طرف کچھ دیر تک خا رہی۔

''ہیلو بھابی! آپ کیا سوچنے لگیں۔'' انہوں نے ایک گہری سانس لی۔

''عباس...... آئی سی یو میں ہے اور ڈاکٹر اس کی زندگی کے متعلق پر امید نہیں ہیں'' ان کی آواز بھرا گئی۔

''میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ بچپن سے ہی وہ بہت حساس ہے۔ جب اس کے فاد ڈیتھ ہوئی تھی تو کتنے دن تک سنبھل نہیں پایا تھا۔ اڑتالیس گھنٹے تو آئی سی یو میں رہا تھا۔ آ سے بات کرنے کے بعد وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد نکلا تو رنگ زر رہا تھا۔ لاؤنج میں آ کر اس نے فون کا ریسیور اٹھایا اور تمہارے گھر کا نمبر ملانے لگا۔ میں پوچھا عباس کہاں فون کرنے لگے ہو' کہنے لگا اسلام آباد' میں نے کہا شبیر آجائیں تو تمہار بھائی ان سے بات کریں گے۔''

''ہاں وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں عابی سے یا ثمین سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یق نہیں آ رہا اس سب پر جو آپا نے کہا ہے' ثمین۔ ثمین بھلا کیسے راضی ہو سکتی ہے اس ر کیلئے...... اور عابی...... نہیں بھابی! وہ تو میری چھوٹی سی پیاری سی دوست ہے۔ ضرور کوئی ا فہمی ہوئی ہے ثمین کو اور آپا کو......''

وہ مڑ کر دوبارہ نمبر ملانے لگا' لیکن پھر ریسیور اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ وہ لڑکھڑا صوفے پر گرا اور......''

میں ساکت موبائل تھامے کھڑی تھی۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ عباس ثمین سے اتنی شدید محبت کرتا ہے۔''

کچھ توقف کے بعد بھابی نے کہا۔

''آپ دعا کیجئے گا آپ...... عباس کو خدا زندگی دے تو ہم آئیں گے...... یہ تو مما کی' ہم سب کی خواہش ہے کہ ثمین اس گھر میں دلہن بن کر آئے۔''

اور میں نے عباس کی زندگی کے لیے اتنی دعائیں کیں کہ دعائیں کرتے کرتے میرے لب خشک ہو گئے۔

روتے روتے میرے سارے آنسو ختم ہو گئے۔ میں نے جھولی پھیلا پھیلا کر اللہ تعالیٰ سے عباس کی زندگی کی دعا مانگی' یوں جیسے کوئی ماں اپنے بیٹے کے لیے تڑپ رہی ہو۔ میں ایسے ہی اس کے لیے تڑپی کہ وہ میری ثمین کے دل کی خوشی تھا۔

مگر کچھ دعائیں مستجاب نہیں ہوتیں۔ عباس چلا گیا۔ صرف دو دن بعد...... چھٹی کا دن تھا شبیر کچھ ہی دیر پہلے لاہور سے آئے تھے اور لاؤنج میں ثمین اور عابی کو ارد گرد بٹھائے باتیں کر رہے تھے۔ جبکہ میں عصر کی نماز پڑھنے کے بعد ابھی تک جائے نماز پر بیٹھی ہاتھ اٹھائے عباس کی زندگی کی دعا کر رہی تھی کہ فون کی بیل ہوئی' عابی نے اٹھ کر فون ریسیو کیا تھا اور پھر یک دم زور سے چیخی تھی۔

''شمو...... عباس مر گیا۔''

''نہیں...... کیا میری ساری دعائیں' سارے آنسو رائیگاں گئے۔ عباس میری وجہ سے مر گیا......'' میری ٹانگوں میں جان نہیں تھی۔ میں نے بمشکل خود کو کھڑا کیا۔

ثمین یک دم سفید ہوتی رنگت کے ساتھ صوفے پر ساکت بیٹھی تھی جبکہ عابی چیخیں مار مار کر رو رہی تھی اور شبیر اسے تھپک تھپک کر تسلی دے رہے تھے۔ میں پتا نہیں کیسے ثمین تک پہنچی تھی۔

''شمو......!'' میں نے اسے گلے لگایا اور پھر مجھے اپنی چیخوں پر اختیار نہیں رہا۔ شبیر عابی کو چھوڑ کر میری طرف لپکے تھے۔ انہوں نے میرے رخسار پر ہلکے سے تھپڑ مارا۔

''ثمی...... ثمی...... ہوش کرو۔'' مجھے ان کی آواز بہت دور سے آتی سنائی دی تھی اور پھر ہولے ہولے سب آوازیں معدوم ہوتی گئیں اور جب دوبارہ مجھے ہوش آیا تو میں ہاسپٹل میں تھی اور شبیر میرے سرہانے بیٹھے تھے۔ ہوش میں آتے ہی مجھے سب کچھ یاد آ گیا اور پھر آنسو بہنے لگے۔ شبیر خاموشی سے مجھے آنسو بہاتے دیکھتے رہے۔

"شمو...... شمو کہاں ہے۔"

"کراچی......"

"کراچی...... کیسے...... کیوں...... کیوں گئی ہے وہ۔"

"میں لے کر گیا تھا عباس کے جنازے پر......"

"پھر وہ آپ کے ساتھ واپس کیوں نہیں آئی؟" شبیر لمحہ بھر خاموش رہے۔

"نروس بریک ڈاؤن ہوگیا تھا اس کا۔ وہاں ہاسپٹل میں ہے۔ بابا اور عابی [ہیں] اس کے پاس۔"

"میں...... مجھے بھی لے چلو وہاں۔"

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے شمو' چند روز تک آجائیں گے وہ۔" شبیر بے حد [سنجیدہ] تھے۔

"ہم گھر کب جائیں گے۔ پلیز شبیر! مجھے گھر لے چلو۔"

میں پھر رونے لگی۔ شبیر نے مجھے رونے سے منع نہیں کیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میں بات کرتا ہوں ڈاکٹر سے۔"

"کیا شمو بہت بیمار ہے...... شبیر اتنے سنجیدہ کیوں ہیں۔ کیا عباس کے بعد شمو بھی...... میں نے کیا کیا...... یہ میں نے کیا......"

میں چیخ چیخ کر رونے لگی اور سر بیڈ کی پٹی سے ٹکرانے لگی۔ شبیر پلٹ آئے اور [نرس] نے مجھے آ کر نیند کا انجکشن لگا دیا۔

● ● ●

پھر بہت سارے دن یونہی گزر گئے۔ ہم ہاسپٹل سے گھر آ گئے' کچھ دنوں بعد [شمو] اور عابی بھی کراچی سے آ گئیں۔ ثمین بے حد کمزور ہو رہی تھی۔ یک دم سفید رنگت ہو رہی تھی۔

"شمو......!"

میں اسے گلے لگا کر رونے لگی' اونچا اونچا' لیکن اس کی آنکھیں خشک تھیں اور [ان کی] ریت اڑتی دکھائی دیتی تھی۔ شبیر نے آہستگی سے مجھے اس سے الگ کر دیا۔

"اسے ڈسٹرب نہیں کرو شمو! وہ موت کے پنجے سے نکل کر آئی ہے۔"

میری آنکھیں تو برس رہی تھیں۔ شبیر اس کا ہاتھ تھامے اس کے کمرے میں [چل دیے]

اور میں وہیں بیٹھ گئی۔ گھٹنوں پر سر رکھے کتنی ہی دیر تک روتی رہی۔ عابی بھی شاید ان کے پیچھے ہی چلی گئی تھی۔ آخر خود ہی تھک کر میں خاموش ہوگئی اور آنسو پونچھ کر اپنے کمرے میں آ گئی' جب سے ہاسپٹل سے آئی تھی میں یوں ہی بیٹھے بیٹھے رونے لگتی تھی۔ بہت سارے دنوں بعد میں نے محسوس کیا تھا کہ عابی' ثمین' شبیر کوئی بھی مجھ سے دانستہ بات نہیں کرتا تھا۔ سب خاموش' کسی نے مجھ سے کچھ کہا نہیں تھا لیکن سب کی آنکھوں میں شکوہ سا نظر آتا تھا۔ شبیر جب بھی نظر اٹھا کر مجھے دیکھتے' مجھے ان کی آنکھیں شکوہ کرتی دکھائی دیتیں۔

"شمو! تم نے ایسا کیوں کیا؟"

میں ہولے ہولے سنبھل رہی تھی اور سب کے رویوں کو محسوس کر رہی تھی۔ "کیا ثمین...... عابی سب جان گئی ہیں اور اگر جان گئی ہیں تو پھر کوئی مجھ سے سوال کیوں نہیں کرتا۔ پوچھتا کیوں نہیں۔"

"عابی......!" ایک روز عابی کالج سے آ کر کتابیں لاؤنج میں پھینک کر اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی تو میں نے اسے پکار لیا۔

"جی ماما!" وہ بھی بے حد سنجیدہ ہوگئی تھی۔

"بیٹا! ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو۔ تم نے پہلے کی طرح ہنسنا بولنا کیوں چھوڑ دیا ہے۔ ثمین بھی ہر وقت کمرے میں گھسی رہتی ہے۔ عباس مجھے بھی بہت عزیز تھا' لیکن مرنے والوں کے ساتھ کوئی مر تو نہیں جاتا بیٹا!"

"ہاں اگر اپنی طبعی موت مرے تو صبر آ ہی جاتا ہے لیکن عباس...... عباس کو تو آپ نے مارا ہے' مما' آپ نے......"

میں ایک دم ساکت رہ گئی۔ عابی تو ایسی ہی تھی ہر بات فوراً کہہ دینے والی پتا نہیں اتنے دن اس نے کیسے صبر کیا تھا' شاید ثمین نے اور شبیر نے اسے منع کیا ہوگا۔

"مما! کیا وہ دوسرا لڑکا عباس سے زیادہ اچھا تھا جو آپ نے عباس کا پرپوزل ٹھکرا دیا اور آپ نے بابا کا نام لگا دیا۔ حالانکہ بابا کو پتا بھی نہیں تھا کہ وہ دوسرا پرپوزل کس کا ہے۔ انہوں نے تو ہر فیصلہ آپ پر چھوڑ رکھا تھا۔ پھر آپ نے ایسا کیوں کیا ماما...... کیوں؟" اس کی آواز بھرا گئی۔

"آپ نے ثمین سے تو پوچھا ہوتا۔"

میں ساکت ہاتھ گود میں دھرے بیٹھی تھی۔ یقیناً کراچی میں یہ سب بھابی نے بتایا ہوگا۔

"بولیں نا...... بولیں ماما! آپ نے کیوں کیا...... ایسا کیوں؟"

وہ رونے لگی اونچا...... اونچا ہمیشہ کی طرح۔

"میں نے کیوں کیا ایسا عابی کیوں کیا؟" میں نے نظریں اٹھائیں۔

"تمہارے لئے...... عابی تمہارے لئے۔"

میری آواز گلے میں پھنسنے لگی۔

"میرے لئے...... میرے لئے۔" وہ رونا بھول کر مجھے دیکھنے لگی۔

"ہاں تمہارے لئے۔ میں نے سمجھا تھا شاید تم...... تم عباس سے محبت کرنے لگی ہو۔"

"ماما! آپ نے مجھ سے تو پوچھا ہوتا۔ میں تو ماما......! میں اور عباس تو ثمین کی باتیں کرتے تھے۔ عباس کہتا تھا تم میری دوست ہو عباس بہت اچھا تھا ماما بہت اچھا اور ثمین اب کبھی خوش نہیں رہ سکے گی۔ وہ دونوں تو ایک دوسرے کے لیے ہی بنے تھے۔ عباس کہتا تھا کہ شاید خدا نے ہمیں ایک دوسرے کے لیے ہی بنایا ہے۔ ماما وہ کہتا تھا شمو نے میرے وجود کا ایک ایک ذرہ اپنی حاکمیت میں لے لیا مما...... مما...... یہ آپ نے کیا کیا...... کیا کیا؟"

"بس وہ ایک لمحہ تھا عابی جب تمہاری محبت ثمین کی محبت پر غالب آ گئی تھی۔"

اس نے ایک تاسف بھری نظر مجھ پر ڈالی اور اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

"عابی!" میں نے جھکی نظریں اٹھائیں اور میری نظریں شبیر سے جا ملیں جانے وہ کب وہاں آئے تھے۔ عابی انہیں سلام کر کے چلی گئی تو انہوں نے میری طرف دیکھا۔

"شمو...... میں نے تمہیں بہت چاہا...... تمہاری بے حد قدر کی۔ میں نے کبھی خود کو تم سے الگ نہیں جانا۔ تم نے عباس کا پروپوزل کیوں رد کیا۔ میں نے یہ جانے بغیر تمہارا بھرم رکھ لیا کہ بات ایسی ہی تھی جیسی تم نے کہی کہ ثمین کے لیے تم پہلے ہی کسی کو ہاں کہہ چکی تھیں۔ لیکن شمو تم نے مجھے تو کہا ہوتا۔ عابی میری بھی تو بیٹی تھی اور تم جانتی ہو شمو اور عابی کو میں اپنی سہیلیاں کہتا ہوں۔ تم مجھ سے کہتی تو میں تمہیں بتاتا کہ عابی تو...... عابی نے مجھے کہہ دیا تھا کہ مون آپ زیب سے بات کریں اگر وہ یہاں رہنے پر آمادہ ہے تو ٹھیک ہے اس کے والدین کو ہاں کر دیں ورنہ چھٹی مجھے تو یہاں ہی رہنا ہے آپ کے پاس...... میں لاہور جا رہا تھا سو

تمہیں عابی کی بات نہ بتا سکا اور دل ہی دل میں اس کی محبت پر نازاں ہوتا رہا کہ ہم سے...... تم سے اور مجھ سے اتنی محبت رکھتی ہے تم نے کیا سمجھا تھا کہ میں......"

میرے پاس شبیر کی کسی بات کا جواب نہ تھا۔ میں یونہی ہاتھ گود میں دھرے ساکت بیٹھی تھی۔ شبیر کچھ دیر خاموش کھڑے مجھے دیکھتے رہے۔ پھر جانے کے لیے پلٹے تو میں نے یک دم دوڑ کر ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"مون! مون! مجھے معاف کر دو پلیز مجھے معاف کر دو۔"

"میں انسانی کمزوریوں پر یقین رکھتا ہوں شمو! میں تم سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب میں عباس کے متعلق سوچتا ہوں جب مجھے ثمین کا خیال آتا ہے تو میرے دل کے آئینے پر جہاں صرف تمہارا ہی عکس ہے گرد چھا جاتی ہے۔ یہ تم نے کیا کیا شمو...... میں ساری زندگی ثمین سے نظر ملا کر بات نہیں کر سکوں گا۔"

"اور کیا میں ثمین سے نظر ملا سکتی ہوں۔"

میری آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے اور شبیر مجھے آہستہ سے تھپک کر چلے گئے۔

لیکن میں پھر کبھی ثمین سے نظر ملا کر بات نہ کر سکی۔ حالانکہ ثمین نے کبھی مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ نہ کوئی گلہ نہ شکوہ۔ عابی اور شبیر نے بھی کوئی بات اس کے بعد نہیں کی۔ ایک لفظ بھی نہیں کہا لیکن شبیر کی آنکھوں میں کبھی کبھی مجھے شکوہ نظر آتا وہ بہت سنجیدہ ہو گئے تھے۔

اور عابی...... وہ تو مجھ سے ناراض ہی ہو گئی تھی۔ میری طرف دیکھتی تک نہ تھی حتیٰ کہ اس نے ایم بی بی ایس کر لیا۔ اس کی شادی بھی جہاں زیب سے طے پا گئی لیکن وہ مجھ سے ناراض ہی رہی زندگی اپنے معمول پر رواں دواں ہو گئی تھی۔

ثمین پھر سے کالج جانے لگی تھی۔

وہ تو پہلے بھی سنجیدہ تھی اب اور بھی سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اس کی سنہری آنکھیں ہر وقت نم ہنے لگی تھیں اور گلابی رخساروں پر ملال کے رنگ بکھرے دکھتے تھے۔ کالج سے آ کر اپنے ٹوڈیو میں چلی جاتی تھی۔

عابی بھی زیادہ وقت اسی کے ساتھ گزارتی تھی۔ میری طبیعت خراب ہوتی ذرا بھی تو ون ثمین عابی میرے گرد اکٹھے ہو جاتے۔ میری دوا خوراک ہر طرح خیال رکھتے لیکن وہ پہلی ی بے تکلفی پیدا نہ ہو سکی۔ جیسے اس مون پیلس میں رہنے والے سب مجھ سے اجنبی ہو گئے

پاکسوسائٹی ڈاٹ کام

تھے۔ عابی‘ شبیر سے خوب باتیں کرتی تھی اور بابا سے بھی...... ہاں مجھ سے صرف ضروری ہی ہوتی تھی۔

میں نے چاہا کہ عابی کے ساتھ ثمین کی بھی شادی کردوں‘ ایک دو بہت اچھے پرو تھے۔ خود اس کے کالج کی لیکچرار اپنے بھائی کے لیے آرزومند تھیں۔ لیکن جب میں ـ سے ذکر کیا تو اس کی آنکھیں پتھر کی طرح سخت ہوگئی۔

"آپا پلیز! مجھ سے اس موضوع پر آئندہ بات نہ کیجئے گا‘ میں نے یہ چیپٹر کلوز ہے۔"

شبیر نے سمجھانا چاہا۔

"اتنی طویل زندگی یوں ہی نہیں گزر سکتی ثمو بیٹا!"

"مون پلیز......! مت کہیں کچھ......"

اس کی آواز بھرا گئی۔ پتھرائی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

"آپ کی یہ بات میرے لئے حکم کا درجہ رکھتی ہے‘ آپ کے اور آپا کے بہت ہیں مجھ پر...... لیکن صرف یہ ایک بات...... اس بات پر مجھے مجبور نہ کریں۔"

"نہیں ثمو......" میں نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

"کوئی قرض نہیں ہمارا تم پر...... فرض تھا ہمارا‘ بیٹی ہو ہماری صرف بہن ہی نہیں ہو

جواب میں اس نے کچھ ایسی نظروں سے مجھے دیکھا کہ میں پانی پانی ہوگئی۔ میر سے کتنی محبت کرتی ہوں‘ یہ میں جانتی ہوں‘ آج بھی عابی سے زیادہ مجھے ثمو سے محبت ہے‘ میں اس پر یہ ثابت نہیں کرسکتی کہ میری ایک ذرا سی لغزش نے مجھے‘ میری محبت کو اس کی نظ میں بے اعتبار کردیا ہے۔

"کیا خبر تھی مجھے‘ کیا پتا تھا مجھے کہ یوں ہوگا ایسے......"

عابی کی شادی ہوگئی۔ وہ جہاں زیب کے سنگ چلی گئی اور پھر اس کی شادی کے یکے بعد دیگرے بابا اور تائی اماں بھی دنیا سے رخصت ہوگئیں۔

دو سال قبل مون بھی رخصت ہوئے اور اس اتنے بڑے مون پیلس میں ثمین ا تنہا رہ گئے ہیں۔ اتنی خاموشی اور ویرانی ہے کہ کبھی کبھی تو میرا جی چاہتا ہے کہ کچھ تو ا زلزلہ ہی آئے تو یہ خاموشی ٹوٹے...... لیکن کچھ نہیں ہوتا......"

عابی کبھی کبھی ویک اینڈ پر آتی ہے اکیلی‘ کبھی بچوں کے ساتھ...... اور سلام دعا کے بعد ثمین کے کمرے میں گھس جاتی ہے۔ بچے بھی آنٹی کے دیوانے ہیں۔

جہاں زیب کو بھی بچے بہت پسند ہیں اور عابی تو مون کی طرح بچوں کی دیوانی تھی۔ سو عابی کے چار بچے ہیں۔ تین بیٹے ایک بیٹی۔

اتنے برس گزر گئے ہیں۔ لیکن میری سزا ختم نہیں ہوئی۔ میرا جی چاہتا ہے کسی روز میں ثمین کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر کہوں۔

"کچھ تو کہو...... مجھے برا بھلا کہو...... مجھ سے لڑو...... مجھے عباس کا قاتل ٹھہراؤ‘ مجھے اپنا قاتل کہو‘ یہ جو اتنا بوجھ ہے یہ تو کچھ کم ہو...... لیکن وہ تو کچھ کہتی ہی نہیں‘ کچھ بولتی ہی نہیں‘ کچھ کہوں تو چپ رہتی ہے۔"

"آپا! میں ٹھیک ہوں‘ آپ فکر نہ کیا کریں۔"

اس نے ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ کیوں عباس پر کسی اور کو ترجیح دی۔ اس سے پوچھے بنا کیوں عباس کا رشتہ ٹھکرا دیا۔ اس نے کوئی گلہ نہیں کیا۔ وہ پوچھتی کوئی گلہ کرتی تو میں کیا کہتی۔ کیا تھا کہنے کو میرے پاس کہ میں نے عابی کیلئے...... عابی جو میری بیٹی ہے۔ بیٹی کی محبت‘ بہن کی محبت پر غالب آ گئی تھی۔

وہ نہیں جانتی میں نے ایسا کیوں کیا؟"

عابی نے......

شبیر نے...... کسی نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ میرا بھرم رکھ لیا‘ لیکن خود مجھ سے دور ہوگئے اور وہ جو نہیں جانتی اس نے کبھی پوچھا نہیں‘ ہاں ایک جامد چپ ہے جس نے اس کی آنکھوں کو ہمیشہ کے لیے ٹھکانا بنا لیا ہے۔

میرا جی چاہتا ہے وہ عباس کو بھول کر زندگی کو اوڑھ لے‘ لیکن وہ کہتی ہے۔

"کیا یہ ممکن ہے میں عباس کو بھول جاؤں‘ جو میری محبت میں جان سے گزر گیا۔ میں اپنی زندگی ختم نہیں کرسکتی‘ کیونکہ یہ گناہ ہے‘ لیکن میں زندگی کو اس کی رنگینیوں سمیت اپنا بھی نہیں سکتی۔" ایک بار اس نے عابی سے کہا تھا۔

میرے آنسو ہمہ وقت میرے اندر گرتے رہتے ہیں۔

میں کتنی تنہا ہوگئی ہوں‘ میرا کتنا دل چاہتا ہے کہ میں بھی عابی‘ ثمین اور بچوں کے ساتھ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

مل جل کر بیٹھوں۔

ثنین کی شادی کسی بہت اچھے شخص سے ہو جائے' اس کا اپنا گھر ہو...... بچے ہوں
نے بھی کئی بار کہا ہے ثنین سے کہ وہ شادی کر لے لیکن ثنین کی ایک نہ ہاں میں نہیں بدلتی
جب طلحہ پیدا ہوا تھا تو وہ سات دن کے طلحہ کو گود میں لے کر ثنین کے پاس
تھی۔

"لو شمو! یہ تمہارا بیٹا ہے سنبھالو اسے۔"

"پاگل ہو گئی ہو تم......"

ثنین نے طلحہ اس کو واپس کر دیا۔

"تمہارے سسرال میں اس بچے کی کتنی ضرورت ہے' کتنا انتظار تھا سب کو اس کا۔
"اور بچے ہو جائیں گے لیکن یہ تو تمہارا ہے۔"

"عابی! تمہاری محبتوں کے لیے میں بہت ممنون ہوں مجھے اور زیر بار نہ کرو پلیز
یوں بھی اپنی جاب کی وجہ سے بچے نہیں سنبھال سکتی۔"

اور پھر طلحہ کے بعد بلال اور طلال...... ہر بار ہی عابی نے چاہا کہ ثنین کسی ایک
اپنا لے۔ لیکن ہر بار ہی ثنین نے انکار کر دیا۔

"یہ پہاڑ سی زندگی کیسے گزارو گی شمو؟"

عابی نے ہمیشہ ہی اس سے کہا۔

"میرا کوئی بچہ لے لو...... اب تو بچے بڑے ہو گئے ہیں' تمہیں سنبھالنے کا کوئی م
نہیں ہے۔"

لیکن وہ مسکرا کر خاموش ہو جاتی ہے اور یوں زندگی گزر رہی ہے۔

وہی روٹین ہے' صبح ثنین کالج چلی جاتی ہے اور میں مون پیلس کے کمروں میں دیوا
وار چکراتی پھرتی ہوں' وہ آجاتی ہے...... تب بھی تنہائی ختم نہیں ہوتی۔

بہت پہلے ایک بار عابی نے کہا تھا۔

"پتا ہے ماما ثنین نے مجھ سے کہا تھا' تم زیب سے شادی کر لو اور اس کے ساتھ ا
سسرال میں رہو۔ عباس کا اپنا کوئی گھر نہیں ہے۔ اسے اپنا گھر بنانا ہے۔ الگ کہیں بھی
ہمیشہ اپنے بھائی کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ سو ہم یہاں ہی گھر بنا لیں گے۔ ہمیشہ یہاں ہی ر

گے مون پیلس میں...... میں عباس سے کہوں گی۔ بابا والے حصے میں ہم رہیں گے۔ شمو نے
مجھ سے وعدہ کیا تھا تب ہی تو میں نے زیب سے صلح کی تھی...... اب شمو ہے نا آپ کے پاس
اس نے اپنا وعدہ نباہ دیا ہے لیکن عباس نہیں ہے۔"

"عابی مجھے معاف کر دو بیٹا......" میں نے التجا کی تھی۔

"ماما! آپ کو کیا پتا آپ نے کیا کیا ہے...... آپ نے ثنین سے ہی عباس کو نہیں
چھینا...... مجھ سے بھی میرا بھائی لے لیا ہے۔"

"میں نے دانستہ کچھ نہیں کیا...... عابی! تو جانتی ہے نا مجھے ثنین کتنی پیاری ہے۔"

"میں آپ سے ناراض نہیں ہوں نہ ہی ثنین آپ سے خفا ہے۔"

"لیکن کہنے سے کیا ہوتا ہے' وہ میرے پاس تو ٹھہرتی ہی نہیں۔ بس سلام کرتی ہے اور
سیدھی ثنین کے کمرے میں' اور...... پھر ان دونوں کی باتوں اور ہنسی کی آواز مجھے آتی رہتی
ہے۔

اور میں لاؤنج...... کمرے اور کمرے سے لاؤنج تک کے بے مقصد چکر لگاتی رہتی
ہوں کہ شاید......

شاید انہیں میرا خیال آ جائے۔

شاید عابی ابھی بھاگتے ہوئے آئے اور میرے گلے میں بانہیں ڈال کر کہے۔

"ماما! آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں اکیلی۔ آئیں نا ہمارے پاس آ کر بیٹھیں۔"

"یا پھر ثنین ہی آ جائے۔"

"ارے آپا! آپ اتنی اداس کیوں ہیں' طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔"

لیکن کوئی نہیں آتا دونوں میں سے' وقفے وقفے سے عابی کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ وہ
ذرا سا دروازہ کھول کر رقیہ کو آواز دیتی ہے۔

"رقیہ چائے' رقیہ جوس...... رقیہ پکوڑے' رقیہ کھانا ادھر کمرے میں لے آؤ۔"

اور پھر زیب آ جاتا ہے اسے لینے' ہمیشہ کی طرح ادب سے سلام کرتا ہے۔ بیٹھتا ہے'
حال چال پوچھتا ہے۔ کبھی کبھار میرے اصرار پر کھانے کے لیے بھی رک جاتا ہے۔ جب
بچے بھی ساتھ ہوں' کھانا انتہائی خاموشی سے کھایا جاتا ہے اور کھانا کھاتے ہی عابی اٹھ کھڑی
ہوتی ہے۔ میرا کتنا جی چاہتا ہے کہ اسے روک لوں' چند دنوں کیلئے...... جب سے شبیر نے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

اکیلا چھوڑا ہے۔ رات کو میرا دل بہت گھبراتا ہے۔ شبیر زیادہ بات نہیں کرتے تھے' پھر بھی ان
کی موجودگی کا احساس تو ہوتا تھا نا...... اور اب......

کاش عابی اپنا غصہ ختم کر دے۔

کاش شین میرا قصور معاف کر دے۔

"تو مجھے سکون ملے...... کتنے سالوں سے میں کتنی بے سکون ہوں کتنی بے چین ایک ذرا
سی غلطی نے میری عمر بھر کی ریاضتوں پر پانی پھیر دیا ہے...... ہوتا ہے نا کبھی کبھی ایسا کہ ذرا
سی غلطی عمر بھر کی ریاضتوں کو رائیگاں کر دے اور میری بھی عمر بھر کی ریاضتیں رائیگاں چلی گئی
ہیں۔ بس ایک ذرا سی غلطی ایک ذرا سی لغزش......"

● ● ●

اور مجھے کبھی کبھی ماما پر بہت ترس آتا ہے' جب وہ بے اختیار میری طرف لپکتی ہیں تو میں
انہیں نظر انداز کر کے شین کے کمرے کی طرف چلی جاتی ہوں تو گھنٹوں مجھے اس پر افسوس ہوتا
رہتا ہے۔ لیکن میں کیا کروں' جب میں شین کی بے رنگی زندگی کو دیکھتی ہوں تو مجھے ماما پر غصہ
آتا ہے اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیسے کس طرح اس دکھ کی تلافی کروں' جو ماما نے
شین کو پہنچایا۔ ماما نے کتنی بڑی غلطی کی ہے ایسی غلطی جس کی تلافی ممکن نہیں۔

نہ ہی عباس اعوان واپس آ سکتا ہے اور نہ ہی درشین کی بے رنگ زندگی میں رنگ آ سکتے
ہیں۔ وہ اتنا ہی چاہتی تھی عباس اعوان کو کہ اس کے بعد کسی اور کو اس کا ذہن قبول ہی نہیں
کرتا۔

میں جب کراچی گئی تھی تب ہی میں نے جان لیا تھا کہ درشین اور عباس ایک دوسرے کو
پسند کرنے لگے ہیں اور پھر کراچی سے واپس آ کر میں نے شین سے اقرار کروا کے ہی چھوڑا۔

"عباس بہت اچھا ہے عابی' بہت ہی دھیمے مزاج کا۔"

"بالکل تمہارے جیسا...... ہے نا......" میں ہنسی تھی۔

"ہاں بالکل میرے جیسا۔ عابی میں تمہیں کیا بتاؤں وہ کتنا اچھا ہے۔"

اور مجھے تو عباس پہلی نظر میں ہی اچھا لگا تھا' اب اور بھی اچھا لگنے لگا تھا۔ بالکل
بھائیوں جیسا۔ میں اسے عباس ہی کہہ کر بلاتی تھی۔ ہم دونوں اکثر بیٹھے شین کی باتیں کرتے
رہتے تھے۔ شین تو ہمیشہ سے ہی کم گو تھی۔ مجھے پتا تھا وہ کبھی بھی اپنے دل کی بات عباس سے

نہیں کہہ سکتی' سو میں نے ہی یہ فرض نبھایا تھا اور شین کی بے قراری و بے تابی اس کی کیفیات
عباس تک پہنچانا اور عباس کے احساسات' شین تک پہنچانا میں نے بنا کہے ہی اپنے ذمے
لے لئے تھے۔

میں عباس کے ساتھ اکثر شین کی شادی کے پروگرام بنایا کرتی تھی۔ عباس ہر ویک اینڈ
کو آ جایا کرتا تھا۔ شین ان دنوں کسی کمپٹیشن میں حصہ لینے کے لیے کچھ تصاویر بنا رہی تھی۔ سو
ہم اسے ڈسٹرب نہیں کرتے تھے۔ جب وہ فارغ ہوتی تو خود ہی ہمارے پاس آ جاتی' اور ماما
نے سمجھا۔

میں اور عباس......"

عباس اور میں......"

"اف...... اوہ کتنا غلط سوچا ماما نے اور پھر مجھ سے تصدیق بھی نہیں چاہی۔ پوچھا تک
نہیں' حالانکہ میں تو...... میں تو بہت پہلے سے ہی زیب کے ساتھ وعدہ کر چکی تھی زندگی
گزارنے کا اور شین کو اس بات کا علم تھا اور ہم دونوں تو بچوں کی طرح لڑا کرتے تھے اور شمو
ہمیں سمجھاتی رہتی تھی۔ ہماری پہلی لڑائی اس بات پر ہوئی تھی کہ زیب کا خیال تھا کہ مجھے اپنی
پڑھائی چھوڑ کر گھر داری سیکھنی چاہئے' کیونکہ گھر میں ایک ہی ڈاکٹر کافی ہے۔ جب کہ میرا
خیال تھا کہ میں نے اتنی محنت اس لئے نہیں کی تھی کہ آدھے راستے سے ہی واپس پلٹ آؤں
۔ تب شین نے ہی ہماری صلح کروائی تھی کہ مجھے ڈاکٹر ضرور بننا چاہئے' البتہ پریکٹس کے متعلق
بعد میں سوچا جا سکتا ہے۔ ہماری اکثر لڑائیاں زیادہ طول نہیں کھینچتی تھیں۔

عموماً دو تین گھنٹے بعد ہماری صلح ہو جاتی تھی' لیکن ان دنوں جب ماما نے مجھے روتے
دیکھا تھا۔ ہمارے درمیان سخت لڑائی تھی۔ پتا نہیں کیوں ایک دن اچانک ہی میرے دل میں
خیال آیا تھا کہ جب میری اور شین کی شادی ہو جائے گی تو ماما اور مون تو بالکل اکیلے رہ جائیں
گے۔ آخر کوئی تو ہو ان کے پاس اور میں نے زیب سے کہا تھا کہ میں صرف اس صورت میں
اس سے شادی کروں گی جب شادی کے بعد وہ میرے ساتھ یہاں مون پیلس میں رہے۔

"یہ کیسے ممکن ہے عابی......!"

زیب حیران رہ گیا تھا اور پھر اسی بات پر ہماری سخت لڑائی ہو گئی تھی۔ بہت سارے
دنوں سے ہمارے درمیان بول چال بند تھی۔ اس لئے میں پکنک پر بھی اداس تھی' ممی نے

زیب کے سامنے یہ شرط رکھ دی تھی کہ میں صرف اسی شخص سے شادی کروں گی جو شادی
بعد یہاں...... "مون پیلس" میں رہے۔ چونکہ زیب اس کے لیے تیار نہیں تھا سو میں اا
میں تھی۔ میں زیب کے علاوہ کسی اور کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی اور ماما پاپا کو بھی اکیلا نہیں
سکتی تھی اور ماما نے جانا کہ میں اس لئے اداس ہوں کہ عباس ثمین پر زیادہ توجہ دے رہ
اور پھر اس روز فون پر زیب نے مجھے اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔

"میں اپنے والدین کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ ایسے ہی جیسے تم نہیں چھوڑ سکتیں۔ اگر یہ
امتحان تھا' آزمائش تھی تو میں اس میں ہار چکا ہوں...... تمہاری ضد بے جا ہے۔ میرے
بھائی ہوتے تو میں سوچتا بھی' لیکن اب میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ تمہارا...... میرا تعلق
یہیں تک تھا خدا حافظ۔"

میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ ابھی ریسیور میرے ہاتھ میں ہی تھا کہ
آ گئیں اور میں نے درثمین کے کمرے میں چلی آئی۔ میں نے ماما سے اپنے آنسو چھپا
تھے۔ لیکن ثمین کے سامنے میں ضبط نہ کرسکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ثمین کو ساری
پتا چلی تو اس نے مجھے ہی ڈانٹا۔

"کس قدر احمق ہو تم...... اور کس قدر بے وقوفانہ حرکت کی ہے تم نے۔ ابھی فون
زیب کو اور سوری کرو اس سے' تم نے اسے بھی اذیت دی ہے اور خود کو بھی تکلیف پہنچا
ہے۔"

"نہیں ثمو! میں مون کو اور ماما کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ میں ہمیشہ ان کے ساتھ رہ
گی۔"

"میں ہوں نا پگلی! پھر تمہیں کیا فکر ہے۔"

"اور عباس کا کیا ہوگا ثمو!"

میں نے بے وقوفی سے پوچھا تھا۔

اور تب ہی ثمو نے وہ بات کہی تھی کہ وہ اور عباس ہمیشہ مون پیلس میں رہیں گے
سب کا خیال رکھیں گے۔ ماما کا مون کا نانا جان اور دادی جان کا......"

اس روز ہم دیر تلک باتیں کرتے رہے اور اس روز ہی میں نے جانا کہ ثمو عباس کو کا
شدت سے چاہتی ہے۔

"یہ محبت...... کیسے اچانک حملہ آور ہوتی ہے' عابی اور پھر یوں جسم و جان پر قابض ہوتی
ہے کہ اس ایک شخص کے سوا کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ میں سوچتی ہوں عابی! اگر خدانخواستہ کبھی
عباس مجھ سے جدا ہو گیا تو میں کیسے جی پاؤں گی اور تم نے اتنی بڑی بات کیسے کہہ دی زیب
سے' کیسے جیو گی اس کے بغیر۔"

اور پھر ثمو نے ہی میری زیب سے صلح کروائی تھی اور اسے نانا سے ملنے کو اور اپنے
والدین کو مون پیلس آنے کو کہا تھا اور میں نے ثمو اور عباس کی شادی کے کتنے پروگرام بنا
ڈالے تھے۔ میں نے ماما سے مون کو ثمو اور عباس کی شادی کی بات کرتے سنا تھا اور ثمو کو گلے
لگا کر میں نے اسے مبارکباد دی تھی۔

"بے فکر رہو اپنے ساتھ ساتھ تمہاری بھی شادی کروا کر جاؤں گی۔"

ثمو کے چہرے پر رنگ ہی رنگ تھے اور وہ اتنی خوبصورت لگ رہی تھی کہ اگر عباس
دیکھ لیتا تو پاگل ہو جاتا۔

"نہیں پلیز' مجھے اپنا ایم بی بی ایس کر لینے دو پھر......"

"چلو ٹھیک ہے لیکن منگنی وغیرہ تو ہو جانی چاہئے۔ تمہارا کیا پتا۔ کل پھر تمہارے دماغ
میں کوئی فتور آ جائے اور تم بے چارے زیب کی جان نکال لو۔ محبت کرنے والوں کو امتحان
میں نہیں ڈالتے جانو!"

"ایک بات تو بتاؤ ثمو تم عباس سے زیادہ محبت کرتی ہو یا عباس تم سے......"

"پتا نہیں۔" وہ مسکرائی۔

"محبت کو یوں کیسے ناپا جا سکتا ہے۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ جب سے میرے دل
میں عباس کی شبیہ اتری ہے تب سے مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں عباس کے بغیر ادھوری ہوں۔"

اور عباس نے ایک بار کہا تھا۔

"درثمین' مجھے لگتا ہے جیسے آپ میرے وجود میں ضم ہو گئی ہو۔ اس خیال سے ہی میرا دم
گھٹنے لگتا ہے کہ اگر آپا اور شبیر بھائی نے انکار کر دیا تو۔ میں تو مر جاؤں گی ثمو......"

اور ایسا ہی ہوا تھا عباس مر گیا تھا' اتنی خاموشی سے...... اتنا اچانک کہ کتنے ہی دن تک
مجھے یقین ہی نہیں آیا۔

ثمین کو نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ماما کو ہاسپٹل میں ایڈمٹ کروانا پڑا۔

مون پیلس میں یک دم اداسیاں اتر آئی تھیں۔

میں اور ثمین پاپا کے ساتھ گئے تھے' کراچی عباس کو آخری بار دیکھنے۔ وہیں ثمین کو ہاسپٹل میں ایڈمٹ کروانا پڑا...... مون مجھے ثمین کے پاس چھوڑ کر ماما کے پاس آ گئے تھے۔ وہاں عباس کی بھابی نے یہ روح فرسا انکشاف کیا تھا کہ ماما نے...... ہاں میری ماما نے ثمین کا رشتہ عباس کو دینے سے انکار کر دیا تھا اور عباس......"

"مگر کیوں...... عباس میں کیا کمی تھی۔ ماما نے ایسے کیوں کیا؟"

اور جب ماما نے بتایا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا تھا تو لمحہ بھر تو مجھے یقین ہی نہیں آیا...... ماما ثمین کو اتنا چاہتی تھیں' مجھ سے بھی زیادہ...... پھر

"وہ ایک کمزور لمحہ تھا عابی! جب تیری محبت مجھ پر غالب آ گئی تھی۔"

ماما رو رہی تھیں لیکن میرا دل جیسے پتھر ہو گیا تھا۔

"یہ آپ نے اچھا نہیں کیا ماما......"

میں ان کے پاس سے چلی آئی۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیسے اس دکھ کا کفارہ ادا کروں جو ماما کی وجہ سے درثمین کو ملا ہے۔ مون نے اور میں نے کتنی کوشش کی کہ ثمین کو دوبارہ زندگی کی طرف لے آئیں' لیکن جو زندگی اس کے اندر مر چکی ہے اسے پھر نمو نہیں ملی

وہ اتنی خاموش اور چپ چپ رہنے لگی ہے کہ کبھی کبھی تو اس کی خاموشی سے مجھے ہول اٹھنے لگتا ہے۔ اس نے عباس کے متعلق مجھ سے کبھی بات نہیں کی۔ ایک بار...... صرف ایک بار کراچی میں ہی اس نے کہا تھا۔

"عابی! آپا نے ایسا کیوں کیا...... شاید وہ سمجھتی ہوں گی عباس کے پاس اپنا گھر نہیں ہے' وہ بھائی کے پاس رہتا ہے...... شاید انہوں نے میرے لئے کوئی اونچا خواب دیکھا ہو لیکن انہوں نے مجھ سے پوچھا تو ہوتا عابی میں جانتی ہوں عابی انہوں نے ایسا میری محبت میں کیا ہوگا' لیکن ان کی اس محبت نے مجھ سے میری زندگی چھین لی۔

عباس کے بنا...... میں کیسے جیوں گی۔"

اور وہ کیسے جی رہی ہے۔ یہ صرف میں جانتی ہوں' میں نے راتوں کو اسے تڑپتے روتے اور بلکتے دیکھا ہے۔ اس کا ایک ایک آنسو میرے دل پر گرتا رہا ہے۔ پوری پوری رات

جاگ کر آنسو بہا کر تڑپ کر وہ صبح منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل کر کالج چلی جاتی ہے۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ عباس کو بھول چکی ہے۔

وہ بھلا عباس کو کیسے بھول سکتی ہے۔ اس کی محبت' تو اس کی رگ رگ میں سما چکی ہے اور جب میں راتوں کو اسے بلکتے دیکھتی تو مجھے ماما پر غصہ آتا' لیکن میرا غصہ عباس کو واپس نہیں لا سکتا۔ نہ ہی درثمین کی اجڑی زندگی میں رنگ بکھیر سکتا ہے۔

میں نے ثمین کو کبھی نہیں بتایا کہ ماما نے ایسا کیوں کیا تھا۔ نہ ہی مون نے کبھی کہا۔ پھر بھی ثمین لاشعوری طور پر ماما سے دور ہو گئی ہے۔ شاید وہ ماما کو عباس کا قاتل سمجھتی ہے۔ شاید وہ سمجھتی ہے کہ اگر ماما انکار نہ کرتیں تو عباس زندہ رہتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے ان سے محبت نہیں رہی ہے۔ ماما کو ذرا تکلیف ہو تو وہ تڑپ اٹھتی ہے' بے چین ہو جاتی ہے۔ بالکل میری طرح۔

میں بھی تو ماما سے بہت محبت کرتی ہوں۔ گھر میں ہوتی ہوں تو ماما کے لیے بے چین رہتی ہوں۔ جانتی ہوں کہ ثمین اپنے کمرے یا سٹوڈیو میں ہوگی اور ماما کسی بے چین روح کی طرح ایک کمرے سے دوسرے اور دوسرے کمرے سے تیسرے میں چکر لگا رہی ہوں گی۔ سو یہ سنتے ہی بھاگی چلی آتی ہوں' لیکن مون پیلس میں داخل ہوتے ہی جانے مجھے کیا ہو جاتا ہے کہ میں ماما کو نظر انداز کر کے ثمین کے کمرے میں چلی آتی ہوں' شاید اس طرح میں لاشعوری طور پر اس دکھ کی تلافی کرنے کی کوشش کرتی ہوں جو ثمین کو میری اور ماما کی وجہ سے پہنچا' لیکن کچھ دکھ ایسے ہوتے ہیں جن کی تلافی ممکن نہیں ہوتی۔

میں نے کتنا چاہا کہ ثمین شادی کر لے' لیکن ثمین مانتی ہی نہیں۔

میرا دل ہر وقت کسی اور کے خیال میں رہتا ہے عابی! میں تمہاری محبت کی قدر کرتی ہوں' لیکن میں اس کو وہ محبت اور توجہ نہیں دے پاؤں گی جو اس کا حق ہے۔"

"اب جو بھی تم سمجھو' لیکن زندگی میں جینے کا کوئی تو جواز ہو۔"

"جینا کون چاہتا ہے عابی!" ثمین افسردہ تھی۔

"جو بھی ہو شمو! تمہیں اب فیصلہ کرنا پڑے گا۔"

میں نے پرانے انداز میں کہا تو ثمین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی' اتنے سالوں بعد اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی تھی۔

پاکسوسائٹی ڈاٹ کام

"تم نہیں بدلو گی عابی! حالانکہ تین بچوں کی اماں جان بن چکی ہو۔"

"ہاں تو دادی بن کر بھی نہیں بدلوں گی ثمو...... پتا ہے زیب کہتا ہے' یار! اب تو نہ لڑا کرو...... بچے کیا سوچیں گے۔ لیکن پھر خود ہی کسی بات پر لڑ بیٹھتا ہے۔"

ثمین کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

"دیکھو! اس در و دیوار کی ویرانی دور ہوجائے گی۔" ثمین نے یہ سب سن کر سر جھکا لیا۔

اور ثمین کے جھکے سر سے مجھے یوں لگا جیسے مدتوں سے میرے سینے پر دھرا بوجھ کم ہوگیا ہو...... جیسے میں نے اس دکھ کی کچھ نہ کچھ تلافی کردی ہو' جو ماما کی وجہ سے ثمین کو ملا اور بوجھ کم ہوا تو مجھے ماما کا خیال آیا جو باہر لاؤنج میں اکیلی بیٹھی تھیں...... میں نے آتے ہوئے انہیں سلام کیا تھا اور پھر ان کی آنکھوں کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اندر آگئی تھی۔ مجھے ثمین سے بہت محبت تھی' یہ نہیں کہ مجھے ماما سے محبت نہیں تھی' مجھے ان سے بھی بہت محبت تھی لیکن میں تو کفارہ ادا کرنے کی کوشش میں سب بھولی ہوئی تھی۔

مون پیلس میں داخل ہوتے ہی مجھے عباس یاد آجاتا' مجھے ثمین کی تنہائی بے چین کردیتی۔

یہاں مون پیلس میں میں نے ثمین اور عباس کو ان کے بچوں کے ساتھ تصور کیا تھا اور اب یہ خالی ویران مون پیلس......

"عابی! آپا کو معاف کردو' اب وہ بہت اکیلی ہیں۔"

ثمین نے اچانک کہا تو میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

"ثمو...... تم...... کیا تم نے بھی انہیں معاف کردیا ہے؟"

میں نے اس سے پوچھا تو وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے مجھ سے نگاہیں چرا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ میں لمحہ بھر اسے دیکھتی رہی' پھر اٹھ کر باہر آگئی۔

ماما ابھی تک لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔ خاموش اور اداس' ان کی آنکھوں میں سرخی تھی' شاید وہ کچھ دیر پہلے روئی تھیں' میں نے بغور انہیں دیکھا۔ وہ کتنی کمزور اور بوڑھی لگ رہی تھیں حالانکہ وہ ہمیشہ ہماری بڑی بہن لگتی تھیں۔ نرم دل' فریش اور تر و تازہ لیکن ثمین کے حادثے کے بعد وہ بالکل مرجھا گئی تھیں۔ پھر نانا جان دادی جان اور آخر میں مون سب ہی ایک ایک کرکے چلے گئے اور مون کے بعد تو...... میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔

"ماما! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے' آپ کچھ بیمار لگ رہی ہیں۔"

میں نے قریب جا کر کہا تو انہوں نے چونک کر حیرت سے مجھے دیکھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔"

"نہیں...... آپ ٹھیک نہیں ہیں ماما!" میں ان کے قدموں کے پاس کارپٹ پر بیٹھ گئی۔ "چلیں کچھ دنوں کے لیے میرے ساتھ میرے گھر...... میں زیب سے کہوں گی آپ کا چیک اپ کروادے۔"

"عابی تم......!" وہ ابھی تک حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔

"تم نے مجھے معاف کردیا عابی۔"

"ماما!" میں نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔ "میں آپ سے ناراض نہیں تھی بس مجھے دکھ تھا' مجھے ثمین کا دکھ تھا۔ مجھے عباس کی موت کا دکھ تھا بس...... مجھے......"

اور میں اونچا اونچا رونے لگی۔ بچپن کی طرح' ماما نے مجھے ایک دم دونوں بازوؤں میں لیا اور میں کتنی ہی دیر تک ان کے سینے سے لگی روتی رہی۔ جیسے ثمین آج اجڑی ہو اور عباس ابھی مرا ہو۔ ماما کی آنکھیں بھی برس رہی تھیں۔

"ماما......!" کچھ دیر بعد میں سنبھلی تو میں نے انہیں پھر اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ اتنے برسوں میں نے انہیں نظر انداز کیے رکھا اور اب جیسے میرا دل پھٹ رہا تھا۔

"نہیں' میں بھلا تمہارے ساتھ کیسے جاسکتی ہوں عابی! ثمو اکیلی ہوجائے گی۔" انہوں نے بے بسی سے مجھے دیکھا۔ انہیں آج بھی ثمو سے اتنی ہی محبت ہے جتنی پہلے تھی۔

"آپ ثمو کو مجھ سے زیادہ چاہتی ہیں نا مجھے پتا ہے۔"

میں نے بچپن کی طرح ٹھنک کر کہا تو انہوں نے بھی بالکل پہلے کے سے انداز میں پیشانی چومی۔

"نہیں تو...... تم دونوں ہی میری جان ہو۔"

"ماما! آپ ثمو کو اتنا چاہتی تھیں پھر بھی...... پھر بھی ماما......"

"ہاں پھر بھی......!" انہوں نے بے چینی سے اپنے ہاتھ ملے۔

"کبھی کبھی ہوتا ہے نا ایسا کہ عمر بھر کی ریاضت رائیگاں چلی جاتی ہے بس ایک ذرا سی ایک ذرا سی لغزش' پتا نہیں ثمو...... کبھی مجھے معاف بھی کرے گی یا نہیں۔"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ان کی آواز بھیگ گئی تو میں نے ہولے سے ان کا ہاتھ دبایا اور انہیں آنمو
آنکھوں میں تسلی دی۔

جس طرح اس نے آج مجھے معاف کردیا ہے' اسی طرح ایک روز وہ ماما کو بھی
کردے گی۔"

"تجھے یقین ہے عابی......"

"ہاں...... مجھے یقین ہے۔"

میں مسکرائی' اور ان کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کیا۔

"چلیے...... شمو کے کمرے میں چل کر بیٹھتے ہیں' اس نے دو بہت پیاری تصویریں
ہیں۔"

وہ میکانکی انداز میں اٹھ کھڑی ہوئیں اور میں ان کا ہاتھ تھامے اس یقین سے
کمرے کی طرف بڑھی کہ آج نہیں تو کل...... کل نہیں تو پرسوں ایک روز تو شمو انہیں
کرے گی ہے نا۔

اور شمن ہمیں ساتھ آتا دیکھ کر مسکرا دی۔ اس کے چہرے پر عباس کے بچھڑ جا
اب بھی لکھا نظر آ رہا تھا۔ مگر ایک فیصلے پر پہنچ جانے کی طمانیت بھی۔

* * *

اپنے اور پرائے چاند

گرم دوپہروں میں کوریڈور میں ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے اس کی آنکھیں تپتے
صحراؤں کی طرح لگتی ہیں' جن میں ریت اڑ رہی ہوتی ہے اور جب یہ ریت اڑ کر مجھ تک آتی
ہے تو میں بے چین ہو کر اے سی کی خنکی سے باہر نکل آتی ہوں اور اس کے کندھوں پر ہاتھ
رکھتے ہوئے سوچتی ہوں۔

"تم۔تم اس کی محبتیں تو کجا اس کی نفرتوں کے قابل بھی نہیں تھے اسغر علی خان! لیکن اس
کی بدنصیبی کہ اس نے تم سے محبت کی اور آج بھی وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ شاید اتنی ہی
شدت سے لیکن تم۔"

وہ خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتی ہے اور آہستگی سے میرے ہاتھ کندھوں سے ہٹا کر
پھر سے ٹہلنے لگتی ہے۔

"مت کرو انو! مت کرو اپنے ساتھ یہ ظلم۔"

میں سسک پڑتی ہوں۔ لیکن اس کے پیچھے پیچھے چلتی رہتی ہوں۔

"باہر بہت گرمی ہے۔ چلو اندر چل کر بیٹھو۔ چلو ہم اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں۔ ہنسنے
ہنسانے والی باتیں۔"

لیکن وہ میری طرف دیکھتی ہی نہیں' جیسے کسی گہرے گیان میں ہو اور میری طرف دیکھے
گی تو اس کا گیان ٹوٹ جائے گا۔

"انو! میری خاطر پلیز۔ دیکھو بابا کو پتا چلا کہ میں تمہارا خیال نہیں رکھ رہی ہوں تو وہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

تمہیں واپس بلا لیں گے اور پھر تم جانتی ہو نا بابا تمہاری یہ حالت دیکھیں گے تو۔'' اور وہ چلتے چلتے رک جاتی ہے اس بے دھیانی میں بھی اسے دھیان رہتا ہے کہ وہ اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچائے۔ خاص کر بابا کو اور خاموشی سے سر جھکائے میرے ساتھ اندر چلی آتی ہے۔ اور پھر میں اسے ہنسانے کے لیے کتنی ہی دلچسپ باتیں کرتی ہوں۔ کتنے ہی لطیفے سناتی ہوں لیکن وہ یونہی بیٹھی رہتی ہے۔ ساکت گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے' جانے کیا سوچتی ہے وہ۔ حالانکہ وہ کتنا ہنسا کرتی تھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر۔

اسے تو نہ ہنسنے والی باتوں پر بھی ہنسی آتی تھی اور میں حیران ہوا کرتی تھی۔

''انو! بھلا اس میں ہنسنے والی کیا بات ہے؟''

''ہے نا!'' وہ ہنسے چلی جاتی۔

''اور تمہیں یاد ہے اسفر علی خان! جب ایک نمائش میں سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ سامنے والے موٹے شخص کو دیکھ کر بے تحاشا ہنس رہی تھی اور تم نے کہا تھا۔

''انوشا جانتی ہو۔ انعم اتنا کیوں ہنستی ہے؟''

''کیوں بھلا؟'' میں نے پوچھا تھا۔

''اس لئے کہ اسے پتا ہے کہ یہ ہنستے ہوئے خوبصورت لگتی ہے۔ بے حد خوبصورت۔''

اور میں نے انعم کو دیکھا تھا۔ وہ اب بھی ہنس رہی تھی اور اس کے بائیں رخسار کا وہ ننھا سا سیاہ تل اس کے ڈمپل میں گم ہو ہو کر ابھر رہا تھا' جیسے دور نیچے کہیں بھنور میں کوئی گم ہو ہو کر ابھرے اور اس کی بے حد لانبی پلکوں والی براؤن آنکھوں میں بھی ہنسی کے تارے جگ مگ کر رہے تھے۔ وہ واقعی ہنستے ہوئے بے تحاشا خوبصورت لگتی تھی۔

''دراصل ویسے تو یہ ایویں سی ہی لگتی ہے نا۔''

تمہاری آنکھوں میں شرارت تھی۔

''اب تو مجبوری ہے جیسی بھی ہوں ایویں یا شیویں۔''

اس نے بے حد آہستگی سے کہا تھا' لیکن میں نے سن لیا تھا اور اس وقت تم دونوں نے جس طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا میں چونک پڑی تھی اور پہلی بار مجھ پر انکشاف ہوا تھا کہ تم دونوں...... لیکن جب میں نے اس سے پوچھا تھا۔

''انو! کیا تم اور اسفر۔''

''ارے نہیں۔'' وہ ہنس دی تھی۔

اور مجھے اس کی بات پر یقین آ گیا تھا' یہ تو بہت بعد میں مجھے پتا چلا تھا کہ تم نے اسے منع کیا تھا کہ وہ کسی سے بھی تمہارے اور اپنے متعلق ذکر نہ کرے۔ حتیٰ کہ مجھ سے بھی نہیں۔ میں جو اس کی چچا زاد بہن ہی نہیں تھی بلکہ گہری دوست بھی تھی اور ہم بچپن سے اکٹھے ایک ہی گھر میں رہتے آ رہے تھے اور اس نے کبھی زندگی میں کوئی بات مجھ سے چھپائی نہ تھی۔ لیکن اتنی بڑی بات کا اس نے مجھ سے ذکر تک نہ کیا تھا۔ ہاں اس کی براؤن آنکھیں ہنستے ہوئے اور بھی دلکش لگنے لگی تھیں اور اس کی گندمی رنگت میں بلا کی ملاحت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ ہنسنے لگی تھی۔ لیکن اب تو اسے کسی بات پر ہنسی نہیں آتی۔ اس کی دلکش آنکھوں میں ہر وقت ریت اڑتی رہتی ہے۔

ہنسی کے سارے جگ مگ جگ مگ کرتے تارے مر گئے ہیں اور چھوٹے چھوٹے خم کھائے ہوئے گلابی ہونٹ یوں بند رہتے ہیں جیسے کبھی کھلے ہی نہ تھے اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے اسفر علی خان۔

اور اس میں کہیں شاید کچھ تھوڑا قصور میرا بھی ہے کہ اس سے تمہیں میں نے ہی تو متعارف کروایا تھا اسفر علی خان کاش...... کاش اس روز میں اسے اپنے ساتھ آنے پر مجبور نہ کرتی۔ لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ ایسا ہوگا اور وہ تو میرے ساتھ جانے کو قطعی تیار نہیں تھی۔

''چھوڑو یار! کیا بوریت ہے۔ اب گھنٹہ دو گھنٹہ احمقوں کی طرح بیٹھ کر مغرور اور خود پسند شاعروں کا کلام سننا انتہائی نامعقول تفریح ہے۔''

''تمہیں نہیں پتا نا انو! وہاں کتنے بڑے بڑے شاعر ہوں گے اور...... اور وہاں راحت عابدی بھی ہوگا۔ اف کس قدر خوبصورت لکھتا ہے اور پڑھتا کس قدر خوبصورت ہے۔''

تو بھئی' کیا مصیبت ہے وہاں جا کر اسے سننے کی۔ راحت کی نئی کتاب میں تمہیں اس کے برتھ ڈے پر گفٹ کر دوں گی۔ آرام اور سکون سے بیٹھ کر پڑھنا۔'' اس نے دریا دلی کا مظاہرہ کیا۔

''نہیں چاہئے مجھے تمہارا گفٹ۔ ناصر بھائی یہاں ہوتے ناں تو مجھے کوئی ضرورت نہ تھی تمہاری منت کرنے کی۔''

میں روٹھ کر اس کے کمرے سے چلی آئی تھی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

انعم میرے تایا کی بیٹی تھی۔ اکلوتی بیٹی۔ تایا نے تائی کی وفات کے بعد دوسری شادی نہیں کی تھی۔ ہم سب ایک ہی گھر میں رہتے تھے اور انعم ہم سب کی لاڈلی تھی' مجھ سے سال بھر ہی چھوٹی ہوگی اور ہم دونوں میں بے حد پیار تھا۔ ابا' اماں اور ناصر بھی اسے بے حد چاہتے تھے۔ ناصر بھائی مجھ سے بڑے تھے۔ ہم صرف دو ہی بہن بھائی تھے۔ اماں نے انعم کو کبھی ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ تایا ابا کو ہم سب ہی بابا کہتے تھے اور ابو کو ابا۔

ناصر نے سی اے کیا تھا جبکہ مجھے اردو ادب میں دلچسپی تھی اور ادب کی طالبہ تھی۔ مجھے شعر و شاعری سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔

اور خود بھی ٹوٹے پھوٹے شعر کہنے کی کوشش کیا کرتی تھی اور یوں ہی ٹوٹے پھوٹے شعر کہتے کہتے میں نے اچھا خاصا لکھنا شروع کر دیا تھا اور یونیورسٹی کے مشاعروں میں حصہ لیا کرتی تھی۔ جبکہ انعم فائن آرٹس کی طالبہ تھی' اسے شعر و شاعری سے قطعی دلچسپی نہ تھی' اس کے پاس کتابوں کا جو ذخیرہ بھی تھا وہ فائن آرٹس کے متعلق ہی تھا۔

اس روز بزم ادب سوسائٹی کی طرف سے مشاعرے کی تقریب ہو رہی تھی۔ جشن آزادی کے سلسلے میں ہماری بزم ادب سوسائٹی نے یہ مشاعرہ منعقد کروایا تھا اور چونکہ میں اس سوسائٹی کی ایک ممبر تھی اس لئے مجھے بھی بہرحال وہاں جانا تھا اور اکیلے جانا میرے لئے ممکن نہ تھا سو یہ جاننے کے باوجود کہ انعم کو مشاعروں سے کوئی دلچسپی نہ تھی میں اس کی منت کر رہی تھی اور وہ تھی کہ ٹال رہی تھی۔

"ٹھیک ہے' میں بھی اکیلی چلی جاؤں گی۔"

میں انعم سے سخت خفا تھی اور جلدی جلدی تیار ہو رہی تھی کہ وہ آ گئی۔ کندھے پر بیگ لٹکائے۔

"چلو مرو۔"

"کوئی ضرورت نہیں مجھ پر احسان کرنے کی' میں اکیلی بھی جا سکتی ہوں۔ یوں بھی تو روز یونیورسٹی اکیلی ہی جاتی ہوں۔ وہ تو میں نے تمہارے خیال سے کہا تھا کہ گھر میں تنہا بور ہوگی۔"

"تمہیں پتا ہے' میں بور نہیں ہوتی۔ میرے رنگ اور میرے برش مجھ سے باتیں کرتے ہیں۔"

"رنگوں اور برش سے کھیلنا کوئی زیادہ اچھا کھیل نہیں ہے۔"

میں نے اسے چھیڑا۔ مجھے پتا تھا کہ اسے رنگوں سے بے حد محبت ہے۔

"یہ کھیل نہیں ہے انوشا بی بی! بڑا سنجیدہ کام ہے۔"

وہ بے حد خوش مزاج تھی' ہر وقت ہنستی رہتی تھی۔ کوئی نہ کوئی شرارت اس کے ذہن میں ہوتی تھی اور حقیقت یہ تھی کہ اس کے دم سے ہی گھر میں رونق تھی' لیکن جب وہ اپنے اسٹوڈیو میں ایزل پر جھکی ہوتی تو اتنی سنجیدہ اور اپنے کام میں گم ہوتی کہ پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ یہ وہی انعم ہے جو ابھی کچھ دیر پہلے کچن میں کھڑی کر ماں بی بی سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی۔ یا ان کے پاس بیٹھی انہیں لطیفے سنا رہی تھی۔

تمام راستہ وہ میرا دماغ کھاتی رہی۔

"سنو انوشا! یہ شاعر حضرات سے اتنی دلچسپی اچھی نہیں ہے۔ یہ بس یوں ہی سے ہوتے ہیں ایویں سے۔ ہر وقت چوٹ کھانے بلکہ لگانے کے لیے تیار رہتے ہیں اور دل ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں۔ جہاں کوئی حسین مہ جبیں نظر آ گئی وہیں ایک عدد غزل کے ساتھ اپنا دل ہتھیلی پر رکھ کر تحفے میں پیش کر دیا اور تم ہو بھی خوبصورت زہرہ جبیں' وہ کیا کہتے ہیں۔ چاند چہرہ ستارا آنکھیں...... گلاب ہونٹ وغیرہ وغیرہ۔"

"اچھا فضول نہ بکو۔" میں جھینپ گئی۔ "سب ایسے نہیں ہوتے' بہت سنجیدہ لوگ بھی ہوتے ہیں۔"

"ہائے دادے' یہ راحت عابدی کیسا بندہ ہے؟ یقیناً دل پھینک ہوگا۔"

"ایسے ہی فضول نہ بکو۔" میں راحت عابدی کی زبردست فین تھی۔ "کسی کے متعلق بری طرح جانے بغیر کچھ نہیں کہنا چاہئے۔"

"اب دیکھو ناں جو بندہ ہر مہینے دو کتابیں مارکیٹ میں لے آتا ہے۔ تو بلاوجہ تو نہیں نا سب۔ آخر کچھ واردات تو گزرتی ہوگی اس کے دل پر' جسے رقم کرتا ہوگا اور تم لڑکیاں خواہ مخواہ پاگل ہوتی رہتی ہو۔ جبکہ نہ جانے کس کے ہجر و فراق میں وہ شعر کہے ہوں گے اس نے۔"

"انو! جس بات کا تجھے پتا نہیں ہے اس پر تبصرہ نہ ہی کیا کر۔ اب میں نے غزل کہی تو کیا مجھ پر کوئی واردات گزری ہے۔ یہ تو تخلیقی عمل ہے اور یہ صلاحیت انسان کو ودیعت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ہوتی ہے اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ دل پر چوٹ کھائی ہو۔"

"اچھا۔ لیکن تم نے چوٹ کھائی نہیں تھی۔ رات کو جب اماں نے تمہیں ڈانٹا تھا دیر سے اٹھنے اور نماز نہ پڑھنے پر۔ یہ غزل اس کے بعد ہی تو ہوئی تھی نا۔"

وہ نچلے ہونٹ کا کونا دانتوں تلے دبائے شرارت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"فضول۔" میں ہنس پڑی۔ "یہ غزل تو میں نے کئی دن پہلے لکھی تھی۔ آج تو بس کانٹ چھانٹ کر رہی تھی۔"

"اچھا۔"

اور پھر اسے شعراء کے متعلق لطیفے یاد آنے لگے اور ہنستے ہنستے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جب اس نے گاڑی پارکنگ میں پارک کی تو میرا چہرہ بے تحاشا ہنسنے سے سرخ ہو رہا تھا۔

"خیر' آج دیکھیں گے تمہارے شاہکار بھی۔" اس نے گاڑی لاک کی۔

"کیوں کیا شاعر انسان نہیں ہوتے؟۔" میں نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

"تمہاری باتوں سے تو کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگتے ہیں۔"

"ارے شانو! تم نے اتنی دیر کردی۔" ہال میں داخل ہوتے ہی مومنہ میری طرف لپکی۔

"سوری یار! یہ ان محترمہ کی وجہ سے دیر ہوگئی ہے۔" میں نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

"اچھا خیر' چلو تم' بابر صاحب کئی بار تمہارا پوچھ چکے ہیں۔"

بابر صاحب! ہماری اس ادبی تنظیم کے انچارج تھے۔

مومنہ چونکہ انتظامی کارکنوں میں تھی۔ اس لئے خاصی گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے جلدی میں انعم سے سلام دعا کی اور اسے اگلی نشستوں پر بٹھا کر مجھے تقریباً گھسیٹتی ہوئی اپنے ساتھ لے گئی۔

مشاعرہ خاصا کامیاب رہا تھا۔ مجھ سمیت کئی نئے شعراء کو بھی خاصی داد ملی تھی اور بہت سراہا گیا تھا۔ غزل پڑھتے ہوئے کئی بار میری نظریں انعم کی طرف اٹھیں اور ہر بار جب میری نظر اس سے ملتی' وہ آنکھ مار کر مسکرانے لگتی۔ جس سے لمحہ بھر کے لیے تو میں خاصی پزل ہو جاتی

تھی۔ راحت عابدی خاصی دیر سے آئے تھے اور جب وہ سٹیج پر پہنچے تو اس وقت میں مومنہ وغیرہ کے ساتھ مل کر چائے وغیرہ کے انتظام میں لگی تھی۔ میں اپنی غزل پڑھ کر سٹیج سے نیچے اتر آئی تھی۔ ایک تو مومنہ نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں آخر وقت تک وہاں نہ بیٹھوں گی بلکہ اس کی ہیلپ کے لیے آجاؤں اور دوسرے مجھے انعم کی خبر لینی تھی۔ جو مجھے پزل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن مومنہ نے مجھے بیچ میں سے ہی اچک لیا تھا اور میں ڈائننگ ہال کی کھڑکی سے جھانک جھانک کر شعراء کو وقتاً فوقتاً سننے کی کوشش کرتی رہی اور جب بابر صاحب نے راحت عابدی کے آنے کی اطلاع دی تو میں نے بہت چاہا کہ مومنہ کے پنجے سے رہائی حاصل کرلوں' لیکن وہ مومنہ ہی کیا جو آسانی سے مجھے جانے دیتی۔

"دیکھو' ایک دو شاعر باقی ہیں اور پھر یہاں سب ہلہ بول دیں گے اور اگر ذرا بھی گڑبڑ ہوئی ناں تو بابر صاحب خبر لیں گے اور دیکھو پلیز ذرا سالم کا پتا کرو۔ سموسے لینے گیا تھا۔ غائب ہی ہوگیا۔"

"لیکن وہ راحت عابدی؟"

"دیکھو۔ وہ سب سے آخر میں آئیں گے۔ تب تک ہم سب فارغ ہو جائیں گے۔ تم سن لینا ان کو۔"

لیکن جب میں سالم کو مع سموسوں کے شاپرز سمیت گیٹ پر سے گرفتار کر کے لائی تو مشاعرہ ختم ہو چکا تھا اور بابر صاحب سب کا شکریہ ادا کر رہے تھے اور مہمان شعراء کو چائے کی دعوت دے رہے تھے۔

میں سالم کے ہاتھوں سے سموسے تقریباً چھینتے ہوئے اندر کی طرف جہاں چائے کا انتظام تھا' بھاگی۔ کیونکہ شاعر حضرات سٹیج سے نیچے آرہے تھے اور سالم اپنے بھاری بھرکم ڈیل ڈول کے ساتھ جب تک مومنہ تک رسائی حاصل کرتا۔ تب تک شعراء چائے کی ٹیبل پر ہلہ بول چکے ہوتے اور ہوا بھی یہی' ابھی میں اور مومنہ آخری ڈش میں سموسے ڈال کر سیدھے ہوئے ہی تھے کہ بابر صاحب شعراء حضرات کی رہنمائی کرتے ہوئے ہال میں داخل ہوئے۔

"تھینک گاڈ!" مومنہ نے ہاتھ میں پکڑا شاپر اپنے پیچھے کھلنے والی کھڑکی سے باہر پھینکا۔

"یہ سالم انتہائی نکما ہے۔"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

''بالکل۔'' میں نے تائید کی۔

''میں بابر صاحب سے اس کی شکایت کروں گی۔''

''ضرور۔''

میں شعراء اور دوسرے خاص مہمانوں کے ہجوم میں راحت عابدی کو ڈھونڈ رہی تھی۔

''اب دیکھو ناں' سموسے ڈشوں میں کیسے بے ڈھنگے انداز میں پڑے ہیں۔''

ظاہر ہے' ہم نے ڈشوں میں سموسے سجانے کے بجائے یوں ہی شاپر الٹ دیئے تھے' مومنہ کی نفاست پسند طبیعت کو انتہائی ناگوار گزر رہے تھے اور اس کا دھیان شعراء کے بجا سموسوں کی ڈشوں کی طرف تھا۔

''بھئی' خواتین مہمانوں کو آپ اٹینڈ کریں اور اگر آپ کے ساتھ کوئی ہے تو انہیں ہم بلا لیں۔''

بابر صاحب نے ہمارے قریب آتے ہوئے آہستگی سے کہا تو میں چونکی۔

''ارے انعم!'' میں باہر کی طرف بھاگی۔

وہ تو یقیناً میری جان کو کوس رہی ہوگی۔ یعنی اس ہڑبونگ میں' میں اسے بالکل ہی بھول گئی تھی اور اب آئندہ وہ میرے ساتھ ہرگز نہیں آئے گی اور میں اس کی یہ ناراضگی کسی بھی طرح افورڈ نہیں کرسکتی تھی۔ کیونکہ ناصر اپنی جاب کے سلسلے میں کراچی چلا گیا تھا اور مجھے کہیں بھی جانے کے لیے اس کی ہی منت کرنا پڑتی تھی۔ خود مجھے ڈرائیونگ سے خوف آتا تھا' حالانکہ انعم اور ناصر دونوں نے ہی بے حد کوشش کی تھی کہ میں سیکھ لوں' لیکن میں نے آٹھ دس دنوں میں چار بار تو گاڑی فٹ پاتھ پر چڑھا دی۔ دوبارہ ایک ریڑھی اور خوانچے والے کو ٹکر ماری اور پھر توبہ کرلی۔ میں نے ہال میں آکر دیکھا تقریباً پورا ہال خالی تھا۔

کہاں چلی گئی۔ کافی دیر تک میں اِدھر اُدھر اسے ڈھونڈتی پھری۔ پارکنگ تک میں دیکھ آئی اور جب انتہائی مایوس ہوکر واپس آئی تو دیکھا وہ مزے سے مومنہ کے ساتھ کھڑی سموسہ پلیٹ میں رکھے ہولے ہولے تبصرہ کررہی تھی اور مومنہ بمشکل اپنی ہنسی ضبط کررہی تھی۔

''اتنی لمبی داڑھی کے ساتھ آخر وہ شعر کس طرح کہتے ہوں گے' یقیناً ان کے اشعار بھی ان کی داڑھی کی طرح لمبے چوڑے ہوتے ہوں گے' ہیں ناں موی؟''

''داڑھی کی بچی!'' میں نے ہولے سے اس کی پیٹھ پر دھموکا مارا۔ ''تم یہاں ہو اور میں

باہر تمہیں ڈھونڈتی رہی۔''

''بھئی' مجھے پتا تھا تم مصروف ہو۔ لہٰذا میں خود ہی آگئی۔''

''اور میں سمجھ رہی تھی کہ تم......''

''یعنی میں سامعین کے ساتھ باہر نکل گئی ہوں۔ جی نہیں' میں جانتی تھی کہ میں تمہاری مہمان ہوں' یوں بھی اگلی نشست میں میرے ساتھ بیٹھی ہوئی خواتین ادھر ہی آرہی تھیں اور اب اگر میں تمہارے انتظار میں وہاں رہ جاتی تو میری تو بے عزتی ہوجاتی تھی۔ کیوں موی؟''

''ہاں ہاں بھئی۔ تم تو وی آئی پی تھیں۔'' مومنہ ہنسی۔

''یار! تمہاری اس کزن نے ساری تھکن اور بیزاری دور کردی ہے۔'' مومنہ نے مجھے چائے پکڑائی۔

''جی نہیں۔ پہلے میں کچھ لوں گی۔''

میں نے ٹیبل پر نظر ڈالی۔

''افسوس کچھ نہیں بچا تمہارے لئے۔ تمہارے یہ شاعر حضرات اس قدر کھاتے ہیں' حالانکہ میں نے سکول کے زمانے میں پڑھا تھا کہ ان کے پاس کھانے کے لیے صرف غم ہوتا ہے' لیکن لگتا ہے موجودہ دور کے شعراء غم کے علاوہ اور سب کچھ کھا لیتے ہیں۔''

''خدا کے لیے انو! تھوڑی دیر کو تمہاری زبان بند نہیں ہوسکتی؟''

''بہت بھوک لگی ہے؟ لو میرے ساتھ شیئر کرلو۔''

اس نے اپنی پلیٹ میری طرف بڑھا دی۔

''اور ہاں وہ تمہارے راحت عابدی صاحب۔'' وہ کھل کھل کر کے ہنس پڑی۔ ''درشن ہوئے صرف یا ملاقات بھی ہوئی؟''

''نہ درشن نہ ملاقات۔'' از حد افسوس کے ساتھ میں نے ہال میں نظر ڈالی۔ زیادہ تر شعراء رخصت ہورہے تھے۔

''کہاں ہیں وہ؟'' میں نے مومنہ سے پوچھا۔

''وہ تو......'' مومنہ نے بھی چاروں طرف دیکھا۔

''ابھی تو بابر صاحب کے ساتھ تھے' شاید ان ہی کے ساتھ باہر چلے گئے ہیں۔''

''اُفوہ!'' میں روہانسی ہوگئی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

کس قدر اشتیاق تھا مجھے انہیں دیکھنے اور ان سے ملنے کا۔ میں ان سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ اس قدر اور اتنا بے تحاشا کیسے کہہ لیتے ہیں۔ ہر ماہ ان کی ایک کتاب مارکیٹ میں آ جاتی تھی اور مزے کی بات یہ تھی ہر کتاب کو یکساں پذیرائی مل رہی تھی اور نئی نسل تو ان کی شاعری کی دیوانی تھی۔

''کوئی بات نہیں جانو! ابھی وہ ادھر ہی ہوں گے۔ میں نے بابر صاحب کو تنظیم آفس کی طرف جاتے دیکھا ہے۔ یقیناً عابدی صاحب ان کے ساتھ ہوں گے۔ تم چائے پی لو پھر چلتے ہیں۔ ادھر۔'' مومنہ نے مجھے پکارا۔

''اور اگر تم اس وقت مجھے سالم کے پیچھے نہ دوڑاتیں تو میں کم از کم ان کو سٹیج پر سن لیتی۔''

مجھے سچ مچ بہت رونا آ رہا تھا اور کتنے ہی مشاعرے میں نے صرف عابدی صاحب کو دیکھنے اور سننے کے لیے اٹینڈ کیے تھے' لیکن اتفاق سے وہ کسی بھی مشاعرے میں نہیں آئے تھے اور آج۔ چائے میرے حلق میں نمکین سی ہو گئی۔

''انوشا ڈارلنگ! میں نے تو ان کو دیکھا اور سنا ہے۔ ایک ہی بات ہے۔'' اس نے مجھے تسلی دی۔

''گھر چل کر میں تمہیں ان ہی کے لہجے میں ان کی ساری غزل سنا دوں گی۔ اس کی یادداشت غضب کی تھی اور آوازیں پیدا کرنے اور نقلیں اتارنے کی ماہر تھی۔

''وہ کیسے تھے؟'' میں نے بے حد اشتیاق سے پوچھا۔

''زبردست۔ بالکل تمہارے تصور کے عین مطابق۔''

اس کے بائیں رخسار کے ڈمپل میں ننھا سا سیاہ تل ڈوبنے ابھرنے لگا۔

''اس میں آخر ہنسی کی کیا بات ہے انو؟'' میں جھلا گئی۔

''کیوں موی! ہنسی کی تو کوئی بات نہیں۔''

''ہاں۔ بالکل بھی نہیں۔''

مومنہ نے بھی اس کی تائید کی اور تب ہی بالکل پیچھے آ کر کسی نے مجھے سلام کیا تھا۔

''السلام علیکم مس انوشا!''

اور یہ تم تھے اسفر علی خان۔

''کیسی ہیں آپ؟''

گھنی مونچھوں تلے تمہارے بھرے بھرے گداز لبوں پر دلکش مسکراہٹ تھی۔ میں نے پلٹ کر تمہیں دیکھا۔

''کیا پہچانا نہیں؟'' تم بدستور مجھے دیکھ رہے تھے۔

''نہیں' کیوں نہیں۔ کیسے ہیں آپ؟''

اس سے پہلے میں ایک ہی بار تم سے کسی مشاعرے میں ملی تھی۔

''آپ کی غزل اچھی تھی۔ کوشش کرتی رہیں تو ایک دن یقیناً نام کمائیں گی۔''

''تھینک یو اور آپ کی نظم اور غزل دونوں ہی بے حد اچھی تھیں۔''

''اور یہ حقیقت تھی اسفر علی خان کہ تم بہت تیزی سے اپنا مقام بنا رہے تھے۔ ابھی تمہاری ایک ہی کتاب چھپی تھی' لیکن اس کتاب کو بے تحاشا پذیرائی ملی تھی اور اس کے اب تک تین ایڈیشن چھپ چکے تھے۔

''تھینک یو مس!'' تم نے جواباً میرا تھینک یو مجھے لوٹا دیا تھا۔

''اور آپ کے کیا مشاغل ہیں؟ اس روز تو اتنی تفصیلی بات نہ ہو سکی تھی۔ رینو نے آپ کی بڑی تعریف کی اور میں دنوں تک سوچتا رہا کہ کبھی آپ سے دوبارہ ملاقات ہو تو آپ کا کلام سنا جائے۔''

تمہاری نظریں بدستور میرے چہرے پر تھیں' لیکن میری نگاہیں کھڑکی سے باہر بھٹک رہی تھیں کہ شاید بابر صاحب کے ساتھ مجھے راحت عابدی جاتے دکھائی دے جائیں' لیکن نہ بابر صاحب نظر آ رہے تھے اور نہ ہی عابدی صاحب۔

رینو غالباً تمہاری کوئی عزیز تھیں اور مومنہ کی چھوٹی بہن کی بے حد گہری دوست۔ اس روز آرٹس کونسل میں ہونے والے اس مشاعرے میں رینو نے مجھے تم سے متعارف کروایا تھا۔

''یہ انوشا ہیں اور آپ کی برادری سے تعلق رکھتی ہیں یعنی شاعرہ ہیں اور بہت خوبصورت غزل کہتی ہیں۔''

''یہ تو خود سراپا غزل ہیں۔'' تمہارے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور لہجے میں بے حد لی۔

''اور انوشا! یہ اسفر علی خان مستقبل کے عظیم شاعر۔''

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

میں ذرا سا چونکی تھی۔ تمہارا نام ان دنوں بہت سنا جا رہا تھا۔ اگرچہ میں نے تمہیں نہ پڑھا تھا' تاہم مومنہ اور دوسری کلاس فیلوز سے تمہاری بے حد تعریف سنی تھی اور تمہاری کتاب بھی آ چکی تھی۔ تم بے حد گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ اور شاید ابھی کچھ اور یاد کرتے کہ تمہیں سٹیج پر بلا لیا گیا۔ اگرچہ اس پہلی ملاقات میں تمہاری شخصیت کا کوئی بہت اچھا تاثر نہیں پڑا تھا مجھ پر' تاہم اس روز تمہاری غزل اور تمہاری آواز مجھے پسند آئی تھی اور مشاعرے کے اختتام پر میں نے تمہاری غزل کی تعریف کی تھی' جسے تم نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا تھا اور پھر کالج کی کچھ لڑکیاں تم سے آٹوگراف لینے لگی تھیں اور میں مومنہ کے ساتھ وہاں سے چلی آئی تھی۔ لڑکیوں میں کھڑے تم خاصے خوش لگ رہے تھے اور اس پہلی ملاقات میں تم مجھے کچھ فلرٹ ٹائپ اور چھچھورے سے لگے تھے۔ ٹین ایجر لڑکوں کی طرح۔ حالانکہ رینو نے بتایا تھا کہ تم ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی میں جاب کرتے ہو۔

''تو آپ بھی شاعر ہیں؟''

انعم نے اچانک پلیٹ ٹیبل پر رکھ کر اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ شاید اس سارے عرصہ میں تمہارا جائزہ لیتی رہی تھی۔

تم نے ایک دم چونک کر یوں اسے دیکھا تھا جیسے اب تک اس کی موجودگی سے بے خبر رہے ہو۔

''دراصل مجھے کسی شاعر کو قریب سے دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ لیکن آپ تو بالکل ہمارے جیسے ہی انسان لگ رہے ہیں' یعنی دو ٹانگیں' دو آنکھیں اور ایک ناک اور ایک سر۔''

یک دم تمہاری آنکھوں میں دلچسپی سی نظر آئی اور تم اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ انعم ایسی ہی تھی۔ پہلی نظر میں اس کا کوئی تاثر نہیں پڑتا تھا' لیکن دوسری نظر ڈالنے کے بعد بندہ تیسری نظر ڈالنے پر ضرور مجبور ہو جاتا تھا۔ اس کا حسن ہولے ہولے نمایاں ہوتا تھا۔ چاندنی کی طرح جو آہستہ آہستہ پھیلتی ہے اور پھر پوری کائنات کو لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ گندمی رنگت' رخساروں پر سرخی کی چمک' آنکھیں بہت بڑی نہیں تھیں۔ لیکن براؤن رنگ کی آنکھوں پر بے حد گھنی لانبی مڑی ہوئی پلکیں تھیں جو ان آنکھوں کو بے تحاشا خوبصورت بنا دیتی تھیں' ترشے ہوئے گلابی ہونٹ۔ براؤن ریشمی سیدھے بال جو کمر تک آتے تھے' بائیں گال پر ایک ننھا سا سیاہ تل اور جب وہ ہنستی تو اسی رخسار پر ڈمپل پڑتا تھا۔ لمبی صراحی دار گردن کے دائیں

طرف بھی ایک سیاہ تل تھا اور یہ دونوں تل اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے تھے۔ بہت مناسب سانچے میں ڈھلا جسم۔ وہ ایک کونے میں خاموش کھڑی ہوتی تو کسی کو اٹریکٹ نہیں کرتی تھی' لیکن جب بات کرتی اور ہنستی تو مخاطب کو اسیر کر لیتی۔ سارا حسن اس کے لہجے میں' اس کی ہنسی میں چھپا تھا۔ ایسے میں اپنی بے حد گوری رنگت' نیلی آنکھوں اور دلکش سراپے کے باوجود میں ماند سی پڑنے لگتی تھی۔ حالانکہ اس کے ہونٹ لپ اسٹک اور آنکھیں کاجل سے ہمیشہ بے نیاز رہی تھیں۔

''نہیں۔ ان کے ایک دم بھی ہوتی ہے۔'' پتا نہیں کیوں میں چڑ سی گئی۔

''اچھا۔''

''مگر ان کی تو کہیں نہیں ہے۔''

انعم نے آگے پیچھے دیکھنے کا تاثر دیتے ہوئے انتہائی معصومیت سے کہا تو تم بے اختیار ہنس دیئے۔

''یہ انعم ہے۔ انعم جمال میری کزن۔'' میں نے متعارف کروایا۔

''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔''

تمہارے ہونٹوں پر ابھی تک مسکراہٹ تھی اور تم پوری طرح انعم کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

''کیا کرتی ہیں آپ۔ یقیناً پڑھتی ہوں گی۔ کیا سبجیکٹ ہے انوشا والا؟''

''نہیں۔ میں فائن آرٹس کی طالبہ ہوں۔ این سی اے میں۔''

''ارے مجھے بھی رنگوں اور برش سے بہت محبت رہی ہے۔ میرا خواب تھا کہ میں بھی اسی کالج سے گریجویشن کروں اور ایک دن ایک بڑا مصور بنوں۔ اپنا خواب دوسروں کے ہاتھوں میں دیکھنا کیسا لگتا ہے میں اس کیفیت کو محسوس کر رہا ہوں۔''

تب ہی مومنہ نے میرا ہاتھ دبایا۔

''وہ..... وہ دیکھو' بابر صاحب اپنے آفس سے باہر آ رہے ہیں اور ان کے ساتھ عابدی صاحب۔''

میں نے جلدی سے کہا اور تمہارے اور انعم کی طرف دیکھے بغیر مومنہ کا ہاتھ پکڑ کر باہر بھاگی۔ کس قدر گریز تھا مجھے عابدی صاحب سے ملنے اور انہیں دیکھنے کا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

عابدی صاحب سے مل کر میں انتہائی مایوس ہوئی تھی۔ عجیب منحنی سی شخصیت تھی۔ د
پتلے وجود پر میسولینی ٹائپ مونچھیں خاصی مضحکہ خیز لگ رہی تھیں۔ اس پر ان کی تنک مزاجی

"بی بی! میں تو پہلے ہی بہت لیٹ ہو چکا ہوں۔"

"سر پلیز! دو منٹ۔ یہ انوشا ہیں' آپ کی بہت فین ہیں۔"

مومنہ کے التجا کرنے پر انہوں نے انتہائی تنک مزاجی سے کہا تھا۔

"یہ انوشا بہت ٹیلنٹڈ ہیں۔ بہت خوبصورت کہہ رہی ہیں۔" بابر صاحب نے ہ
تعارف کروایا تو پھر جیسے احسان کرتے ہوئے وہ لمحہ بھر کو ٹھہر سے گئے تھے۔

"جی کہیے بی بی!"

بہت تنقیدی نظر تھی ان کی۔ سر تا پایوں گھور کر دیکھا تھا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں ل
جانے کا ارادہ ہو۔

"بہت خوبصورت شاعری ہے آپ کی بہت متاثر کن۔"

بمشکل میری زبان سے نکلا تھا۔ اب کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا۔ ان کی شخصیت کا سار
بت دھڑام سے گر کر چور چور ہو گیا تھا۔

"شکریہ بی بی!"

لفظ اس طرح ان کے ہونٹوں سے نکلے تھے جیسے پتھر اور روڑے لڑھکا دیئے ہوں۔

"افوہ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ شخص اس قدر دل گداز شاعری کرتا ہوگا۔ جانے کس سے
لکھواتا ہے؟"

اس کے جانے کے بعد میں نے جل کر مومنہ سے کہا تھا اور مومنہ بے اختیار ہنس پڑی
تھی۔

"ہاں بعض اوقات ہمارا امیج اسی طرح ٹوٹتا ہے۔" ہم کچھ دیر وہیں کھڑے عابدی کی
شخصیت پر تبصرہ کرتے رہے تھے اور جب واپس آئے تو سالم بے چارہ رابی اور منظر کے
ساتھ مل کر ٹیبلز سے خالی ڈشیں اور پلیٹیں اٹھا رہا تھا اور انعم کہیں نہیں تھی۔

"یہ انعم کہاں ہے؟"

"باہر۔" سالم نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر جواب دیا تھا۔ "وہاں لان میں اسفر علی کے
ساتھ کھڑی گپ لگا رہی ہے۔"

"اچھا ہائے! میں انہیں خدا حافظ کہہ کر باہر نکلی۔ مومنہ اور سالم چلاتے ہی رہ گئے۔

"تم بہت فضول ہو انوشا! ہمارے ساتھ کام کرواؤ۔" لیکن میں بھاگ آئی۔

"بھگتو۔ مشاعرے کا مشورہ جشن آزادی کی خوشی میں تم نے ہی دیا تھا۔"

"اور راحت عابدی سے ملنے کا شوق کسے تھا؟"

مومنہ وہاں سے ہی چلائی۔

اور میں ہنستی ہوئی لان کے اس کونے کی طرف آ گئی' جہاں تم کچھ لڑکیوں کو آٹوگراف
دے رہے تھے اور انعم تمہارے سامنے ہی کھڑی ہولے ہولے مسکرا رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی
اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"ملاقات ہو گئی اپنی پسندیدہ شخصیت سے؟"

"ہوں۔" میرا حلق اندر تک کڑوا ہو گیا۔

"کیسی شخصیت تھی موصوف کی؟ بہت زبردست ہوگی۔"

نچلے ہونٹ کا دایاں کونا دانتوں تلے دبائے وہ بے حد شریر نظروں سے مجھے دیکھ رہی
تھی۔ "چلو گھر چلیں۔ دیر ہو رہی ہے۔" میں نے اس کی بات کا جواب گول کر دیا۔

"ارے اتنی جلدی۔ ابھی تو مس انعم جمال سے جی بھر کر بات ہی نہیں کی۔ دراصل یہ
لڑکیاں آ گئی تھیں آٹوگراف لینے۔"

تم نے اپنے ہاتھ میں پکڑی آٹوگراف بک لڑکی کو واپس کرتے ہوئے میری طرف
دیکھا تھا۔

"پھر کبھی سہی۔ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔"

"آپ اتنے غصے میں کیوں لگ رہی ہیں مس انوشا! کیا عابدی صاحب سے ملاقات
نہیں ہوئی؟"

غالباً میری عدم موجودگی میں انعم تمہیں عابدی صاحب سے متعلق میرے کریز کو بتا چکی
تھی۔"

"جی ہو گئی ملاقات۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ تلخ ہو گیا اور انعم کھلکھلا کر ہنس
دی۔

"لگتا ہے' عابدی صاحب کی شخصیت پسند نہیں آئی تمہیں۔"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

''مجھے ان کی شخصیت سے کیا لینا ہے اور یہ تم بلاوجہ کیوں ہنس رہی ہو۔ بند دانت۔''

میں نے اپنا غصہ انعم پر نکالا۔ حقیقت یہ ہے کہ عابدی کی شخصیت نے ازحد مایوس کیا اور غیر محسوس طور پر میں جھنجلا رہی تھی۔

''میں نے مدتوں بعد ایسی سچی کھری اور شفاف ہنسی سنی ہے مس انوشا! انہیں دیں۔'' تمہارے لہجے میں ایک دم اداسی در آئی تھی۔

''یہ ہنسی آج کے اس دور میں بہت انمول ہے' مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔''

''کیوں کیا آپ کے اردگرد رہنے والے لوگ چھوٹی ہنسی ہنستے ہیں یا ہنستے ہی نہیں'' پھر ہنسی۔

''میرے اردگرد سب ہی جھوٹ ہے انعم! مجھے تو اپنا آپ بھی جھوٹ ہی لگتا ہے۔ لوگوں نے جھوٹ کے لبادے اوڑھ رکھے ہیں اور اصلی چہرے ان دبیز لبادوں کے پیچھے کہیں گم گئے ہیں۔'' تب پہلی بار میں نے تمہیں غور سے دیکھا تھا اسفر۔ تمہاری شخصیت میں کشش تھی اور آواز میں ایک سحر سا تھا۔ تم راحت عابدی سے کس قدر مختلف شخصیت کے مالک تھے۔ درمیانے قد کے گندمی رنگت والے نوجوان سے لڑکے تھے تم۔ کشادہ پیشانی' آنکھیں قدرے چھوٹی لیکن خمدار ہونٹوں کے اوپر گھنی مونچھیں بہت سج رہی تھیں تم پر۔

''یہ چند خوشگوار لمحے جو آپ کی ہنسی کے سنگم میں گزرے ہیں' میری زندگی کی کتاب میں سنہری تتلیوں کی طرح ہمیشہ محفوظ رہیں گے۔''

''کیا آپ شاعری کر رہے ہیں؟'' انعم نے انتہائی معصومیت سے پوچھا۔

''شاعری ہر جگہ' ہر وقت' ہر مقام پر نہیں ہوتی انعم! موڈ ہوتا ہے۔ تخلیقی عمل ہماری مرضی کا پابند نہیں ہوتا کہ جب جس وقت جی چاہا تخلیق کر لیا۔''

''لیکن عابدی صاحب تو جب جس وقت چاہیں شعر کہہ لیتے ہیں۔ شعر تو جیسے ان کے دل میں دھرے ہوتے ہیں۔ ادھر بٹن دباؤ اور پٹ سے شعر برآمد۔ گویا شعر نہ ہوئے۔''

''راحت عابدی! میں تو سرے سے اسے شاعر ہی نہیں مانتا۔''

تم نے اپنے ہونٹ تنفر سے سکوڑے تھے۔

باوجود اس کے راحت عابدی کی شخصیت نے مجھے بے حد مایوس کیا تھا' لیکن میں ان کی

شاعری کی دلدادہ تھی۔ مجھے تمہارا تبصرہ قطعی پسند نہیں آیا تھا۔

''ہاں اکثر نئے شعراء جوان کی طرح شاعری نہیں کر پاتے ہیں وہ اپنے دل کی بھڑاس اسی طرح نکالتے ہیں' انہیں شاعر نہ مان کر۔''

میں نے انعم کا ہاتھ تھاما۔ ''چلو انعم دیر ہو رہی ہے۔''

''سوری' میری بات سے آپ کی دل آزاری ہوئی۔''

تم اس وقت کس قدر شائستہ اور مہذب لگ رہے تھے اور چند لمحے پہلے تم نے کتنا سچ بولا تھا کہ لوگوں نے اپنے اوپر جھوٹ کے اتنے دبیز لبادے ڈال رکھے ہیں کہ ان کے اصل چہرے دکھائی نہیں دیتے' تم نے بھی اپنا اصل چہرہ کہیں بہت گہرے دبیز پردوں تلے چھپا رکھا تھا جو مجھے اور انعم کو کبھی دکھائی نہ دیا اور اس وقت تو تم ہر طرح سے انعم کو متاثر کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور انعم شاید کچھ متاثر ضرور ہو گئی تھی کہ جب تم نے انعم سے پوچھا تھا کہ ''آپ کی آٹوگراف بک کہاں ہے' لایئے میں کچھ لکھ دوں۔''

''دراصل مجھے شاعری اور شاعروں سے کوئی دلچسپی نہیں' لیکن آپ مجھے آٹوگراف ضرور دینا چاہتے ہیں تو چلیے یہاں دے دیجئے۔'' اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

''کیا یاد کریں گے ایسی آٹوگراف بک آپ کے سامنے پہلے کبھی نہیں آئی ہوگی۔''

''ہاں۔'' تم بے اختیار مسکرا اٹھے تھے۔

''یہ آٹوگراف بک بھی منفرد ہے اور آٹوگراف لینے والی بھی۔''

بہت بے باکی سے تم نے اس کا ہاتھ تھام کر آج شام مشاعرے میں پڑھنے والی اپنی غزل کا ایک شعر اس پر لکھ دیا تھا اور شاید یہی وہ لمحہ تھا جب اندر کہیں روحوں کے تار ایک دم مل گئے تھے۔ انعم نے شکریہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ فوراً پیچھے کھینچ لیا تھا۔

''میں یاد رکھوں گا ہمیشہ اس ہاتھ کو اور ہاتھ والی کو بھی۔''

تم نے آہستگی سے کہا تھا لیکن میں نے اور انعم نے سن لیا تھا۔ تب ہی تو انعم کے گندم رنگ رخساروں پر کھلتا سرخ رنگ لو دے اٹھا تھا۔ کچھ اور لڑکیاں اور لڑکے آٹوگراف بک اٹھائے تمہاری طرف آ گئے تھے اور ہم تمہیں خدا حافظ کہہ کر چلے آئے۔

اور پھر گاڑی مین روڈ پر لاتے ہی اس نے دائیں ہاتھ سے اسٹیئرنگ کو سنبھالتے ہوئے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی میرے سامنے پھیلا دی۔

"رُ تو شاعری سے دلچسپی نہیں ڈیئر! تم ذرا یہ شعر پڑھ کر اس کا مطلب تو بتانا مجھے۔"

"نے مشاعرے میں پڑھی جانے والی غزل کا وہ شعر لکھا تھا جس پر بے تحاشا داد ملی تھی تمہیں اور سامعین نے کئی بار تم سے سنا تھا۔"

"عر کے ذہن میں کیا ہوتا ہے یہ تو شاعر کو ہی خبر ہوتی ہے۔ لیکن یہ شعر۔ لگتا ہے کہ اسفر علی خان نے اس میں اپنے کردار و شخصیت کی تفسیر کی ہے۔"

"ثلاً۔" انعم نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ثلاً' یہ کہ میرے خیال میں تو اس کا یہی مطلب ہے کہ اس وقت سوچنے سمجھنے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی جی بھر کر ہر دل سے کھیلو اور عیش کرو۔ جب جوانی کی رت گزر جائے گی پھر سوچنا۔"

"ین نو سو چوہے کھا کے۔" وہ ہنسی۔

"ہاں!" میں بھی ہنس پڑی۔

"تمہارا مطلب ہے؟" اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔

"کہ اسفر علی خان بیک وقت بہت سارے دلوں سے کھیلنے والا بندہ ہے۔"

"لگ تو ایسا ہی رہا تھا۔ دیکھا نہیں پہلی ہی ملاقات میں جوتوں سمیت آنکھوں میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"مگر کچھ لوگ فطرتاً بے تکلف ہوتے ہیں۔" غیر ارادی طور پر انعم نے تمہارا دفاع کیا تھا۔

"لیکن یہ شاعر حضرات ایویں ہی ہوتے ہیں۔ دیکھا نہیں تھا خوامخواہ بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"ہیں؟ ہیں؟" انعم نے آنکھیں پھاڑیں۔

"شعراء کے متعلق تمہارے ان زریں خیالات کا علم اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ کیا یہ تبدیلی خیالات حال ہی میں وقوع پذیر ہوئی ہے؟ میرا مطلب ہے کہیں راحت عابدی سے ملنے کے بعد۔"

"رلش۔" میں نے زیر لب کہا۔

"کچھ لوگوں کی شخصیت ان کی تحریروں کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔"

"لگتا ہے راحت عابدی نے بہت مایوس کیا ہے تمہیں؟"

اب کے انعم نے براہ راست میرے زخموں کو چھیڑا تو میں پھٹ پڑی۔

"انتہائی فضول آدمی ہے وہ اور یہ اسفر علی خان یہ بھی بہت چھچھورا اور فضول سا لگا ہے۔"

"لیکن اس کی شخصیت تو تمہارے اس راحت عابدی کے مقابلے میں ہزار ہا درجے بہتر ہے۔ دیکھا نہیں تھا لڑکیاں کیسی نثار ہونے والی نظروں سے دیکھ رہی تھیں اسے۔"

"ہاں یہ لڑکیاں تو ہوتی ہی احمق ہیں' فضول۔" میں نے اپنا غصہ نکالا۔

"دریں چہ شک است۔" انعم کا موڈ بہت خوشگوار تھا اور ڈرائیو کرتے ہوئے وہ ہولے ہولے گنگنا رہی تھی۔

"اور یہ اسفر علی خان بھی کوئی دل پھینک قسم کا لگ رہا تھا۔"

اس وقت تمہارے متعلق میری یہی رائے تھی۔ جس پر میں نے بعد میں انعم سے کئی بار اظہار خیال کیا تھا۔ لیکن انعم کو اس سے اتفاق نہ تھا اور پھر بعد کی کئی ملاقاتوں کے بعد میری رائے بھی بدل گئی تھی اور میں نہ صرف یہ کہ تمہاری بہت عزت کرنے لگی تھی بلکہ بحیثیت شاعر اور بحیثیت انسان دونوں طرح تمہاری شخصیت میرے سامنے نکھر کر آ گئی تھی اور انعم کی نسبت سے تم مجھے بے حد عزیز بھی ہو گئے تھے۔

***

ان دنوں یونیورسٹی بند تھی اور انعم بھی گھر پر اپنے کام میں مصروف رہتی تھی اور میں بے حد بور ہو رہی تھی۔ اس روز بھی یونہی اماں کے پاس بیٹھی ان کے رشتہ داروں اور عزیزوں کا احوال سنتے ہوئے از حد بوریت محسوس کرتے ہوئے وہاں سے بھاگنے کی سوچ رہی تھی کہ انعم نے برش ہاتھ میں اٹھائے اپنے سٹوڈیو سے باہر جھانکا۔

"انوشا یار! ذرا ادھر آؤ۔ ایک بات سنو۔"

اور دل ہی میں دل میں اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہ اس نے مجھے اماں کے عزیزوں کا مزید احوال سننے سے بچا لیا' میں بظاہر خراب موڈ کے ساتھ اس کے پاس آئی۔

"کیا ہے؟"

"اندر تو آؤ یار۔"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

وہ مڑ کر ایزل کے پاس کھڑی ہوگئی اور مختلف زاویوں سے اسے دیکھنے لگی۔

''اب بتاؤ بھی کیا ہے۔ اتنے مزے سے اماں کی باتیں سن رہی تھی۔'' میں
جھلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

''اچھا!'' اس نے برش رنگ میں ڈبو کر ایک ٹچ لگایا۔

''تو پھر جاؤ اماں کی باتیں سن لو میں بعد میں پوچھ لوں گی۔''

''اب آ گئی ہوں تو بتا ہی دو۔''

میں سخاوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہیں قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔

''کوئی خاص بات نہیں تھی۔''

برش ایک طرف رکھ کر ہاتھ پونچھتے ہوئے وہ میرے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

''یوں ہی تصویر بناتے بناتے ایک خیال آ گیا تھا۔ وہ شعر کیا تھا۔ یار وہی جو اصغر علی
خان نے میری ہتھیلی پر لکھا تھا۔ یاد کرنے کے باوجود یاد نہیں آیا۔ کچھ چاند واند کا ذکر تھا۔''

میں نے مصنوعی حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔

''مگر تم۔ تمہیں تو شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ یکا یک دلچسپی کیسے پیدا ہوگئی۔''

''کمال ہے یار! ایک شعر پوچھ لینے سے بھلا شاعری میں دلچسپی کا جواز کہاں نظر آ رہا
ہے۔ تمہیں پتا ہے کوئی خیال ذہن میں آ جائے تو وہ مجھے ڈسٹرب کرتا رہتا ہے۔ بس یوں ہی
خیال آیا تو یکسوئی ختم ہوگئی۔

''اطلاعاً عرض ہے کہ کمال میرے والد محترم کا نام ہے اور یکسوئی ختم ہونا خاصا پریشان
کن مسئلہ ہے۔''

میں شرارت کے موڈ میں تھی۔

''ربش۔'' اس نے منہ بنایا۔

''کون؟''

''اصغر یا شعر۔''

''دونوں ہی۔'' وہ کھڑی ہوگئی۔

''ارے شعر تو سن لو ہاں تو وہ شعر تھا کیا تھا...... کیا تھا؟''

اس موسم میں مل کر کھیلو اپنے اور پرائے چاند

''مگر یہ تو دوسرا مصرعہ تھا نا۔''

''پہلا...... ہاں پہلا......''

میں نے ذہن پر زور دینے کی کوشش کی لیکن یاد نہ آیا۔

'چلو خیر ہے یاد آ جائے گا کبھی۔''

مجھے اپنی یادداشت پر بے حد ناز تھا۔

''اور اگر یاد نہ آیا تو پوچھ لیں گے کبھی جا کر اصغر علی خان سے کہ وہ جو آپ نے کسی کی
ہتھیلی پر ایک شعر لکھا تھا اس کا پہلا مصرعہ کیا تھا وہ...... میرا مطلب ہے اصغر علی خان رینو کے
گھر میں ہی رہتا ہے ان کی انیکسی میں۔''

لیکن اصغر علی خان تمہارے گھر جانے کی نوبت ہی نہ آئی اور اسی شام تمہارا فون آ گیا۔

مجھے ازحد حیرت ہوئی۔

''ہمارا نمبر آپ کو کیسے ملا؟''

''نمبر تو میں نے مس مومنہ سے لیا۔ آپ نے مائنڈ تو نہیں کیا۔''

''نہیں لیکن خیریت' کیسے یاد کیا؟''

''دراصل ہم لوگوں نے نوجوانوں کے لیے ایک تنظیم بنائی ہے' اس تنظیم کے پلیٹ فارم
سے نوجوان ٹیلنٹ کو متعارف کروائیں گے۔ یہاں اس تنظیم کا بنیادی مقصد ہے' دراصل ہر
شعبے میں کچھ خاص لوگوں کی اجارہ داری ہوجاتی ہے' اس طرح بہت سے نوجوانوں کی
صلاحیتیں ابھر نہیں پاتیں۔''

تم تفصیل بتانے لگے تھے۔

''یہ تو اچھی بات ہے۔'' میں نے اس خیال کو سراہا تھا۔

''میری خواہش اور فون کا مقصد یہ ہے آپ اور مس انجم جمال بھی ہماری اس تنظیم کی
ممبر شپ لے لیں۔''

''ضرور لیکن انجم کو تو شعر و شاعری اور ادب سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔''

''ہمارا مقصد صرف شعراء یا ادیبوں کو ہی متعارف کروانا نہیں ہے بلکہ دوسرے شعبوں
میں بھی۔''

''لیکن وہ موڈی ہے' کہوں گی اس سے ہاں......!'' مجھے اچانک ہی یاد آ گیا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"وہ شعر کیا تھا جو آپ نے اس کی ہتھیلی پر لکھا تھا۔"

"کیوں؟" تمہارے لہجے میں استعجاب تھا۔

"وہ انجم ہی پوچھ رہی تھی۔"

"تو پھر ہم انجم کو ہی بتائیں گے۔" تم نے شوخی سے کہا تھا۔

"تو ٹھیک ہے پھر انجم کو ہی بتا دیں۔" میں نے ریسیور انجم کو ہی دے دیا جو میرے پا
ہی بیٹھی تھی۔

"جی بس یونہی یاد کیا تو یاد نہیں آ رہا تھا۔"

انجم نے تمہارے سوال کے جواب میں کہا تو میں نے یونہی شرارت سے ساتھ دوسر
سیٹ کا ہینڈ فری کا بٹن آن کر دیا۔ دوسری طرف تم بے حد دلکش انداز میں شعر پڑھ ر
تھے۔ انجم نے یادداشت کے لیے شعر دہرایا۔

"آپ کی آواز آپ کی ہنسی کی طرح کس قدر دلکش ہے مس انجم۔"

"ہائے داوے۔" انجم ہنسی۔ "کیا آپ کی طرف مکھن بہت سستا ہے۔"

"یہ مکھن نہیں ہے' میں سچ کہہ رہا ہوں۔" انجم کی آواز بہت دلکش تھی اور یہ حقیقت تھی

"اچھا۔"

"کیا آپ سمجھ رہی ہیں کہ میں بنا رہا ہوں...... آپ کو برا لگا ہے تو سوری...... آپ ک
آواز اتنی خوبصورت لگی مجھے کہ بے اختیار کہہ بیٹھا' اوکے اجازت......"

تمہارا لہجہ ناراض ناراض سا تھا۔

"نہیں خیر' اپنی تعریف کسے بری لگتی ہے شکریہ۔" انجم نے مجھے دیکھ کر بائیں آنک[ھ]
دبائی۔

"اور عورت کو تو اپنی تعریف بہت ہی اچھی لگتی ہے اور مرد عورت کی اس کمزوری کو جا[نتا]
ہے سو وقتاً فوقتاً اس ہتھیار کو استعمال میں لاتا رہتا ہے۔"

"بخدا میرا مقصد آپ کی کسی کمزوری سے فائدہ اٹھانا ہرگز نہ تھا' بس بے اختیار جو اچھا
لگا کہہ بیٹھا۔"

تم نے پھر وضاحت کی تھی اور میں اماں کے آواز دینے پر باہر چلی گئی اور جب واپس
آئی تو انجم ٹیبل پر بیٹھی چیونگم چباتی مزے سے پاؤں ہلا رہی تھی۔

"اُفو الو! تم پھر میری رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھ گئی ہو' سارے کاغذ بکھرے پڑے تھے۔"

"خاتون' میں نے سارے کاغذات بیٹھنے سے پہلے ہٹا دیئے تھے۔ آپ خوانخواہ ہی
لال سرخ نہ ہوں۔"

"لال سرخ نہیں لال پیلی۔" میں نے اس کی تصحیح کی۔

"ہوگا لیکن میرے خیال میں لال پیلی کچھ غلط لگ رہا تھا آدمی غصے میں کچھ پیلا نہیں
ہوتا لال سرخ ہی ہوتا ہے۔"

اس کی ایسی ہی عادت تھی وہ یونہی ہر محاورے اور ضرب المثل میں تبدیلیاں کرتی رہتی
تھی اور...... ناصر نے کئی بار اسے خلوص دل سے مشورہ دیا تھا کہ وہ ایک نئی لغت ترتیب دے
ڈالے اور اردو زبان میں مولوی عبدالحق ثانی کا اعزاز حاصل کر ڈالے۔

"خیر' تمہارے یہ اسفر علی خان خاصے دلچسپ آدمی ہیں۔" وہ اچھل کر ٹیبل سے نیچے اتر
آئی۔

"میرے کیوں؟" میں نے برا سا منہ بنایا۔

"اوہ ہاں سوری تمہارے تو وہ...... کیا نام ہیں راحت عابدی" میں نے غصے سے اسے
دیکھا۔

"میرا مطلب ہے فیورٹ...... فیورٹ شاعر ہیں۔" وہ کھل کر...... ہنس دی۔

"ویسے شاعر یہ بھی برے نہیں ہیں' محترم اسفر علی خان کیا زبردست نظم سنائی ہے۔"

"کون سی نظم تھی؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"نظم۔" اس نے سر پر انگلی بجائی۔ "کچھ اس طرح کی تھی' صحیح تو یاد نہیں مطلب اس
طرح تھا۔

جب سے تم کو دیکھا ہے
نیند ہی نہیں آتی
رات بھر جگاتی ہے
وہ حسین ہنسی تیری
بے قرار رکھتی ہے
بے وفا

تمہاری یاد

''نہیں۔'' میں نے سر ہلایا ''یہ نظم اسغر کی نہیں ہوسکتی' یہ تو بالکل بچوں والی نظم ہے جبکہ اس کی تحریر بڑی میچورڈ ہے۔''

''تو میں نے کب کہا ہے اس کی ہے' اس سے ملتی جلتی ہی تھی' یہ تو میں نے ابھی ابھی اپنے پاس سے گھڑی ہے۔''

''تم نے اپنے پاس سے گھڑی ہے؟'' مجھے حیرت ہوئی۔

''رئیلی' انو! تمہارے اندر بہت صلاحیتیں ہیں۔ تم بھی لکھ سکتی ہو۔''

اس نے فخر سے کالر جھاڑے۔

''کیا رومینٹک ہو رہا تھا؟'' میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

''پہلے یہ بتاؤ انوشا جان یہ رومینٹک کیسے ہوتے ہیں۔'' ایک تو وہ انتہا درجے کی بیوقوف تھی بلکہ انتہائی معصوم۔

میں نے جھلا کر اسے دیکھا۔

''میرا مطلب ہے کہ اس نے تم سے یہ تو نہیں کہا کہ تم اسے اچھی لگتی ہو' پہلی نظر میں ہی وغیرہ وغیرہ۔''

''نہیں' ایسی تو کوئی بات نہیں کی اس نے خاصا معقول بندہ ہے۔''

''زیادہ تر شاعر یونہی ہوتے ہیں دل پھینک سے۔ دھیان رکھنا۔'' میں نے اسے نصیحت کی۔

''اچھا اور کیا کیا خصوصیات ہوتی ہیں ان حضرات میں' پلیز میرے علم میں اگر کچھ اضافہ ہو جائے تو مستقبلِ قریب میں کام آئے گا۔''

وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔

اور مجھے کیا پتا تھا اسغر علی خان کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے' ورنہ میں اسے روک دیتی' منع کر دیتی کہ وہ کبھی بھی تم سے بات نہ کرے اور کبھی تم سے نہ ملے۔ کاش میں جانتی ہوتی اسغر علی خان کہ تم کیا ہو تو میں اسے اس طرح مصلوب ہونے سے بچا لیتی۔ وہ جو اس قدر شوخ اس قدر خوش مزاج تھی اور بابا کہا کرتے تھے۔

''اس گھر کی ساری رونقیں انعم کے دم سے ہیں اور جس روز انعم چلی گئی اس گھر سے' تو

اداسیاں اسے گھیر لیں گی۔''

اماں بہت استحقاق سے معنی خیز انداز میں مسکراتیں۔

تو بابا بھی مسکرا کر سر جھکا لیتے' لیکن سب کچھ کیسے الٹ پلٹ کر دیا تھا تم نے اسغر علی خان۔

''مجھے تو پتا ہی نہیں چلا تھا کہ کب اور کیسے تم دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب آ گئے تھے کہ انعم جو محبتوں کو محض وقت گزاری اور انجوائے منٹ کا ایک ذریعہ سمجھتی تھی تمہاری محبت میں اتنی آگے نکل آئی کہ اس نے ناصر سے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

ناصر کو جاب مل چکی تھی اور اماں اس کی خوشی دیکھنا چاہتی تھیں۔

''بھلا' یہ کیسے ممکن ہے انوشا! میں نے ناصر کو ہمیشہ اپنا بھائی سمجھا ہے' یہ نہیں ہو سکتا۔''

وہ اماں کا گھٹنا پکڑ کر بیٹھ گئی۔

''میں نے تو ناصر کی شادی میں پہننے کے لیے مایوں' مہندی اور بارات اور ولیمے کے جوڑے بھی سوچ رکھے تھے' بلکہ گیت بھی یاد کر رکھے تھے کہ لڑکی والوں کو ہرا دینا ہے۔''

''دیکھو ناں ناصر!'' حیران بیٹھے ناصر کو اس نے مخاطب کیا۔

''اب اگر تمہاری مجھ سے شادی ہو جاتی ہے تو بھلا کیا خاک مزا آئے گا' انوشا بھلا کس کو گانوں میں ہرائے گی' اور وہ بھی اکیلی' اور پھر مجھے تو تمہیں سہرا باندھنا ہے اور نیگ وصول کرنا ہے۔ یہ تو ناممکن ہے۔ بلکہ ایسے ہی جیسے کوئی بھائی......''

وہ بلا سوچے سمجھے بولے گئی' اور وہ تو گھر بھر کی لاڈلی تھی' سو اس کی بات مان کر ناصر کی منگنی بڑے ماموں کی چھوٹی بیٹی سے کر دی گئی۔

اور مجھے گمان تک نہ ہوا تھا اسغر علی خان کہ وہ تم میں انوالو ہو چکی ہے' یاد ہے ناں تمہیں جب تمہاری تنظیم کے پہلے اجلاس میں شرکت کے لیے وہ میرے ساتھ آئی تھی تو یہ اس سے تمہاری دوسری ملاقات تھی اور اس شام ہمیں رخصت کرتے ہوئے تم نے بے حد سنجیدگی سے انعم کو مخاطب کیا تھا۔

''مس انعم! اگر میں آپ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاؤں تو۔''

''اخاہ......!'' انعم بے اختیار ہنس پڑی تھی۔

اور تمہاری نگاہیں اس کے ڈمپل میں گم ہوتے تل پر سے ہوتی ہوئیں اس کی گردن کے

تل پر ٹھہر گئی تھیں۔

"اس صدی کا لطیفہ' مسٹر اسفر! میرے نزدیک مرد اور عورت کے درمیان دوستی کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ مرد اور عورت کے درمیان صرف ایک ہی رشتہ ہوتا ہے' یہ دوستی تو محض بہانہ ہوتی ہے۔"

"تو چلیں وہی ایک رشتہ بنا لیں۔"

تم ایک دم شوخ ہو گئے تھے اور اس کے گندم رنگ رخساروں پر سرخی دوڑ گئی تھی۔

"دراصل۔" تم سنجیدہ ہو گئے تھے۔ "آپ مجھے بہت اچھی لگی ہیں انعم! اس خود غرض اور ظالم دنیا میں بے حد سچی' کھری اور تصنع سے پاک...... اور میں آپ کو کھونا نہیں چاہتا' کسی بھی حوالے سے کسی میں آپ سے رابطہ رکھنا چاہتا ہوں' یقین کریں میں ایک شریف آدمی ہوں' عورت میرے نزدیک انتہائی محترم ہے۔"

تم اپنی بات کر کے فوراً ہی واپس مڑ گئے تھے اور ہم دونوں ہی لمحہ بھر کے لیے حیران کھڑے رہ گئے تھے۔

اور پھر مجھے تو پتا ہی نہیں چلا اسفر علی خان کہ مرد اور عورت کے درمیان دوستی کے رشتے کو تسلیم نہ کرنے والی انعم نے کب تمہارے ساتھ دوستی کا رشتہ استوار کر لیا تھا۔ اس کا انکشاف تو اس روز ہوا تھا جب تمہاری برتھ ڈے پر وہ تمہارے لئے گفٹ خریدنا چاہتی تھی اور مجھے ساتھ لے کر بازار گئی تھی اور تم اتفاقاً ہی وہاں مل گئے تھے یاد ہے نا تمہیں......"

"تم تو اکثر میری برتھ ڈے بھی بھول جاتی ہو انو اور یہ اسفر علی خان کی برتھ ڈے' مجھے سب سچ سچ بتا دو ورنہ......"

گھر آتے ہی میں اس سے الجھ پڑی تھی۔

"خیر ہے نا۔"

"ہاں بالکل خیر......" اس نے بے حد اطمینان سے کہا تھا۔

"بس میں نے اسفر سے دوستی کر لی ہے' وہ بہت نائس آدمی ہے۔ تمہیں پتا ہے نا میری کوئی دوست نہیں ہے دراصل کوئی بھی میری مطلوبہ دوستی کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔"

"یعنی میں بھی۔" میں نے آنکھیں نکالیں۔

"تمہاری اور بات ہے یار! تمہارے ساتھ دوستی تو میری مجبوری ہوئی نا۔"

اس کی آنکھوں میں ہنسی کے تارے جگ مگ جگ مگ کرنے لگے۔

"کوئی ضرورت نہیں مجبوری کے رشتے نبھانے کی۔" میں نے منہ پھلا لیا' تو اس نے منا لیا اور اس روز اسفر علی خان اس نے مجھ سے تمہارے متعلق بہت ساری باتیں کیں۔

"اسفر ایک سیلف میڈ آدمی ہے۔ اس نے اپنے خاندان کا اسٹیٹس بنانے کے لیے بہت جدوجہد کی ہے انوشا' بے تحاشا' اپنی بہت ساری خواہشات کو اس نے اپنوں کی خواہشات پوری کرنے کے لیے ڈراپ کر دیا۔ وہ چار بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے اور بہت چھوٹی عمر سے ہی اپنے والد کی وفات کے بعد اس نے اپنے گھر کی ذمہ داری سنبھالی ہے اور پرائیویٹ پڑھ پڑھ کر آج اس منزل تک پہنچا ہے۔ پتا ہے انوشا! جب وہ چھوٹا سا تھا ناں تو اس نے کوئلے سے تصویریں بنانا شروع کی تھیں اور سوچا تھا کہ ایک دن بہت بڑا مصور بنے گا' لیکن حالات نے اسے شاعر بنا دیا۔ اس کی شاعری اس کی ذات کے کرب کا اظہار ہے انوشا! اس نے رومیٹک شاعری بہت کم کی ہے۔

"یہ تم نے اس کی شاعری' کہاں پڑھ لی اور تمہیں اتنی دلچسپی کب سے ہو گئی شاعری سے۔"

"میں نے اس کا مجموعہ خریدا تھا۔ ماورا سے اور شاعری سے دلچسپی تو کسی وقت' کسی عمر میں بھی ہو سکتی ہے انوشا! پتا ہے شاعری کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے۔ بعض اوقات لمبی لمبی تقریریں وہ اثر نہیں کرتیں جو ایک شعر کر دیتا ہے۔"

"تمہارے ان زریں خیالات میں یقیناً اسفر کا ہاتھ ہے' لیکن یہ سب' تم نے مجھے خبر تک نہ دی کہ یہ واردات کب ہوئی؟ تمہاری اسفر سے دوستی کی۔"

"دراصل تم اپنے امتحان میں بزی تھیں۔ اس لئے میں نے تمہیں ڈسٹرب نہیں کیا۔ سوچا فارغ ہو جاؤ تو سب بتا دوں گی۔"

"تو پھر شروع ہو جاؤ الف سے یے تک اور کہیں بھی ڈنڈی نہیں مارو گی تم۔"

"یار! اس روز جس روز تمہارا پہلا پیپر تھا تمہیں ڈراپ کر کے میں مارکیٹ کی طرف چلی گئی تھی' مجھے کچھ رنگ لینے تھے اور وہیں رستے میں ایک شاپ پر مجھے اسفر ٹیکسی کا انتظار کرتا نظر آ گیا اور میں نے اسے آفر کی کہ میں اسے ڈراپ کر دیتی ہوں۔"

"زمانہ بدل گیا ہے پہلے لڑکے لفٹ دیا کرتے تھے اور اب......؟" میں نے اسے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

چھیڑا۔

"بکو نہیں' اتنی دھوپ تھی اور دور دور تک کسی کنوینس کا امکان نہیں تھا۔"

"اور یہ ہمدردی دوستی کی بنیاد بن گئی۔" میں نے لقمہ دیا۔

"پتا نہیں اس کی گاڑی ورکشاپ میں تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ بہت ضروری [illegible] سے آیا تھا اور اب اپنے گھر واپس جا رہا تھا' اور تمہیں پتا ہے رینو کا گھر مون مارکیٹ سے [illegible] قدر دور ہے خود ہی آفر کی تھی۔"

"اور راستے میں تمام مراحل طے ہو گئے۔"

"ہاں یوں ہی سمجھ لو۔" وہ سنجیدہ تھی۔

"اس نے مجھے اپنے متعلق تفصیل سے بتایا اور درخواست کی کبھی کبھی وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے' پتا ہے انوشا! اس نے مجھ سے کہا۔" تمہاری آواز اور تمہارا لہجہ اکثر میری ساعتوں میں گونجتا رہتا ہے یوں جیسے اندھیرے میں روشنی کی کوئی کرن چمک کر ڈوب جائے انعم! کبھی کبھی جب میں بہت تھکنے لگوں تو کیا روشنی کی اس کرن سے میں اپنے اندھیروں میں روشنی کر سکتا ہوں' وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی تمہارے لئے مشکل پیدا نہیں کروں گا' اگر کبھی ایسا محسوس ہوا تو خود ہی تمہاری زندگی سے نکل جاؤں گا۔"

"اور تم میڈم انعم جمال! تم یہ جذباتی ڈائیلاگ سن کر پگھل گئیں اور اس کی دوستی کی آفر قبول کر لی۔"

"جی نہیں ایسی موم سے نہیں بنی ہوں۔ میں نے بس اسے اپنا فون نمبر دے دیا تھا کہ وہ چاہے تو کبھی کبھار فون کر سکتا ہے۔"

"یعنی انتہائی سخاوت کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔"

میں نے تبصرہ کیا۔

"بالکل تمہیں پتا تو ہے میں کس قدر رحم دل ہوں۔" وہ خواہ مخواہ ہی ہنس پڑی" اور پتا ہے وہ انوشا! اس نے اگلے روز ہی فون کر ڈالا۔"

"اور پھر ہر روز کرنے لگا۔" میں نے اس کی بات مکمل کی۔

"یار! تم تو خاصی تجربہ کار لگتی ہو۔" اس نے مصنوعی حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

"ہائے واوے یہ ٹیلی فونک ملاقات کس وقت ہوتی ہے' آج میں بھی ذرا دیکھوں' کیا

گفتگو کی جاتی ہے۔"

"تمہیں پتا ہے ناں بابا رات کو فون آف کر دیتے ہیں' ان کے بعض کلائنٹ یونہی وقت بے وقت فون کر دیتے ہیں اور رات کو میں ہی فون اٹینڈ کرتی ہوں' سوتے میں اگر فون کی بیل اچانک ہو تو بابا کی نیند اپ سیٹ ہو جاتی ہے۔ سو فون میرے سرہانے ہی دھرا رہتا ہے اور وہ رات کو ہی فون کرتا ہے' دن میں تو اپنے آفس کے بعد ایک اور جگہ پارٹ ٹائم کرتا ہے' بہت سٹرگل کیا ہے اس نے انوشا ابھی اسے دو بہنوں کی اور شادیاں کرنا ہیں۔"

"تب ہی اس کا نام اسفر ہے۔"

"جی نہیں اسفر بہ معنی روشنی ہے۔"

"اچھا' اچھا تو اب وہ تمہاری زندگی کو روشن کر رہا ہے۔"

"بکومت۔" وہ ناراض ہو گئی۔

"تم خواہ مخواہ فضول سوچ رہی ہو' ہم صرف دوست ہیں' بہت اچھے۔"

"سوری یار......" میں نے معذرت کر کے اسے منا لیا۔" لیکن تم تو مرد اور عورت میں دوستی کی قائل نہیں تھیں۔"

"ہاں لیکن کبھی کبھی کچھ لوگ ایسے زندگی میں ٹکرا جاتے ہیں کہ انسان کو اپنے نظریات بدلنا پڑتے ہیں' اسفر بلاشبہ ایک نفیس انسان ہے اور اس سے بات کر کے مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے۔ یقین کرو انوشا ہمارے درمیان کوئی فضول بات نہیں ہے۔ حیرت انگیز حد تک ہمارے مزاج کے رنگ ملتے ہیں' ہماری پسند ناپسند' ہماری سوچ' ہماری فکر' ہمارے شوق اور ہماری دلچسپیاں' ہماری ذہنی اپروچ ایک ہے اور بس......"

اس نے سنجیدگی سے تفصیل بتائی اور یہ حقیقت ہے اسفر علی کہ میں بھی اس روز تمہاری شخصیت کے اس خاکے سے جو انعم نے کھینچا تھا کچھ کچھ متاثر ہوئی تھی۔ کچھ لوگ پہلی ملاقات میں صحیح تاثر نہیں چھوڑتے' جیسے تم لگے تھے مجھے فلرٹ اور خود پسند سے' جبکہ انعم کا کہنا تھا کہ تمہاری زندگی میں ابھی تک کوئی لڑکی آئی ہی نہیں' اور یہ کہ زندگی کے مسائل نے تمہیں اتنی فرصت ہی نہیں دی کہ تم اِدھر اُدھر دیکھ سکو' میں نے انعم سے تمہارا مجموعہ لے لیا تاکہ پڑھ سکوں' یوں بھی میں فارغ تھی۔

'ویسے اصولاً یہ مجموعہ اسے تمہیں گفٹ کرنا چاہئے تھا۔"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

میں نے کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے انعم کو چھیڑا۔

''مجھے کسی سے گفٹ لینے کا شوق نہیں ہے۔''

بابا کی بیٹی ہونے کے ناتے وہ ہر بات کا دفاع کرنے کی اہلیت رکھتی تھی بلکہ ایک ...
میں نے اسے مشورہ بھی دیا تھا کہ اسے فائن آرٹس لینے کے بجائے وکالت کرنی چاہئے تھی

بند کمرے میں حبس کتنا ہے
کھول دیں میں نے کھڑکیاں ساری
پھر بھی دل کی گھٹن نہیں جاتی

میں یونہی ورق گردانی کرنے لگی اسفر علی خان! تمہاری شاعری میں کچھ تھا۔ کچھ گرد...
میں لیتی ہوئی بات' دل کو مٹھی میں بند کرتی' میں لحہ بھر کے لیے کھو سی گئی۔

طوفانوں نے کتنے دیپ بجھائے ہیں
پلک پلک پہ اشک سجے ہیں کیسے ہنسوں
دور منڈیر پہ چڑیا اڑ کر جا بیٹھی
آس کا پنچھی پا کر کھویا کیسے ہنسوں

میں نے سوچا تھا اسفر کہ بہت اطمینان سے تمہاری کتاب پڑھوں گی' لیکن پھر فرصت ہی نہ ملی۔

* * *

میرا فائنل تھا اور اس کے اختتام کے ساتھ ہی گھر میں ناصر کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں' میں بے طرح مصروف ہو گئی تھی۔

کبھی مومنہ کو ساتھ لے کر اور کبھی کسی کو میں بازاروں کے چکر لگاتے لگاتے تھک گئی تھی اور انعم کی بچی اپنی پڑھائی میں مصروف' کبھی کبھی مجھے اس پر بہت غصہ آتا۔

''اچھی بہن ہو تم' بھائی کی شادی میں اکیلی تھک رہی ہوں میں۔''

''تم فارغ ہو چکی ہو اور مجھے ابھی امتحان دینا ہے۔'' وہ بہت اطمینان سے کہتی۔

''یوں بھی اگر تم فارغ ہوتیں تب کون سا تم نے ساتھ دینا تھا میرا۔''

میں اس روز بے حد تھکی ہوئی تھی اور تھکن کا سارا غصہ اس پر اتار رہی تھی۔ مجھے پتا تھا اسے شاپنگ کے لیے بازاروں میں مارا مارا پھرنا پسند نہ تھا' وہ بچپن سے ہی بہت سادہ مزاج

تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے زندگی میں کبھی اسے ہلکا سا میک اپ کئے ہوئے دیکھا ہو۔

''کم از کم اپنے جوڑے کے لیے تو ایک روز میرے ساتھ چلو' میں نے مہندی کے فنکشن کے لیے سلک کا کرتا پاجامہ پسند کیا ہے' ایک جگہ بہت نفیس کام دیکھا ہے میں نے۔''

''لیو اٹ یار! ریشمی کپڑے نہیں بابا۔ کسی دن چلی جاؤں گی عاشی والوں کے پاس کاٹن میں نئی ورائٹی آئی ہے۔''

''تم شادی میں کاٹن کے کپڑے پہنو گی۔''

''ہوں کیا حرج ہے؟''

''جب دلہن بنو گی تب بھی کاٹن ہی پہننا۔''

''کوئی حرج نہیں۔'' اس نے بے نیازی سے کہا۔

''شادی دو انسانوں کے درمیان ایک معاہدہ کا نام ہے اور کسی کتاب میں یہ نہیں لکھا تھا کہ شادی والے دن گوٹے...... سے لپے ہوئے کپڑے پہنو' اف میرا تو دم گھٹنے لگتا ہے کسی کو زیورات میں لدے دیکھ کر......'' اور اس سے بحث کرنا بے کار سمجھ کر' میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا اور خود گھن چکر ہی بن کر رہ گئی تھی۔

گھر کی پہلی شادی تھی اماں دس دس چکر بازاروں کے لگواتیں' اور انعم مزے سے اپنی پڑھائی میں مصروف تھی۔ مجھے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ کبھی اکیلے میں اس سے تمہارے متعلق پوچھتی۔ اگر کبھی تنہائی ملتی بھی تو شادی کی باتیں ہی ہوتیں۔

آج ولیمے کا جوڑا لینے جانا ہے۔
جیولری میں چوڑیاں خریدنی ہیں۔
ٹیلر کے پاس جانا ہے' وغیرہ وغیرہ۔

* * *

خدا خدا کر کے شادی ہوئی اور میں نے سکھ کا سانس لیا ہی تھا کہ میری منگنی اور نکاح کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔

ناصر کی شادی میں ہی مجھے رافت کی والدہ نے دیکھا اور پسند کر لیا۔ اماں کی ان سے بہت دور کی قرابت داری بنتی تھی۔

میں سخت جھنجلائی ہوئی تھی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

''چند دن سکون سے آرام تو کرنے دیں۔ پتا نہیں کتنے دن ہو گئے ہیں میں ڈھنگ سے انعم سے بات نہیں کی' اور پھر ابھی تو میری پڑھائی ختم ہوئی ہے۔ کچھ دن آرام کرنے دیں۔'' میں سچ مچ رونے والی ہو رہی تھی۔

''کرتی رہنا آرام بیٹا!'' اماں نے مجھے پیار سے سمجھایا۔

''شادی تو سال ڈیڑھ سال بعد ہی ہو گی نا' ابھی تو صرف وہ نکاح کے لیے کہ رہی ہیں۔''

''تو پھر نکاح کی ایسی کیا آفت پڑی ہے۔''

''دراصل دو تین ماہ تک رافت کسی ٹریننگ کے سلسلے میں آسٹریلیا جا رہا ہے چھ ماہ کے لیے تو اس کی والدہ چاہتی ہیں کہ منگنی یا نکاح ہو جائے۔''

''تو پھر چھ ماہ بعد ہی آ کر نکاح کر لے۔'' حقیقتاً میں بے حد تھک گئی تھی اور ریلیکس ہونا چاہتی تھی۔

''بیٹا! اچھے رشتے روز روز نہیں ملتے۔ رافت بہت اچھا لڑکا ہے۔ مجھے' تمہارے ابا' ناصر کو اور ابا کو سب کو ہی رافت بہت پسند ہے۔''

اور جب میں رافت سے ملی اسے دیکھا تو مجھے واقعی اپنی خوش قسمتی پر رشک آنے لگا رافت اتنے ہی نفیس انسان تھے۔

بے حد شاندار شخصیت' اونچا لمبا قد اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بہت مضبوط فیملی بیک گراؤنڈ ان میں وہ سب خوبیاں تھیں جو کسی آئیڈیل مرد میں ہو سکتی ہیں۔

نکاح ہو گیا اور رافت نے اماں سے کبھی کبھار مجھ سے فون پر بات کرنے کی اجازت لے لی تھی اور یوں رافت کی بہت سی خوبیاں مجھ پر آشکار ہوئیں۔ ابھی ان کے جانے میں تین چار ماہ تھے۔ ان تین چار ماہ میں تو جیسے ہر چیز سے بیگانہ ہو گئی تھی۔ اکیلے میں رافت کو سوچنا اور ان کی باتیں یاد کرنا' مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ اپنی دنیا میں کھو کر کب میری اور انعم کی دلچسپیاں الگ الگ ہو گئی تھیں۔ حالانکہ پہلے ہم ہمیشہ ساتھ رہتے تھے۔ کہیں بھی جانا ہو اکٹھے جاتے۔ چاہے انعم کو یا مجھے ایک دوسرے کے کاموں سے دلچسپی نہ بھی ہوتی' پھر بھی ہم ساتھ ساتھ ہی رہتے تھے۔

اور پھر جب رافت آسٹریلیا چلے گئے تو بہت دنوں بعد میں انعم کے پورشن کی طرف گئی۔

اگرچہ تائی جان کی وفات کے بعد ہمارا کھانا اکٹھا بننے لگا تھا' لیکن ہماری رہائش الگ الگ پورشنوں میں تھی اور میں تو ہرن کی طرح اپنی ہی خوشبو میں مست تھی اور مجھے انعم کی طرف توجہ سے دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ملی تھی کہ ان دنوں اس کے گندم رنگ رخساروں پر کیسے گلاب کھل رہے ہیں اور آنکھوں میں کیسے رنگ دمک رہے ہیں۔

میں جب اس کے کمرے میں گئی تو وہ فون گود میں دھرے تم سے باتیں کر رہی تھی' اور اس کے رخساروں پر گلاب چٹک رہے تھے اور آنکھوں میں جگنو دمک رہے تھے۔

''بیٹھ جاؤ۔' اس نے اشارے سے مجھے بیٹھنے کو کہا۔

''کون آیا ہے؟'' شاید تم نے پوچھا تھا جس کے جواب میں اس نے کہا تھا۔

''انوشا کے سوا اور کس کی جرأت ہے کہ میرے کمرے میں قدم رنجہ فرمائے۔''

''کیا میری بھی نہیں؟''

شاید تم نے ایسی ہی کوئی بات کی ہو گی کہ وہ ہنس پڑی تھی۔

''تمہارے متعلق البتہ سوچا جا سکتا ہے۔''

اور دوسری طرف خدا جانے تم نے کیا کہا تھا کہ اس کی لانبی پلکیں بے اختیار جھک گئی تھیں۔

''او کے پھر بات کریں گے۔''

اس نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا اور شرارت سے مجھے دیکھا۔

''فرصت مل گئی جناب کو۔''

''جی اور آپ کو شاید ابھی بھی فرصت نہیں ہے۔''

''آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں اس وقت بالکل فارغ ہوں' تم جی بھر کے مجھے بور کر سکتی ہو' اپنے رافت رحمان کی باتیں کر کے۔''

''رافت کی باتیں تو بعد میں پہلے مجھے بتاؤ کس کا فون تھا۔''

''اسفر کا۔''

''ارے اسفر سے اب بھی تمہاری بات ہوتی ہے۔''

''اب بھی کا کیا مطلب؟'' اس نے بھنویں اچکائیں۔ ''کیا خدانخواستہ اسفر نے میری بھیڑیں چرائی تھیں' جو میں اس سے بات کرنا چھوڑ دیتی۔''

"خیر بھیڑیں تو تمہارے پاس ہیں نہیں اور کبھی پالنا بھی نہیں کہ ان کے پاس سے بڑی بو آتی ہے' لیکن کچھ اور تو نہیں چرا لیا' میرا مطلب ہے از قسم دل وغیرہ۔" میں نے یونہی تمہیں چھیڑا۔ "اور یہ تم اس قدر خوبصورت کیسے ہوگئی ہو۔"

"ہم تو شروع سے ہی خوبصورت ہیں۔" وہ اترائی۔

"مجھے تو یہ کسی کا حسن نظر آتا ہے۔ ذرا ادھر تو دیکھو میری طرف' یہ جھکی جھکی سی نظریں' رکا رکا تبسم تو کوئی اور ہی کہانی سنا رہا ہے۔" اس نے نظریں چرا لیں۔

"انو! کیا اب مجھ سے بھی چھپاؤ گی۔"

"نہیں تو تم سے بھلا کیا چھپانا۔ اصل میں مجھے' مجھے محبت ہوگئی ہے۔" وہ یکدم سرخ ہوگئی۔

"ارے!" میں اچھل پڑی۔

"کون ذات شریف ہیں؟ کیا ناصر کی شادی میں کسی کو دل دے دیا۔"

"اسفر......"

"اسفر......!" مجھے بے حد حیرت ہوئی۔

"تمہارا مطلب اسفر!"

"کیوں کیا اسفر سے محبت نہیں ہوسکتی۔"

"نہیں خیر۔"

میں لمحہ بھر کو چپ سی رہ گئی رافت کے مقابلے میں اسفر کی شخصیت بہت دبی دبی سی تھی' لیکن بہرحال اس کی شخصیت میں ایک سحر تھا' ہر بندہ اب ایک جیسا تو نہیں ہوتا نا......" میں نے سوچا اور اس کی طرف دیکھا۔

"اور یہ حادثہ کب وقوع پذیر ہوا۔"

میں نے انوسٹی گیشن جاری رکھی۔

"پتا نہیں انوشا! لیکن ایک دن مجھے لگا جیسے میں اسفر سے محبت کرنے لگی ہوں' حالانکہ اس سے پہلے کتنی ہی بار اسفر نے محبتوں کا اظہار کیا تو میں نے اس کی نفی کردی تھی کہ یہ محض اس کا وہم ہے' لیکن ایک بار جب وہ ویک اینڈ پر گاؤں گیا تو بہت دنوں بعد واپس آیا۔ مجھے لگتا تھا انوشا جیسے میں' میں مرجاؤں گی' اگر کچھ دن اور مجھے اس کے متعلق پتا نہ چلا' کتنے وہم

آئے مجھے اور جب وہ واپس آیا تو میں رو پڑی اور بے اختیار میرے لبوں سے نکل گیا کہ میں اس سے محبت کرنے لگی ہوں۔"

"مگر تم تو......تم تو انوشا اس طرح کی محبتوں کی قائل نہیں تھیں اور تمہارے خیال میں یہ محبت محض جذباتیت تھی۔"

"ہاں......لیکن اسفر نے خدا جانے کیا کردیا۔ انوشا مجھے تو یوں لگنے لگا ہے جیسے اس کی محبت میری رگوں میں لہو کے ساتھ گردش کرنے لگی ہے۔ وہ ایک دن جب میں اس سے بات نہیں کرپاتی وہ ایک دن مجھے عذاب لگتا ہے۔"

اور اس روز اسفر علی خان تمہارا ذکر کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں اتنے رنگ تھے اور چہرے پر اتنی چمک تھی اور وہ اتنی بے تحاشا خوبصورت لگ رہی تھی کہ میں نے ڈر سے نظریں جھکا لیں کہ کہیں اسے میری نظر ہی نہ لگ جائے۔

پتا نہیں میرے لاشعور میں کوئی خوف سا سما گیا تھا کہ میں نے اس سے کہا۔

"تم اسفر کو اچھی طرح جانتی بھی نہیں ہو کہ......"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو انوشا کہ میں اسے نہیں جانتی۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔

"میں اسے اتنا ہی جانتی ہوں جتنا آپ اپنے کو۔"

اس کے لہجے میں اتنا یقین تھا اسفر علی خان کہ اس یقین پر تو سب کچھ لٹایا جاسکتا ہے مگر تم......

"اس کا ماضی' اس کا حال' اس کا بچپن اور اس کے مستقبل کے خواب۔ وہ خواب جو پورے نہیں ہوئے اور وہ خواب جو ابھی اس کی آنکھوں میں سجے ہیں اور جن کی تعبیر پانے کی امید اسے زندہ رکھے ہوئے ہے اور جنہیں پانے کے لیے وہ اتنی جدوجہد کررہا ہے۔ میں تو اس کے لمحے لمحے سے باخبر ہوں انوشا!"

"میرا مطلب ہے کہ وہ کون ہے' اس کی ذات' برادری' فیملی بیک گراؤنڈ۔"

"تمہارے خیال میں محبت میں کیا یہ سب باتیں جاننا ضروری ہوتا ہے۔" اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ "محبت تو محبت ہوتی ہے اور وہ یہ سب کچھ نہیں دیکھتی۔"

"ہاں انعم! لیکن میرے خیال میں اس کا فیملی بیک گراؤنڈ کوئی اتنا مضبوط نہیں ہے۔ ایک بار مومنہ نے بتایا تو تھا اور اس کی ذات......"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"فار گاڈ سیک انوشا! مجھے تم سے ایسی بات کی توقع نہ تھی' تم تو شعر کہتی ہو' گداز دل رکھتی ہو۔ عالمی محبت کا پرچار کرتی ہو' تمہارے منہ سے یہ ذات برادری کی باتیں کچھ زیب نہیں دیتیں۔"

"سوری انعم! میں بابا کی وجہ سے کہہ رہی تھی' اگر بابا نے اسے قبول نہ کیا تو۔"

"اول تو بابا اسے پسند کریں گے بہت' دوم فی الحال ہم نے اس موضوع پر کبھی بات نہیں کی' اس کے ابھی بہت سارے مسائل ہیں۔ بہنوں کی شادیاں اور پھر شادیوں کے بعد یہاں شہر میں گھر خرید کر والدہ کو یہاں منتقل کرنا۔"

وہ تمہارے متعلق بہت جذباتی ہو رہی تھی اور اسفر علی خان! تم کتنے خوش قسمت تھے انعم جمال جیسی لڑکی نے تمہیں چاہا تھا۔ میرے دل میں اندر کہیں ٹیس سی اٹھی تھی۔ یہ لڑکی میرے بھائی کا مقدر بھی ہو سکتی تھی اور ناصر بچپن سے ہی اسے کس قدر پسند کرتا تھا اور صرف اس کی خوشی کی خاطر اس نے اماں کو مجبور کیا تھا کہ وہ انعم کا مؤقف تسلیم کرلیں۔

دراصل وہ اتنی معصوم اور حساس ہے کہ اگر اس کے ساتھ جبر کیا گیا تو وہ ٹوٹ جائے گی۔

اور یہ تم تھے اسفر علی خان جس کی وجہ سے نارسائی ناصر کا مقدر بنی تھی اریبنہ اچھی تھی دلکش تھی' لیکن اس میں انعم جیسی بات کہاں۔

تمہاری خوش قسمتی میں بلاشبہ کوئی شک نہیں تھا۔

یہ ہر وقت ہنستے ہنسانے اور خوش رہنے والی انعم جمال بے شمار خوبیوں کی مالک تھی۔

بلا کی کشش تھی اس کی ذات میں۔

ہمدرد' سخی' فراخدل' سچی' کھری۔

بے غرض اور سادا دل یہی انعم جمال تمہارے مقدر کا ستارا تھی۔ میں نے اسے تسلیم کرلیا اور ایک دم ہی تم مجھے اپنے اپنے سے لگنے لگے۔ تم نے کتنی جلدی انعم پر اپنا رنگ چڑھا لیا تھا اسفر علی خان ان مصروف شب و روز میں جب میں اس کی طرف سے غافل ہو گئی تھی۔ اس کی ذات میں حیرت انگیز تبدیلیاں ہوئی تھیں نہ صرف یہ کہ اس کی کتابوں میں شاعری کی کتابوں کا اضافہ ہو گیا تھا بلکہ وہ خود بھی شعر کہنے لگی تھی۔

اس قدر خوبصورت اور محبتوں کے جذبوں سے گندھے شعر' اس نے اس روز اپنی

نظمیں مجھے دکھائیں۔

"اور کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے انعم جمال! کہ تم تو شعراء کے متعلق بہت نادر خیالات رکھتی تھیں اور تمہارا خیال تھا کہ شاعر بننے سے بہتر ہے کہ بندہ گھاس چر لے۔ شعراء تو برساتی مینڈکوں کی طرح ہر کونے کھدرے سے نکل آتے ہیں۔ ہم تو ایسے شعبے میں جائیں گے جہاں آدمی کی قدر ہو۔"

"تو دو چار نظمیں کہہ لینے سے میں شاعر تو نہیں بن گئی ناں۔ یہ تو بس خود بخود ہو گئی ہیں یونہی باتوں باتوں میں۔"

ہارنا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا اسفر علی خان! لیکن تم نے تو اسے اس طرح ہرایا ہے کہ ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔

"وکیل کی بیٹی ہو۔ آخر بحث میں تم سے جیتنا مشکل ہے۔ ہائے واہ رے کیا اسفر علی خان بھی تمہیں اتنا ہی چاہتا ہے جتنا کہ تم چاہتی ہو اسے۔"

"تمہارے تصور سے بھی کہیں زیادہ انوشا! میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کوئی شخص دنیا میں مجھے بابا اور تم سب سے زیادہ چاہ سکتا ہے' اس کے بس میں ہو تو وہ زمین جس پر میں قدم رکھتی ہوں اس کے ذرے ذرے کو چوم لے۔"

"یعنی خوب ڈائیلاگ بولے جاتے ہیں۔"

میں مسکرا دی تھی' لیکن پتا نہیں کیوں مجھے وہم سا ہو گیا تھا' جیسے تم فلرٹ کر رہے ہو' جیسے تم انعم کے ساتھ یوں ہی وقت گزار رہے ہو' مجھے تم سے اپنی پہلی اور دوسری ملاقات یاد آ گئی تھی اور تمہاری گفتگو۔

"آپ تو خود سراپا غزل ہیں مس انوشا۔ ارے...... آپ کہاں چھپ گئی تھیں۔ میں آپ کو کھوجتا رہا۔"

شاید تمہاری گفتگو کا سٹائل ہی یہی تھا اور انعم معصوم اور بھولی بھالی لڑکی کہیں اسے تمہاری محبت نہ سمجھ بیٹھی ہو۔ لیکن جب میں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا تو وہ ناراض سی ہو گئی۔

"میں ایک میچور لڑکی ہوں انوشا اور وہ بھی کوئی ٹین ایجر نہیں ہے' پھر محبت تو خود بخود اپنا پتا دیتی ہے۔ فلرٹ اور محبت میں بظاہر کوئی واضح فرق نہیں بتایا جا سکتا' کوئی پیمانہ نہیں ہے اس کو ناپنے کیلئے۔ بس ایک یقین سا خود بخود دل میں اتر آتا ہے کہ یہ محبت ہے اور میرے دل

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

میں بھی یہ یقین خود بخود اتر آیا ہے کہ یہ محبت ہے۔"

اس کی آنکھیں یقین کی روشنی سے دمک رہی تھیں اور پھر تم سے مل کر' تم سے ... کرکے میرا وہم بھی جاتا رہا۔ مجھے بھی یہ یقین ہوگیا تھا اسفر علی خان کہ تم اپنے دل کی تہ ... گہرائیوں سے انعام کو چاہتے ہو' ان دنوں ایک بار پھر ہم ساتھ ساتھ رہنے لگے تھے۔

* * *

تنظیم کی کئی میٹنگز میں انعم نے میرے ساتھ شرکت کی' لیکن وہاں تمہارا انداز بالکل ... دیا سا رہتا تھا۔ تم اس طرح ملتے اور بات کرتے تھے جیسے اور سب سے تمہارا رویہ تھا اور ... نے ایک بار انعم سے کہا تھا۔

"انو! یہ اسفر کسی محفل میں ملے تو کس قدر اجنبی انداز ہوتا ہے اس کا جیسے معمولی ... جان پہچان ہو۔"

"ہاں وہ کہتا ہے کہ اسے اپنی پروا نہیں ہے' لیکن میری عزت کا خیال رہتا ہے ... کوئی بات نہ ہو' کہیں کوئی کچھ ہم دونوں کے حوالے سے کہہ نہ دے۔"

اس کی آنکھوں میں تمہارے لئے فخر تھا' مان تھا۔

"اور پتا ہے ایک بار ہم دونوں یونہی گھومنے کے لیے باہر نکل گئے تھے تو اس نے ... فرنٹ سیٹ پر بیٹھنے سے منع کردیا تھا۔"

"میں نہیں چاہتا انو! کہ کوئی تمہیں میرے ساتھ بیٹھا دیکھے اور تمہاری اس شفاف ذات ... پر کیچڑ اچھالے۔ میں اسے تو قتل کردوں گا خود بھی مر جاؤں گا میں جو اتنا محتاط رہتا ہوں ... صرف تمہارے لئے اور اس سے میں نے بھی اپنے دل میں تمہارے لئے بے حد احترام ... محسوس کیا۔ مرد و باپ' بھائی' بیٹا اور شوہر غیرت مند نہ ہوں تو ان کے ہونے کا کیا فائدہ ... میں نے سوچا تھا۔ انعم خود جیسی تھی منفرد مزاج اور منفرد سوچ کی ساری دنیا سے مختلف لڑکی ... بھی بالکل ویسے ہی ہو اور ایک روز جب اس کی ادبی تنظیم نے ایک نئے افسانہ نگار کی پہلی کتاب کی تقریب رونمائی کا اہتمام کیا تھا اور انعم اپنے پیپر کی تیاری کے سلسلے میں میرے ساتھ نہ آسکی تھی تو میں نے سچے دل سے تمہیں سراہا تھا۔

"اسفر! آپ اور انعم واقعی ایک دوسرے کے لیے بنائے گئے ہیں اور یقین کرو اسفر ... سینکڑوں ہزاروں لڑکیوں میں کوئی ایک لڑکی انعم جیسی ہوگی۔"

"نہیں انوشا' لاکھوں میں بھی کوئی ایک اس جیسا نہیں ہے۔" تمہارے لہجے میں کتنا یقین تھا۔ اسفر علی خان پھر یہ یقین کیسے ٹوٹ گیا' کیسے تم نے اسے رد کردیا۔ وہ جو لاکھوں میں ایک تھی۔

اور اس روز چائے پیتے ہوئے میں نے تمہیں انعم کی کتنی ہی باتیں بتائی تھیں۔ اس کے بچپن کی اور اس کے حال کی اور تم بہت دلچسپی سے سنتے رہے تھے۔

"میں جانتا ہوں انوشا وہ ایسی ہی ہے اور کبھی کبھی بہت حیران ہوتا ہوں کہ آج کل کے دور میں اس جیسی معصوم لڑکی بھی ہوسکتی ہے۔ کبھی کبھی تو میرا جی چاہتا ہے کہ اسے کہیں چھپا دوں۔ زمانے کی میلی نظروں سے دور رکھوں۔"

اور مجھے خوشی ہوئی تھی کہ تم انعم کے آئیڈیل مرد کی طرح غیرت مند ہو۔

اس نے کئی بار مجھ سے کہا تھا۔

"انوشا مرد میں کوئی اور خوبی ہو یا نہ ہو لیکن یہ تین خوبیاں ضرور ہونی چاہئیں' غیرت مند ہو' فراغ دل ہو' لالچی اور خود غرض نہ ہو اور محبت کرنا جانتا ہو۔"

تم غیرت مند تھے اور محبت کرنا جانتے تھے تب ہی تو انعم کے دل کو مٹھی میں لے لیا تھا۔

"جو لوگ محبت کرنا جانتے ہیں' وہ معاف کردینے کا ظرف بھی رکھتے ہیں اور انہیں کرچیاں چننا بھی آتا ہے۔"

یہ انعم کا خیال تھا اور مجھے خوشی تھی کہ تم بالکل اس کے خیالوں کی طرح ہو' مجھ سے تمہاری باتیں کرتے ہوئے انعم کے چہرے پر جو الوہی رنگ دمکنے لگے تھے۔ وہ اسے اس قدر حسین بنادیتے تھے کہ میں حیران سی رہ جاتی تھی کہ صرف ایک محبت میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔

اور مرد کی اس محبت کا احساس عورت کو کس قدر خوبصورت بنا دیتا ہے۔ انعم ان دنوں اتنی ہی حسین ہو رہی تھی کہ ماں نے بھی دل ہی دل میں اس کی نظر اتاری تھی اور ان دنوں میں نے بھی تم سے بے تحاشا باتیں کی تھیں۔ جب کبھی تمہارا فون آتا تو تم میرا ضرور پوچھتے تھے اور اگر میں انعم کی طرف ہوتی تو تم سے ضرور بات کرتی اور ہمارے درمیان زیادہ تر انعم کے متعلق ہی بات ہوتی تھی۔

"انعم......! کیا کر رہی ہے؟ کون سے کلر کے کپڑے پہن رکھے ہیں اس نے۔" وغیرہ وغیرہ۔

اور پھر رافت آسٹریلیا سے واپس آ گئے تو ان کے آتے ہی میری رخصتی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اب چونکہ انعم بھی فارغ تھی اس لئے میں ہر جگہ اسے اپنے ساتھ گھسیٹتی پھرتی تھی۔ اماں اس کے لیے فکرمند تھیں۔ کتنا اچھا ہوتا اگر تمہارے ساتھ انو کی بھی شادی ہو جاتی۔ وہ دن بھر میں کئی بار کہتیں اور انعم ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیتی۔

"پلیز اماں! ابھی نہیں کم از کم تین سال مجھے شادی نہیں کرنا یہ انوشا کی بچی چلی جائے گی نا تو آپ اکیلی ہو جائیں گی۔ اریبہ تو ناصر بھائی کے ساتھ چلی جائے گی اور میں ابھی آپ کی بہت ساری خدمتیں کرنا ہیں' ابھی تک تو آپ سے ہم نے خدمتیں کروائی ہیں۔"

"اے بچی! گھر میں دو دو تین تین ملازمائیں خدمت کے لیے موجود ہیں۔ بس تم اپنے گھر کی ہو جاتیں تو دل کو اطمینان ملتا۔"

انہیں واقعی انعم کی بہت فکر تھی۔ لوگ یہ نہ کہیں کہ اپنی بیٹی کی تو شادی کر دی اور بہن کی بچی تھی۔ اس کا سوچا ہی نہیں۔ کچھ اس لئے ہر ایک سے تعریف کرتیں۔

"ایسی میری بچی ہے' مقدر سنور جائے گا جس گھر میں جائے گی۔"

"تم اسفر سے کہو ناں انو! کہیں ایسا نہ ہو کہ اماں کسی کو گھیر گھار کر لے آئیں اور تمہارے لئے کوئی جائے فرار ہی نہ بچے۔"

"نہیں انوشا! میں اتنی خودغرض نہیں ہو سکتی۔ وہ اتنے مسائل میں گھرا ہوا ہے اور میں..... نہیں میں اس سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

اسے تمہارے پرابلمز کا کتنا خیال تھا اسفر علی خان! وہ سچ مچ تمہاری محبت میں بہت آگے نکل گئی تھی۔

* * *

میری شادی سے صرف چند دن پہلے مومنہ کے ساتھ رینو ملنے آئی تو میں نے تمہارے نام کا کارڈ رینو کو ہی دے دیا تھا۔

"یہ اسفر کو دے دینا۔"

"اسفر تو فی الحال گاؤں گیا ہوا ہے اگر تمہاری شادی سے پہلے آ گیا تو دے دوں گی۔"

"کیوں کیا زیادہ دنوں کے لیے گیا ہے۔" میں نے یونہی پوچھ لیا۔

"ہاں دراصل اس کی بیوی کی حالت کافی بگڑ گئی تھی۔ گاؤں میں زیادہ سہولتیں نہیں

ہوتیں ناں اس لئے ڈلیوری کیس بگڑ گیا تھا' لیکن اب بہتر ہے۔ بیٹا ہوا ہے اس کا' تیسرا بیٹا ہے۔ کل شام اس نے بھائی کو فون کیا تھا کہ شاید تین چار دن مزید رہنا پڑے۔"

مجھے لگا تھا جیسے میرے اوپر آسمان گر پڑا ہو اور میں ہونقوں کی طرح منہ اٹھائے اسے دیکھنے لگی۔

"یہ بھلا کیسے ممکن ہے..... کیسے ہو سکتا ہے اسفر تو انعم سے محبت کرتا ہے اور انعم..... تین بیٹے' بیوی کیا سچ ہے کیا جھوٹ۔"

"ارے تو اسفر میریڈ ہے' کمال ہے' اس نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔"

مومنہ کو بھی ازحد حیرت ہوئی تھی۔

"ہاں اس کی شادی تو بہت پہلے کہیں ہوئی تھی۔ اس کا بڑا بیٹا سات سال کا ہے۔ ایک بار اس کے ٹانسلز خراب ہو گئے تھے تو وہ اسے لایا تھا' بہت پیارا ہے اس کا بیٹا۔"

اور میں یوں بیٹھی رہ گئی جیسے کسی نے میرے جسم سے جان نکال لی ہو۔ انعم پر کیا گزرے گی یہ سن کر۔

تو گویا تم فلرٹ کر رہے تھے انعم سے۔ مجھے تم پر بے حد غصہ تھا اور مارے دکھ کے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ میں نے گھٹنوں پر سر رکھ لیا تو مومنہ اور رینو مجھے چھیڑنے لگیں۔

"دل میں تو لڈو پھوٹ رہے ہیں اور اوپر سے آنسو بہائے جا رہے ہیں ہے نا....."

اور وہ دونوں آواز ملا کر گانے لگیں۔

مکھڑے پہ سہرا ڈالے آجاؤ آنے والے
چاند سی بنو میری تیرے حوالے

میں نے اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپا رکھا تھا اور میرا دل انعم کے دکھ پر کٹ رہا تھا۔ کیسے برداشت کرے گی وہ اس اتنے بڑے دکھ کو' کتنی شدید محبت کرتی ہے وہ اس سے۔

تب ہی وہ بھی آ گئی اور ان کے ساتھ آواز ملا کر گانے لگی۔ میں نے گھٹنوں سے سر اٹھا کر ایک نظر اسے دیکھا۔ وہ کس قدر خوش تھی۔

اور کتنی چمک تھی اس کے چہرے پر اور جب اسے پتا چلے گا کہ اسفر.....

اور جھوٹ سے کتنی نفرت تھی اسے اور جھوٹ بولنے والے مرد زہر لگتے تھے اسے۔

"پتا ہے اسفر بالکل بھی جھوٹ نہیں بولتا انوشا۔"

ایک روز اس نے بڑے تفاخر سے مجھے بتایا تھا۔

اور اب......

کتنا مان تھا اسے تم پر اسفر علی خان۔

میں نے سر دوبارہ گھٹنوں پر رکھ لیا اور زور و شور سے رونے لگی تو وہ تینوں گھبرا کر مجھے چپ کرانے لگیں' لیکن میرے آنسو تو رکتے ہی نہ تھے۔

"پلیز اب چپ بھی کر جاؤ۔" مومنہ نے التجا کی۔

"نہیں تو میں ابھی فون کرتی ہوں رافت کو کہ فی الحال وہ رخصتی کا ارادہ ملتوی کر دیں کیونکہ انوشا بی بی ابھی اپنے میکے کی دہلیز نہیں چھوڑنا چاہتیں۔"

"ارے مومنہ باجی! ایسا غضب بھی مت کیجئے گا۔"

رینو نے مومنہ کی طرف دیکھا۔

لیکن مجھے ان کی ہنسی مذاق کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں تو آنے والے لمحوں سے بے انتہا خوفزدہ سی ہو کر مسلسل روئے جا رہی تھی۔

"اب دیکھو نا انوشا! اپنی انعم تو ذرا بھی نہیں روئے گی' جب پیا سنگ جائے گی کیوں انو۔"

"بالکل۔"

اس کی آنکھیں کسی تصور سے لو دینے لگی تھیں اور ہونٹوں پر مدھری مسکراہٹ آ کر ٹھہر گئی تھی۔

"تو اور کیا انو تو اپنی شادی کے گیت بھی خود ہی گائے گی......"

انہوں نے لقمہ دیا۔

"میں صرف گانے نہیں گاؤں گی۔ بھنگڑا بھی ڈالوں گی' کیونکہ مجھے پتا ہے کہ تم سب کی آوازیں انتہائی بے ڈھنگی ہیں اور تمہیں بھنگڑا ڈالنا بالکل نہیں آتا۔"

ہنسی کے مارے اس کی آنکھوں میں ستارے جگ مگ کرنے لگے اور میرا دل اندر ہی اندر ڈوبنے لگا تھا' اسفر علی خان کہ میں کیسے اسے بتا پاؤں گی کہ اسفر علی خان تو پہلے ہی شادی شدہ ہیں۔

* * *

اور پھر کتنے ہی دن میں اسے کچھ نہ بتا پائی اور میری شادی سے صرف چار دن پہلے ایک دوپہر تم اچانک ہی آ گئے تھے۔

"سنو انوشا!" دوپہر میں جب اماں اور سب لوگ سو رہے تھے انعم نے میرے کمرے میں جھانکا۔

میں آنکھوں پر ہاتھ رکھے اس وقت بھی تمہیں ہی سوچ رہی تھی کہ میں انعم کو کیسے بتاؤں کہ وہ سراب کو سمندر سمجھ بیٹھی ہے۔

"وہ...... اسفر آیا ہے۔"

"کہاں؟" میں ایک دم اٹھ بیٹھی۔

"ادھر ہماری طرف۔ میں تمہیں بلانے آئی ہوں۔"

خوشی اس کے چہرے' اس کی آنکھوں اور اس کے پورے وجود سے پھوٹ رہی تھی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اریبہ بھابی کے علاوہ ابھی کوئی مہمان نہیں آئے تھے۔ زیادہ تر مہمان بارات سے ایک دن پہلے آنے تھے اور چند ایک قریبی عزیزوں کی آمد آج یا کل متوقع تھی۔

میں نے سوئی ہوئی اریبہ بھابی پر ایک نظر ڈالی اور دوپٹہ سنبھالتی ہوئی اس کے پیچھے چل پڑی۔

"بابا آ گئے ہیں؟"

"نہیں شاید وہ کورٹ سے ہی چیمبر چلے گئے ہیں' فون آیا تھا ان کا کہ دیر سے آئیں گے۔"

تمہاری محبتوں کے رنگ اس کے چہرے پر جھلملا رہے تھے اور میں انتہائی دل گرفتہ سی سر جھکائے اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی ان کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھی۔ یہ کتنا بڑا المیہ تھا اسفر علی خان کہ تم اس کے ساتھ مخلص نہ تھے اور محض وقت پار کر رہے تھے' مجھے دیکھ کر تم کھڑے ہو گئے۔

"السلام علیکم انوشا! کیسی ہیں آپ؟"

میں سر کے اشارے سے تمہارے سلام کا جواب دے کر بیٹھ گئی تھی اور میری سمجھ میں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

نہیں آ رہا تھا کہ میں تم سے کیا بات کروں اور کس طرح حالانکہ ان بیتے دنوں میں بار ہا
نے سوچا تھا اور دعا کی تھی کہ ایک بار تم مجھے ملو تو میں تمہاری خبر لوں' لیکن اب جیسے لفظ
ہو گئے تھے' حالانکہ اندر ایک طوفان بپا تھا' نگاہیں بار بار کبھی تمہاری طرف اٹھ جاتیں
انعم کی طرف اور تمہاری نگاہیں تو جیسے مسلسل اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

پھر جیسے تمہیں اچانک ہی میری موجودگی کا احساس ہوا تھا۔

''انوشا! میں گاؤں گیا ہوا تھا' اس لئے تمہاری شادی کا پتا نہیں چل سکا' آج
ہوں تو کارڈ ملا تو سوچا تمہیں مبارکباد دے آؤں' شرمندہ ہوں کہ کوئی گفٹ نہیں
تمہارے لئے' اور معذرت خواہ ہو کہ شادی میں بھی شریک نہ ہوسکوں گیا کہ آج ہی واپس
جا رہا ہوں' بس کچھ مصیبت میں پھنسا ہوا ہوں' صرف چند گھنٹوں کے لیے آیا تھا تم
سے ملنے۔

''اتنے دن ہو گئے تھے انعم سے بات کئے' اسے دیکھے۔ لگتا تھا جیسے اب مزید کچھ
اس سے بات نہ کر پایا تو مر جاؤں گا' جیسے بالکل خالی خالی سا ہو گیا تھا۔''

انعم کی آنکھیں لو دینے لگیں اور ہونٹ کھل گئے' لیکن میں ذرا بھی متاثر نہ ہوئی' اسفر علی
خان' میں نے سر اٹھا کر تمہیں دیکھا۔

''کیسی مصیبت؟''

''ایک عزیزہ کچھ بیمار تھیں اور کچھ گھریلو مسئلے تھے۔ والدہ کی طبیعت بھی اچھی نہیں۔''

''والدہ کی طبیعت یا بیوی کی؟''

میرے ہونٹ زہر میں بھیگ گئے' لہجے کی کڑواہٹ میں نے اپنے حلق تک محسوس کی
تمہاری آنکھوں میں ایک لمحہ کے لیے حیرت سی ابھری اور پھر معدوم ہو گئی۔ تم نے
جھکا لیا انعم آنکھوں میں بے یقینی اور حیرت لئے تمہیں دیکھ رہی تھی۔ میں نے سوچا تھا تم انکار
کرو گے مکر جاؤ گے اور میں پھر تمہیں آئینہ دکھاؤں گی' لیکن تم نے تو ایسا کچھ نہیں کیا تھا
علی۔

''بیٹا مبارک ہو اسفر خان'' میں نے پھر زہر اگلا۔

انعم ساکت بیٹھی تھی۔ اس کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔

''تھینک یو!......'' تمہارے چہرے پر نہ ندامت تھی نہ شرمندگی' تم نے انعم کی طرف

دیکھا۔

''انعم! میں نے اپنا ماضی' اپنا حال سب کچھ تمہارے سامنے رکھ دیا تھا' لیکن تمہیں یاد
ہے میں نے تم سے کہا تھا' انو میں نے اپنی ذات کے حوالے سے ایک بات تم سے چھپائی
ہے اور کسی مناسب وقت پر بتا دوں گا' اور وہ بات جو میں نے تم سے چھپائی تھی وہ یہی تھی' انو
میری شادی بہت کم عمری میں ہو گئی تھی۔ اس وقت جب میں پڑھتا تھا' میں نے بہت احتجاج
کیا تھا۔ انو اس لئے نہیں کہ میری بیوی بدصورت تھی' نہیں وہ اچھی خاصی خوش شکل ہے۔ اس
لئے کہ ابھی میں شادی نہیں کرنا چاہتا تھا اور پھر میری اور اس کی ذہنی اپروچ میں بہت فرق تھا
وہ بالکل ان پڑھ ہے انو! لیکن میں مجبور ہو گیا۔ اپنی بہن کا گھر بچانے کیلئے۔ یہ شادی ہوئی تو
لیکن میں اس سے کبھی محبت نہ کر سکا' کبھی نہیں' حالانکہ میں نے اس کے حقوق پوری ذمہ داری
سے پورے کئے' کبھی کوتاہی نہیں کی' مگر محبت' محبت میں نے صرف اور صرف تم سے کی ہے۔''

تمہاری آواز بھرا گئی تھی اور آنکھوں میں نمی ٹھہر گئی تھی۔

''تم میری پہلی اور آخری محبت ہو' تم سے پہلے میں نے کسی کو نہیں چاہا' کسی کے لیے
یہ جذبہ محسوس نہیں کیا۔''

''اگر آپ مجھے بتا دیتے تو میں خود کو روک لیتی اسفر۔'' انعم کی آواز آنسوؤں سے بھیگ
رہی تھی۔

''ہم اتنا آگے نہ آتے' یہ محبت اتنی تناور نہ ہوتی۔''

''میں تم سے جدا ہونا نہیں چاہتا تھا انو! مجھے پتا تھا کہ جس دن تمہیں پتا چلا ہمارے
راستے جدا ہو جائیں گے' میں زیادہ سے زیادہ دیر تمہارے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔''

تم ایک دم کھڑے ہو گئے تھے۔

''ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔ لیکن ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا زندگی کے آخری لمحے تک
میں تم سے اسی طرح اتنی ہی محبت کرتا رہوں گا۔''

تم تیزی سے باہر نکل گئے تھے اور انعم جیسے کسی خواب سے چونک کر تمہیں پکارتی ہوئی
تمہارے پیچھے لپکی تھی۔

''اسفر! اسفر پلیز رکو تو۔''

اور میں جو سوچ رہی تھی کہ تم ملے تو جانے کیا کر بیٹھوں گی۔ ہاتھ گود میں دھرے

ساکت بیٹھی رہ گئی تھی اور تم دونوں کا درد میرے دل میں اتر آیا تھا۔

تم کتنے بڑے اداکار تھے اسغر علی خان۔

جھوٹ میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے ماہر' تمہیں تو آسکر ایوارڈ ملنا چاہیے تھا۔

بہت دیر بعد انعم اندر آئی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں' جیسے بے حد روتی رہی ہو اور چہرہ بھی تپ سا رہا تھا۔

میں اسے تسلی دینا چاہتی تھی۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیسے تسلی دوں میں اس کی کیفیت سمجھ رہی تھی اسغر علی خان۔

منزل ایک دم دور چلی جائے۔ بلکہ کھو جائے تو کیا کیفیت ہوتی ہے۔

وہ کھو دینے سے کرب سے گزر رہی تھی' پھر بھی وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور اس نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی۔

''دلکش۔'' والوں سے اپائنٹمنٹ ہوگئی ہے؟''

''ہوں۔''

''کتنے بجے پارلر جانا ہوگا؟'' میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

''انو! تم آرام کرو۔''

میں اسے اکیلے نہیں چھوڑنا چاہتی تھی اسغر علی خان! لیکن مجھے یہ بھی پتا تھا کہ اس وقت اسے تنہائی کی ضرورت ہے۔

اور میں اسے آرام کرنے کی تلقین کر کے اپنے کمرے میں چلی آئی۔

اور یہ اچھا نہیں ہوا تھا اسغر علی خان۔

اس کا دل تو بالکل شفاف تھا۔

پہاڑوں سے بہہ کر آنے والے پانیوں کی طرح شفاف اور پاکیزہ۔ تم ایک پابند شخص تھے اور تمہیں کوئی حق نہیں تھا کہ تم اس کے دل میں محبت کی جوت جلاؤ۔

اسے ان منزلوں کے خواب دکھلاؤ جو کبھی اس کا نصیب نہیں بنی تھیں' میں تم سے خفا تھی' لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل تمہارے لئے بھی دکھ رہا تھا' اور میں دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ خدا تم دونوں کو ایک دوسرے کی محبتوں سے آزاد کر دے۔ مگر بھلا یہ کیسے ممکن تھا اسغر علی خان کہ انعم کے دل سے تمہاری محبت ختم ہو جاتی۔ وہ تو اسی طرح تھی تمہاری شادی اور تمہارے

اس کے متعلق جان کر اس کی محبت میں رتی بھر بھی کمی نہیں آئی تھی۔

مہمانوں کے ہجوم اور شادی کے ہنگاموں میں میں اس سے بات تو نہیں کر سکی تھی۔

لیکن میری نظریں ہر لمحہ اسے کھوجتی رہی تھیں' اس کی آنکھوں کی جوت مدھم پڑ گئی تھی۔ رخساروں کا رنگ پھیکا ہو گیا تھا' اگرچہ وہ سارے فنکشنوں میں شریک ہوئی تھی۔ اس نے میری شادی کے گیت بھی گائے تھے۔

اور سب کے ساتھ مل کر ڈانس بھی کیا تھا' پھر بھی مجھے لگتا تھا جیسے اداسی کا ایک سنہرا سا ہالہ ہے' جس نے اس کے پورے وجود کو اپنے ہالے میں لے رکھا ہے۔

جب میں دلہن بن کر رافت کے سنگ رخصت ہو رہی تھی تب میں نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر نم آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔

''اپنا خیال رکھنا انو۔''

''ہشت۔'' وہ ہنسی ''میرا خیال چھوڑو۔ اب رافت بھائی کی فکر کرو۔''

''نہیں انو! وعدہ کرو اداس نہیں ہوگی۔''

''نہیں۔'' اس کی آنکھیں جھلملا سی گئی تھیں۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں انوشا! ایک دم فرسٹ کلاس ڈونٹ وری۔''

لیکن اس کے دلاسا دینے کے باوجود مجھے اس کی فکر لگی رہی تھی۔

اور یہ محبتوں کے عذاب کتنے کڑے ہوتے ہیں اور وہ نازک سی انعم جمال جو گھر بھر کی لاڈلی تھی جسے کانٹا بھی چبھتا تو کرماں بی بی سمیت سارا گھر بے چین ہو جاتا تھا' کیسے تنہا اس عذاب سے گزر رہی ہوگی۔ میں جانتی تھی اسغر علی خان کہ وہ تم سے کتنی شدید محبت کرتی تھی۔

اور ضبط کی کن منزلوں سے گزرنا پڑ رہا تھا اسے' تب ہی تو ہنی مون سے واپس آتے ہی میں نے رافت سے ایک رات گھر رہنے کی اجازت لے لی۔

''اور میں اکیلا انوشا' نہیں بھئی' رات کو آجانا۔''

''پلیز رافت! میں انعم کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔ اس کی طبیعت اچھی نہ تھی اور اور میں اس کے لیے بہت اداس ہوں۔''

''اوکے ڈیئر۔''

رافت میں یہ خوبی تھی کہ وہ دوسروں کی خاطر اپنی خواہشات ڈراپ کر دیتے تھے۔ بلا کا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

صبط تھا ان میں' بالکل انعم کی طرح اور میں نے ان چند دنوں میں کتنی بار سوچا تھا انعم کے
کوئی رافت جیسا بند ہونا چاہیے تھا۔

ذرا فراخ دل' محبت کرنے والا کشادہ ذہن۔

مگر محبت تو کچھ نہیں دیکھتی۔ نہ عمروں کا حساب کرتی ہے اور نہ ذات پات۔

* * *

اور اتنے سارے دنوں بعد میں نے انعم کو دیکھا' وہ کچھ کمزور لگ رہی تھی۔ لیکن
کے چہرے پر سکون تھا اور سب کے ساتھ مل کر مجھے چھیڑتے ہوئے اس کی ہنسی کی کھل
پورے ڈائننگ ہال میں گونج رہی تھی۔

اور اس کے بائیں رخسار کا تل اس کے ڈمپل میں گم ہو ہو کر ابھر رہا تھا اور اس
صراحی دار گردن کے عین مرکز میں وہ سیاہ تل جیسے پہلے سے زیادہ دلکش لگ رہا تھا۔ یا
اس روز جب تمہاری برتھ ڈے انعم نے تنظیم کے دفتر میں سیلیبریٹ کی تھی اور اس برتھ ڈ
پارٹی میں صرف تم میں اور انعم تھے۔ انعم نے گھر پر خود بلیک فارسٹ کیک بنایا تھا' اور تمہیں
فون کیا تھا کہ تم فوراً "تنظیم" کے دفتر پہنچ جاؤ' "تنظیم" کے اس دفتر کی چابی تمہارے پاس
ہوتی تھی' جو شادمان میں ایک کمرے کے فلیٹ پر مبنی تھا۔

اور تم کس قدر حیران ہوئے تھے اسفر! تمہیں اپنی برتھ ڈے یاد تک نہ تھی۔ انعم
تمہیں بہت قیمتی گفٹ دیا تھا۔ سونے کی چین جس میں چاروں قل ایک ننھے سے ستارے
شکل میں لکھے ہوئے تھے۔

اور تم نے اسی وقت اس چین کو گلے میں ڈال لیا تھا۔

"یہ چین ہمیشہ اپنے گلے میں رکھنا اسفی! کبھی مت اتارنا' یہ چاروں قل تمہیں ہمیشہ
آفت سے محفوظ رکھیں گے۔" انعم جذباتی ہو رہی تھی اور تم نے مسکرا کر وعدہ کر لیا تھا۔

"یہ چین زندگی کے آخری لمحے تک مجھ سے جدا نہیں ہوگی انعم۔"

میں نے تمہیں راحت عابدی کی "محبتیں" گفٹ کی تھیں' اس روز انعم بڑے اہتمام
تیار ہوئی تھی اور زندگی میں شاید پہلی بار اس نے اپنے ہونٹوں پر لائٹ پنک لپ اسٹک لگا
تھی۔

اور آنکھوں کو کاجل سے سجایا تھا اور پنک کڑھائی والے سفید سوٹ میں بہت کھل

تھی اور اس کی گردن کا اور رخسار کا تل اس کے گندمی رنگ پر قیامت ڈھا رہا تھا اور تم نے
بے اختیار جھک کر کہا تھا۔

گرمی ترک شیرازی بدست آردول ملورا
حال بندوش بخشم سمرقندو بخارارا

وہ شیرازی محبوب میرے دل کو اپنے ہاتھوں میں لے لے تو اس ہندی محبوب کے اس
تل کے بدلے میں سمرقند اور بخارا اسے بخش دوں۔"

اور انعم نے ہنستے ہوئے اپنے ہاتھ آگے پھیلا دیئے تھے۔

"میں نے اپنا آپ' اپنی زندگی' اپنا سب کچھ تمہارے قدموں میں ڈال دیا ہے انو۔"

تم ایک دم جذباتی ہو کر اس کے پاؤں کے پاس بیٹھ گئے تھے۔

"اور میرے پاس میرا اپنا تو کچھ بھی نہیں رہا' اگر میں بااختیار ہوتا تو پوری کائنات
تمہارے قدموں میں ڈال کر بھی سمجھتا کہ یہ تو بہت معمولی ہے' میں تمہیں چاہتا ہوں انعم اور
ساری زندگی تمہارے قدموں میں یوں ہی بیٹھے رہنا چاہتا ہوں اور اگر کسی دن تم مجھ سے
بدگمان ہو گئیں اور تم نے مجھ سے آنکھیں پھیر لیں تو وہ دن میری زندگی کا آخری دن ہوگا'
انعم......"

تب اچانک ہی تمہیں میری موجودگی کا احساس ہوا تھا اور تم نے مڑ کر مجھے دیکھا تھا اور
تمہاری آنکھوں میں شرارت چمک اٹھی تھی۔

"اور اگر اس وقت انوشا یہاں نہ ہوتی تو میں تمہارے اس بڑھے ہوئے ہاتھ پر اپنے
پیار کے اتنے پھول سجاتا کہ یہ سالوں مہکتے رہتے۔"

"میں تھوڑی دیر کو ادھر پیٹھ کر لیتی ہوں۔"

میں نے بھی شرارت سے انعم کو دیکھا تھا اور انعم نے گھبرا کر اپنے ہاتھ پیچھے کر لئے
تھے۔

"یہ ہاتھ بہت مقدس ہیں انوشا! میں تو کسی استحقاق کے بغیر انہیں چھونا بھی گناہ سمجھتا
ہوں' میرے مذاق سے بدگمان نہ ہو جانا۔"

اور تمہارا قد میری نظروں میں اس سے کتنا بڑا ہو گیا تھا اسفر علی خان اور اس روز وہ منظر
میری آنکھوں کے سامنے آ گیا تھا اور اس کی آنکھوں میں جگمگ جگمگ کرنے ہنسی کے تارے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

دیکھتے ہوئے میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔

اور ایک گہرا اور میرے دل کو چھیلنے سا لگا تھا۔

اور مجھے لگا تھا جیسے انعم وہ نہیں رہی۔ جیسے انعم نے اپنے آپ کو کسی دبیز لبادے کے پیچھے چھپا لیا ہے۔ جیسے اس کی کھل کھل کرتی ہنسی۔

اور آنکھوں میں جگمگ جگمگ کرتے تارے سب دکھاوا ہوں۔

اور کیا وہ آسانی سے اسفر کو بھول سکے گی۔

اور رات کو اس کے کمرے میں اس کے بیڈ پر لیٹتے ہوئے میں اس سے تمہارے متعلق پوچھنے ہی والی تھی کہ فون کی بیل بج اٹھی۔ یہ تمہارا فون تھا اسفر اور میں ازحد حیران ہوئی تھی۔

”کیا تم اب بھی اسفر سے بات کرتی ہو انو۔“

جب اس نے تمہیں میرا بتا کر فون بند کیا تھا تو میں نے پوچھا۔

”اب بھی سے کیا مطلب انوشا‘ محبت کے رشتے اتنے کمزور تو نہیں ہوتے کہ معمولی باتوں پر ٹوٹ جائیں۔“

”یہ معمولی بات تو نہیں ہے انو؟“

”شاید لیکن انوشا! یہ شادی مجھ سے ملنے سے بہت پہلے ہو چکی تھی‘ اگر وہ مجھ سے محبت کا دعویٰ کرنے کے بعد ایسا کرتا تو پھر تکلیف دہ بات ہوتی نا......“

”مگر انو! اب تمہیں اس سے بات نہیں کرنی چاہئے۔“ میں نے اسے سمجھایا۔

”محبت صرف پالینے کا نام ہی تو نہیں ہوتا انوشا! یہ تو ایک الوہی جذبہ ہے اور جب اس میں سے غرض نکل جاتی ہے تو یہ محبت بہت ارفع ہو جاتی ہے اور میری محبت میں بھی طلب نہیں رہی انوشا! میں نے خود کو اس کی محبت میں غنی کر لیا ہے انوشا! ہر طلب سے غنی‘ میرے دل میں صرف اس کی محبت رہ گئی ہے۔ خالص اور ہر طلب سے بے نیاز صرف محبت یوں جیسے چھلنی میں چھن کر کوئی چیز خالص ہو جائے۔“

اور میں حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

”اور اس محبت کا انجام کیا ہوگا انو؟“ میں بے چین ہو کر اٹھ بیٹھی۔

”محبت ہمیشہ اپنے انجام سے بے خبر ہوتی ہے انوشا!“

اس کے چہرے پر سکون ہی سکون تھا‘ جیسے صرف تمہاری محبت کا احساس پا کر اس نے

سب کچھ پالیا ہو اور یہ کیسے ممکن ہے انعم کہ محبت ہو اور پانے کی خواہش نہ ہو رفاقت کی تمنا ہو‘ دل تو چاہتا ہوگا تمہارا کہ تم اور اسفر زندگی کا سفر ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر طے کرو۔“

میں نے ازحد دل گرفتگی سے کہا۔

”تمہاری آنکھوں میں تارا سا چمکا لیکن تم مسکرا دیں۔

یہ عجیب میری محبتیں‘ کوئی پوچھ لے تو میں کیا کہوں

یہ عجیب میرے غم والم

یہ نصیب سنگ سیاہ پر

میرا انتظار قدیم سے

میرا اس سے پیار قدیم ہے

یہ عجیب میری محبتیں

”انو! اسفر نے بہت زیادتی کی ہے تمہارے ساتھ...... بہت ظلم کمایا ہے۔ اسے تمہیں روز اول ہی بتا دینا چاہئے تھا کہ وہ ایک پابند آدمی ہے۔ کیا حق پہنچتا تھا اسے کہ بیوی کے ہوتے ہوئے وہ تمہیں محبتوں کے خواب دکھائے۔ تمہارے دل کو اپنی مٹھی میں لے۔“ انعم کے حد درجہ......سکون نے مجھے مضطرب کر دیا تھا۔

”اب بھی وقت ہے انو! لوٹ آؤ واپس۔ بہت آگے چلی گئیں تو پھر مشکل ہو جائے گی پلٹ نہیں سکو گی۔“

”اور تم کیا سمجھتی ہو انوشا!“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

”اب میں جہاں ہوں وہاں پلٹ سکتی ہوں۔ نہیں انوشا! میں بہت آگے جا چکی ہوں۔ طلب کی منزلوں سے بھی بہت آگے۔ تم کہتی ہو اسے کوئی حق نہیں تھا کہ وہ مجھے محبتوں کے خواب دکھائے اور میں میں سوچتی ہوں کہ میں کتنی خوش قسمت ہوں کہ مجھے محبت ملی‘ مجھے چاہا گیا‘ تم کیا جانو انوشا! اسفر نے مجھے کتنا اور کس قدر چاہا ہے۔“

اس کے چہرے پر تمہارے ذکر سے رنگ سے بکھر گئے تھے۔

”پھر بھی انو! اب تمہیں اس سے بات نہیں کرنا چاہئے اور نہ ہی ملنا چاہئے۔“

”ہاں انوشا! میں نے بھی سوچا تھا کہ مجھے اس کی دنیا سے نکل جانا چاہئے‘ تمہاری شادی کے چند دن بعد رینو کے ہاں اس کی باجی کی منگنی میں‘ میں نے اس کی بیوی کو دیکھا۔

وہ تو بے حد خوبصورت نیلی آنکھوں والی گڑیا سی لڑکی تھی۔ بے حد معصوم اور سادہ سی مجھے [illegible] احساس جرم ہوا۔ یوں جیسے میں اس کی مجرم ہوں، غاصب ہوں، میں نے اس دل پر قبضہ کر [illegible] ہے، جس کی مالک وہ تھی۔ یقین کرو انوشا! میرے دل میں اس کے لیے ذرا بھی رقابت نہیں تھی بلکہ مجھے اس پر پیار آ رہا تھا اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اسے اور اس کے بچوں کو بہت پیار کروں، اسفی کے بیٹے بھی بہت پیارے ہیں، لیکن میں تو اس سے نظر ملا کر بات بھی نہ کر سکی۔ لیکن اسفی، اس نے میری کوئی بھی بات ماننے سے انکار کر دیا، جانتی ہوں انوشا! اس نے کہا اگر میں اس کی زندگی سے نکل گئی اور میں نے اس سے بات کرنا چھوڑ دیا تو وہ ایسا نہ کر بیٹھے گا کہ میں ساری زندگی پچھتاتی رہوں گی۔ وہ مجھ سے بات کئے بغیر نہیں رہ سکتا انوشا اور میں بھی شاید، حالانکہ میں جانتی ہوں یہ صحیح نہیں ہے۔"

اور اسفر علی خان میرے پاس جیسے اس کے بعد کہنے کو کچھ بھی نہ تھا، میں کتنی ہی دیر تک چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔

یہ کیسی محبت تھی اسفر علی خان! جس میں صرف ہجر ہی ہجر تھا۔ وصل کی امید کہیں نہ تھی پھر بھی اس کی آنکھوں میں ایک جوت سی جل رہی تھی اور چہرہ روشن روشن لگ رہا تھا۔

کبھی اس نگر تجھے دیکھنا، کبھی اس نگر تجھے ڈھونڈنا
کبھی رات بھر تجھے سوچنا، کبھی رات بھر تجھے ڈھونڈنا
تیری یاد آئی تو رو دیا جو تو مل گیا تجھے کھو دیا
میرے سلسلے بھی عجیب ہیں، تجھے چھوڑ کر تجھے ڈھونڈنا

میرے قریب بیڈ پر لیٹتے ہوئے آنکھیں بند کرتے ہوئے بڑے بڑے جذب سے اس نے یہ شعر پڑھے تو میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"انو! تم تو شعروں کو وقت کا زیاں اور شاعروں کو برساتی مینڈک کہا کرتی تھیں، پھر یہ تبدیلی۔"

"یہ تبدیلی۔" وہ آنکھیں کھول کر گنگنائی۔

چھاپ تلک سب چھین لی
موسے نیناں ملائی کے

لیکن اس کے باوجود اسفر علی خان میں نے اسے سمجھایا تھا۔

"پھر بھی انو! کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی مقام پر تو تمہارا [illegible] وہ جان [illegible] گی؟ ابھی سے کیوں نہیں، تم اپنے آپ کو غلط سمت جانے سے روک لیتیں۔"

"یہ اب میرے اختیار میں نہیں رہا انوشا! مجھے لگتا ہے اگر کسی روز [illegible] نہ ہوئی تو وہ دن میرے لئے طلوع نہیں ہوگا۔" اور میں اس کی ان ضرورتوں سے خوفزدہ ہو گئی تھی۔

* * *

اور پھر رافت کا ٹرانسفر کراچی ہو گیا اور وہاں بھی کبھی کبھی میں بہت بے چین ہو جاتی، اماں انعم کے لیے پریشان تھیں، اس نے جاب کر لی تھی اور شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا اور بہت مطمئن اور پرسکون تھی۔

"ایسا آخر کب تک چلے گا انو!"

میں جب بھی فون کرتی ضرور کہتی۔

"جب تک زندگی ہے تب تک انوشا!" وہ بڑے اطمینان سے کہتی۔

"اسفر کیسا ہے؟ بات ہوتی ہے تمہاری۔" میں ہمیشہ تمہارے متعلق پوچھتی تھی۔

"ہاں...... اچھا ہے تمہیں سلام کہہ رہا تھا۔"

"وعلیکم السلام۔"

"کیا وہ بھی تمہاری طرح مطمئن ہے اور پرسکون؟ کیا اس کے دل میں بھی تمہاری رفاقت کی خواہش پیدا نہیں ہوتی؟"

"پتا نہیں میری رفاقت کی خواہش اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے یا نہیں، لیکن میری جان ہم دونوں اتنا جانتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور یہ ہمارے لئے کافی ہے۔"

انعم سے مجھے تمہارے متعلق پتا چلتا رہتا تھا کہ تم آج کل کہاں ہو کیا کر رہے ہو، خوش ہو نا خوش ہو...... جب کبھی فون پر بات ہوتی وہ مجھے تمہارے متعلق ضرور بتاتی۔

اماں نے کئی بار کہا تھا کہ میں کچھ دنوں کے لیے آؤں اور انعم کو سمجھاؤں جب بھی کوئی رشتہ آتا ہے بہانہ کر دیتی ہے۔

لیکن باوجود کوشش اور چاہت کے میں نہ آ سکی۔ حالانکہ کراچی کوئی ایسا دور نہ تھا، ایک

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

بار تیار ہوئی تو ڈاکٹرز نے سفر سے منع کر دیا۔ دوسری بار انیل کو نمونیہ ہو گیا' پھر لاہور سے اس کے والدین آ گئے اور یوں میں پورے ڈیڑھ سال بعد لاہور آئی اور کتنی بے چین تھی میں ... سے ملنے کیلئے۔

اماں کے گلے سے لگ کر تو جیسے جدا ہونے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا اقم مجھے پہلے مقابلے میں کافی کمزور لگی۔ اس کی آنکھوں کے تارے بھی بجھے بجھے سے تھے اور اس کی کھل کھل بھی کہیں گم ہو گئی تھی۔

''انو......'' جیسے ہی تنہائی ملی میں نے بے حد دکھ سے کہا۔

''یہ کیا روگ لگا لیا ہے تم نے۔ صبح سے اب تک ایک بار بھی میں نے تمہاری ہنسی نہیں سنی۔''

''کوئی ہنسنے والی بات ہی نہیں تھی۔''

''لیکن پہلے تو تم نہ ہنسنے والی بات پر بھی ہنسا کرتی تھیں۔'' میں نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''پہلے اور بات تھی اب اور بات ہے' اب میں کوئی چھوٹی بچی نہیں ہوں' ایک ذمہ دار ورکنگ ویمن ہوں۔''

''ڈیڑھ سال میں تم ایک دم بڑی ہو گئی ہو انو۔''

''بات ڈیڑھ سال کی نہیں ہے انوشا۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''اب میں جاب کرتی ہوں' ظاہر ہے تبدیلی تو آتی ہے نا۔''

''اور اسفر کیسا ہے؟''

''اچھا ہے' بہت ترقی کی ہے۔ یہاں ڈیفنس میں گھر لے لیا ہے' چند دنوں تک اپنی فیملی کو لے آئے گا۔''

''اور تم...... تم نے اپنے متعلق کیا سوچا ہے۔''

''میں نے کیا سوچنا ہے انوشا فیصلے روز روز تو نہیں ہوتے۔''

''لیکن یہ لاحاصل سفر تمہیں بہت جلد تھکا دے گا۔ بلکہ مجھے تو لگ رہا ہے کہ تم ابھی سے تھکنے لگی ہو۔''

''نہیں۔'' اس نے تڑپ کر مجھے دیکھا۔

''مجھے اس لاحاصلی نے نہیں تھکایا انوشا! یہ لاحاصلی اور نارسائی تو پہلے روز ہی میرا مقدر ہو گئی تھی۔ جب میں نے اس سفر کو شروع کیا تھا تو مجھے پتا تھا کہ اس سفر کی کوئی منزل نہیں ہے۔ یہ یقین مجھے ہمیشہ سرگرم سفر رکھے گا کہ اسفی نے مجھ سے محبت کی ہے۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ یہ یقین میری زندگی کے چراغ کا تیل ہے۔ لیکن اگر کبھی اس نے میرا یقین توڑ دیا تو شاید میں نہ بچوں...... انوشا پتا نہیں کیوں آج کل مجھے ایسا لگنے لگا ہے جیسے اس کے لہجے کے رنگ بدل رہے ہوں' جیسے وہ اندر سے تبدیل ہو رہا ہے' جیسے کہیں کوئی کمی ہو گئی ہے' حالانکہ وہی وہ ہے وہی میں ہوں' وہی لہجہ وہی چاہت' وہی انداز ہیں اس کے' وہی وہ مہرباں لہجہ' وہی وہ بولتی آنکھیں' وہی جذبوں میں حدت ہے' وہی لفظوں کی رعنائی' مگر کہیں پر اک کمی محسوس ہوتی ہے' اور وہ کہتا ہے کہ وہ آج بھی صرف اور صرف مجھ سے محبت کرتا ہے' اور یہ کہ مجھے اس پر یقین رکھنا چاہئے' مگر پتا نہیں کیوں مجھے اس کے اندر وہ شدتیں دکھائی نہیں دیتیں۔

وہ آج بھی مجھے فون کرتا ہے تو تجدید محبت کرتے ہوئے ہمیشہ I Love You کہتا ہے لیکن۔'' اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''دیکھو انو! ہمیشہ ایک سا انداز تو نہیں رہ سکتا' کبھی لہجے اور رنگ بدل بھی جاتے ہیں' سو طرح کے مسائل ہوتے ہیں۔'' میں نے تمہارا دفاع کیا۔

''اس کا ایک گھر ہے بچے ہیں' کئی پرابلمز ہوتے ہوں گے انسے' اب بندہ ہمیشہ تو رومینٹک موڈ میں نہیں ہوتا نا۔''

''نہیں انوشا! تم نہیں سمجھ سکتیں۔ کچھ باتیں محسوس کی جا سکتی ہیں سمجھائی نہیں جا سکتیں' بس تم میرے لئے دعا کرنا کہ میں کبھی بے یقین نہ ہوں' میرا دل ڈرنے لگا ہے' حالانکہ آج بھی مجھے اس کی محبتوں پر اتنا ہی یقین ہے بس پتا نہیں کیوں۔ شاید میں اندر سے کمزور ہو گئی ہوں۔

میں اس کے رویے کی ذرا سی تبدیلی بھی برداشت نہیں کر پاتی ہوں۔ تم صحیح کہتی ہو ان دنوں وہ مصروف تھا۔ مکان وغیرہ کے سلسلے میں بھاگ دوڑ کر رہا تھا نا اس لئے اکثر فون نہیں کر پاتا تھا اور میں۔''

وہ ہنس پڑی' لیکن اس کی آنکھوں میں ہنسی کے تارے نہیں کھلے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ہم ڈیڑھ سال بعد ملے تھے اور ہمارے پاس کرنے کو بہت باتیں تھیں' لیکن لگتا ہے
جیسے تمہارے سوا ہمارے پاس اور کوئی موضوع ہی نہ رہا ہو۔ وہ ڈائری میرے ہاتھ میں دے کر
انیل سے کھیلنے لگی۔ بچے ہمیشہ سے اسے بہت اچھے لگتے تھے۔ انیل کے رخساروں کو چومتے
ہوئے اس نے مجھے دیکھا۔

"اسفر کے بچے بھی بہت پیارے ہیں اور وہ چھوٹا تو بہت ہی کیوٹ ہے' میرا دل چاہتا
ہے' میں انہیں گود میں لوں انہیں پیار کروں۔ لیکن اسفر پتا نہیں وہ اتنا ڈرتا کیوں ہے۔ اس کی
وائف آئی ہوئی تھی رینو کے ہاں' تو اس نے مجھے وہاں جانے سے منع کر دیا۔"

"کیوں؟"

"شاید اسے مجھ پر اعتبار نہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں کوئی ایسی بات نہ کر بیٹھوں کہ اس کی
بیوی مشکوک ہو جائے اور خوامخواہ تلخی ہو۔ مجھے تو خود اس کی بیوی پر ترس آتا ہے' مجرم سمجھتی
ہوں خود کو اس کا۔ کئی بار سوچا ہے کہ اسفر کی زندگی سے دور چلی جاؤں' لیکن وہ مرنے کی
باتیں کرنے لگتا ہے اور......"

اس نے بے بسی سے مجھے دیکھا۔

"یہ سب کتنا مشکل ہے انوشا! اسفر سے علیحدہ ہو جانا ہمیشہ کے لیے اب تو خود مجھے لگتا
ہے جیسے میں اس سے کٹ کر جی نہ پاؤں گی۔"

میں پورے ایک ماہ کے لیے آئی تھی اور میں نے سوچا تھا کہ تم سے ملوں گی سچ تو یہ ہے
کہ انعم جو تم سے اس درجہ شدید محبت کرتی تھی تو مجھے بھی تم اس کی نسبت سے عزیز ہو گئے
تھے۔ اماں کا خیال تھا کہ میں آئی ہوئی ہوں تو کسی طور انعم کو منا لوں۔

"بہت اچھا رشتہ انوشا! بہت پیسے والے لوگ ہیں۔ لڑکا بھی اچھا ہے۔"

"مگر اماں! انو ابھی سال دو سال تک شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

"کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ کہیں اس کی باتوں میں آ کر ہم نے ناصر کی شادی میں
جلدی تو نہیں کی' لیکن انو۔"

اور مجھے اماں کی سادگی پر پیار آ گیا۔

"میری بھولی ماں! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے انہیں تسلی دی۔

"بس انو! ابھی کچھ دن اور آرام کرنا چاہتی ہے۔ بابا کے پاس رہنا چاہتی ہے۔"

"پھر بھی تم اس سے بات تو کرنا۔"

"اچھا۔" میں نے ان سے وعدہ کر لیا کہ میں انعم کو سمجھاؤں گی' لیکن مجھے پتا تھا کہ وہ
میری بات نہیں مانے گی اور اسی وقت میں نے سوچ لیا تھا اسفر علی خان کہ میں تم سے بات
کروں گی تاکہ تم اسے سمجھاؤ اور تمہاری بات وہ یقیناً رد نہیں کرے گی۔ اگر واقعی تم اس سے
محبت کرتے ہو تو یقیناً تم اس کی بہتری چاہو گے اور مرد میں تو زیادہ ضبط زیادہ حوصلہ ہوتا
ہے۔ تم یقیناً اس کی بہتری کے لیے خود پر جبر کر لو گے' خود کو سمجھاؤ گے۔

اماں نے مجھے بتایا تھا کہ معظم بہت اچھا لڑکا ہے۔ بہت سلجھا ہوا اور ایجوکیٹڈ' میں نے
انعم سے کہا تھا کہ جب بھی تمہارا فون آئے وہ میری بات ضرور کروائے تم سے لیکن ہوا یوں کہ
تمہارا فون آنے سے پہلے ہی مجھے ایک روز رافت کے عزیزوں کے ہاں جانا پڑا۔ واپسی پر
جیل روڈ سے گزرتے ہی مجھے اچانک خیال آیا کہ یہاں ہی کہیں تمہارا آفس ہے' تم نے
جاب چھوڑ کر اپنا امپورٹ' ایکسپورٹ کا کام شروع کر دیا تھا' انعم نے مجھے ساری تفصیل بتا رکھی
تھی۔ تمہارے آفس کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ اس وقت پانچ بج رہے ہیں
اور انعم نے بتایا تھا کہ تم چار بجے آفس سے اٹھ جاتے ہو' میں پلٹنے لگی تو پھر کسی خیال سے رک
گئی' میں نے سوچا دیکھ لینے میں کیا حرج ہے' کیا خبر تم مل ہی جاؤ اور واقعی تمہارا آفس کھلا
تھا۔

چوکیدار نے بتایا کہ سب لوگ جا چکے ہیں' البتہ اسفر صاحب ہیں۔

"تھینک گاڈ! مجھے اسفر صاحب سے ہی ملنا تھا۔" میں نے قدم آگے بڑھایا تو چوکیدار
نے مجھے روک دیا۔

"وہ جی سر تو مصروف ہیں میڈم آئی ہوئی ہیں۔"

"کون میڈم؟" میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"وہ جی میڈم...... میڈم بٹ۔"

"تم جا کر انہیں خبر دو کہ انوشا آئی ہیں۔"

وہ کچھ جھجکا اور چلا گیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے آئی تھی۔ تمہارے قہقہے کی آواز مجھے
کھلے دروازے سے آئی' جانے کس بات پر تم اتنا دل کھول کر ہنس رہے تھے۔ چوکیدار نے مجھے اندر
جانے کا اشارہ کیا۔ تم نے کھڑے ہو کر میرا پرجوش استقبال کیا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"ارے انوشا تم اچانک...... واٹ آ سرپرائز۔"

"ہاں بس ادھر سے گزر رہی تھی تو سوچا تم سے بھی ملتی جاؤں۔"

میری نگاہوں نے سرتاپا اپنے سامنے بیٹھی خاتون کا جائزہ لیا۔ وہ بلاشبہ ایک خوبصورت خاتون تھی۔ بے حد سفید رنگت دلکش سراپا۔

"یہ...... یہ مس فاخرہ بٹ ہیں اور مس بٹ! یہ مسز رافت ہیں۔"

مجھے اس کی طرف دیکھتے پا کر تم نے تعارف کروایا تھا' میں نے محسوس کیا جیسے اس نے بیزاری سے ہاتھ آگے بڑھایا ہو اور اسے میرا آنا اچھا نہ لگا ہو۔ اس کے چہرے سے واضح ناگواری کا اظہار ہو رہا تھا۔ میرا آنا تو شاید تمہیں بھی اچھا نہ لگا ہو۔ لیکن تم نے اسے خوش اخلاقی کے پردے میں چھپا لیا تھا۔ جبکہ وہ اپنے احساسات کو چھپا نہ سکی تھی۔

"اور سنائیں۔ ہمارے رافت صاحب کا کیا حال ہے؟ آپ تو کراچی جا کر وہاں کی ہی ہو رہیں۔ لاہور کو بالکل ہی بھلا دیا۔"

میں نے بے حد غور سے تمہیں دیکھا تھا۔ تم کسی حد تک نروس لگ رہے تھے' لیکن اپنے احساسات کو چھپانے میں تمہیں کمال حاصل تھا۔

"بھئی یہ مسز رافت شادی سے پہلے ہماری تنظیم کی سرگرم رکن تھی' تم غیر محسوس طور پر یہ وضاحت کر رہے تھے۔

"اچھا خدا حافظ! میں اب چلتی ہوں۔" خاتون اچانک ہی کھڑی ہو گئی تھیں۔

"اوہ میڈم پلیز' آپ بیٹھیں۔ میں بھی بس نکلنے ہی والا ہوں۔ راستے میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔"

"اوہ!" غیر ارادی طور پر میں نے ہونٹ سکیڑے۔ گویا غیر محسوس طور پر تم مجھے جتا رہے تھے کہ تمہیں یہاں زیادہ دیر نہیں رکنا۔

"تو تھینک یو۔ میں چلی جاؤں گی۔"

"اچھا تو پھر ٹھیک ہے۔ میں خود ہی پھر آپ کو کال کر لوں گا۔" تمہارا انداز معنی خیز تھا' پھر تم نے ایک نظر مجھے دیکھا۔ "ایک منٹ میں ذرا۔"

اور پھر بات نامکمل چھوڑ کر اسے خدا حافظ کہنے کے لیے باہر چلے گئے۔ بالکل غیر ارادی طور پر میں نے اٹھ کر دروازے سے جھانک کر غیر اخلاقی حرکت کی۔

تم نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔ اور پھر اس کے ہاتھ کو ہاتھ میں لیتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے تھے۔

میرے دل پر کہیں چوٹ سی لگی تھی۔ میں جلدی سے پیچھے لوٹ آئی۔ جب تم کمرے میں آئے تو مجھے کھڑے دیکھ کر لمحہ بھر کو ٹھٹک گئے۔

"تم انوشا! کھڑی کیوں ہو؟"

"یونہی تمہارا آفس دیکھ رہی تھی۔"

میں نے سر اٹھا کر تمہیں دیکھا۔ تمہاری آنکھیں جذبے لٹا رہی تھیں اور تمہارے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔ مجھے بہت غور سے اپنی طرف دیکھتا پا کر تم ذرا سا سٹپٹائے۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو انوشا؟"

"دیکھ رہی ہوں۔ ڈیڑھ سال بدلنے کے لیے زیادہ عرصہ تو نہیں ہوتا۔"

"بدلنے کو تو ایک لمحہ بھی بہت ہوتا ہے۔ انوشا لیکن میں کبھی نہیں بدل سکتا۔"

"باتیں کرنے کا ہنر تو تمہیں ہمیشہ سے آتا تھا اسفر علی خان اور انہی باتوں کے سحر سے تو تم نے انعم کو اسیر کیا تھا۔"

"مگر مجھے تو......"

"وہم ہے تمہارا؟" تم ہنس دیے تھے۔

"یہ محترمہ میرے بچوں کی ٹیوٹر ہیں۔ تمہیں پتا تو ہے ناں کہ میں اپنی فیملی کو یہاں لے آیا ہوں۔ میں نہیں چاہتا انوشا کہ جس طرح میں نے سفر کیا ہے۔ میرے بچے بھی اس طرح سفر کریں۔ میں انہیں ہر وہ سہولت دینا چاہتا ہوں جس سے میں محروم رہا ہوں۔ میں بچوں کو اچھے سکولوں میں ایڈمشن دلوانا چاہتا ہوں اس لئے میں نے ان کے لیے ٹیوٹر کا انتظام کیا اور اسی لئے میں نے میڈم بٹ کو بلوایا تھا کہ ان سے بات کر لوں اور خدا کا شکر ہے کہ وہ مان گئی ہیں کہ گھر آ کر بچوں کو پڑھا دیں گی۔ سنا ہے بہت اچھی ٹیچر ہیں۔ کسی پبلک سکول میں پڑھاتی ہیں۔"

تم نے بہت تفصیل سے بتایا۔

"یہ تو اچھی بات ہے اسفر! کہ تم بچوں کو یہاں لے آئے ہو۔" مجھے حقیقتاً خوشی ہوئی تھی۔

"اور سناؤ۔ انعم کیسی ہے۔ کئی دنوں سے بات نہیں ہوئی۔"

"شکر ہے۔ انعم کا بھی خیال آیا تمہیں۔" میں بالکل غیر ارادی طور پر کہہ بیٹھی تھی۔

"اس کا خیال کب نہیں آتا انوشا!"

تم نے افسردگی کی اداکاری کی۔ تم کتنے بڑے اداکار تھے اسفر علی خان! مجھے آج تک یقین نہیں آتا کہ وہ سب اداکاری تھی۔

"لیکن مجبوریاں ہیں۔ کیسے کیسے نہیں تڑپتا تم کیا جانو کتنا جبر کرتا ہوں۔ کئی بار شدید خواہش کے باوجود اسے فون نہیں کر پایا۔ اتنی مصروفیت ہوتی ہے۔ کوئی نہ کوئی ہر وقت موجود ہوتا ہے اور گھر میں...... گھر سے تو اب بات نہیں ہو سکتی۔ زونی ہوتی ہے گھر پر۔"

"ہاں لیکن انعم تو پریشان ہو جاتی ہے۔ ایک منٹ کے لیے ہی سہی کال کر لیا کرو اسے۔ تم نے اسے عادی بنا دیا ہے اپنا۔"

"ہاں انوشا! کبھی کبھی مجھے احساس جرم ہوتا ہے' انجانے میں مجھ سے زیادتی ہو گئی ہے۔ مجھے اس پر اپنے جذبوں کا اظہار نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

تم بہت جذباتی ہو رہے تھے۔

"انوشا تم...... تم اس کی شادی کروا دو۔ کہیں کسی اچھے سے بندے سے۔ رافت سے کہو۔ اس کے ملنے والوں میں کوئی۔"

میں نے از حد حیرت سے تمہیں دیکھا۔ اگرچہ میں خود تم سے یہ کہنے آئی تھی کہ تم اسے سمجھاؤ وہ تمہاری بات کبھی رد نہیں کر سکے گی۔ اتنے ہی عزیز تھے تم اسے۔ لیکن تمہارے منہ سے یہ سننا مجھے پتا نہیں کیوں اچھا نہیں لگا۔ تم یہ بات کرتے ہوئے اتنے پرسکون اور مطمئن تھے جیسے تم انعم کے متعلق نہیں کسی اور لاتعلق شخص کی بات کر رہے ہو۔

"میں تو خود کوشش کر رہا ہوں بلکہ ایک رشتہ ہے میری نظر میں۔ میرا جاننے والا ہے۔ ابھی چند ماہ پہلے اس کی بیوی کی ڈیتھ ہوئی ہے۔ ایک بیٹا ہے اس کا بہت اچھا شخص ہے۔ انعم بہت خوش رہے گی اس کے ساتھ۔"

میں نے بے یقینی سے تمہیں دیکھا۔

یہ تم ہی تھے اسفر علی خان جو اسے جاننے کا دعویٰ کرتے تھے اور کہتے تھے تم اسے مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔

"پلیز' مجھے اس طرح بدگمانی سے مت دیکھو اور میرے خلوص پر شک مت کرو۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کی زندگی میرے لئے برباد ہو۔"

"تمہیں اس کے رشتوں کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسفر! اللہ کا شکر ہے کہ ہماری فیملی میں بہت لڑکے ہیں اور کوئی بھی اس کا خواہشمند ہو سکتا ہے اور ہوتے رہتے ہیں۔ آج کل بھی اس کا ایک پروپوزل موجود ہے لیکن وہ خود انکار کر دیتی ہے۔"

میں نے تمہیں معظم کے متعلق تفصیل سے بتایا۔

"اور بہت خوش نصیب ہوگا وہ شخص جسے انعم کی رفاقت نصیب ہوگی۔"

میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ تم ایک دم خوش نظر آنے لگے تھے۔

"انوشا پلیز! تم اسے سمجھاؤ اور میں بھی بات کروں گا اس سے کہ وہ معظم جیسے شخص کا پروپوزل رد نہ کرے۔"

اور پھر پتا نہیں تمہارے اور انعم کے درمیان معظم کے متعلق بات ہوئی تھی یا نہیں اور اگر ہوئی تھی تو انعم نے کیا کہا تھا۔ کیونکہ اماں نے معظم کی والدہ سے انکار کر دیا تھا۔

"یہ تم نے بہت غلط کیا ہے انو! معظم بہت اچھا لڑکا ہے اور صرف محبت کے سہارے زندگی نہیں گزر سکتی بابا اور اماں ابا وغیرہ کب تک ساتھ دیں گے تمہارا۔"

"سادہ سی بات ہے انوشا! میں کسی کے ساتھ بے ایمانی نہیں کر سکتی۔ کسی کو دھوکا نہیں دے سکتی۔ اسفی کی محبت دل میں چھپا کر میں معظم کے ساتھ جھوٹ کا کھیل نہیں کھیل سکتی۔ میرے پاس معظم کو دینے کے لیے کیا رہ گیا ہے انوشا! تمام خوبصورت لفظ سارے دلکش جذبے تو میں اسفی کے نام کر چکی' پھر معظم کو کس بات کی سزا دوں میں۔"

اور میں کیا سمجھاتی اسفر علی خان! وہ اپنے جذبوں میں بہت راسخ تھی اور تمہاری محبت پر اس کا یقین پختہ اور اگر اس یقین میں کوئی دراڑ پڑ جائے تو شاید اسے فیصلہ کرنے میں آسانی ہو' اس خیال سے میں نے اسے مس فاخرہ بٹ کی آفس میں موجودگی کا بتایا تو اس نے بالکل سرسری لیا۔

"ہاں ٹیوٹر کا مشورہ میں نے ہی اسے دیا تھا۔"

وہ تمہارے لئے اداس رہتی تھی۔ تم سے بات کرنے اور ملنے کو بے چین' لیکن تمہاری محبت پر اسے کوئی شک نہیں تھا۔

"ہم زندگی بھر ایک دوسرے سے بات نہ کریں نہ ملیں انوشا پھر بھی مجھے یقین ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوگا' میں اس کے دل میں اس کے اندر موجود ہوں گی۔"

اور اس کے اس قدر گہرے یقین نے مجھے بھی متزلزل کر دیا تھا۔ کبھی مجھے لگتا جیسے تم ایک فلرٹ شخص ہو اور تم نے محض وقت پاس کیا ہے۔ لڑکیوں سے فلرٹ کرنا تمہاری ہابی ہے۔ مجھے اس بات پر بہت حیرت ہوئی تھی' اسفر علی خان کہ تم نے ان چند سالوں میں انعم کو کوئی گفٹ نہیں دیا تھا۔ حتیٰ کہ اس کی برتھ ڈے پر کوئی کارڈ تک نہیں بھیجا تھا۔

اس روز انعم کی برتھ ڈے تھی۔ میں نے اس کے لیے کارڈ اور خوبصورت گفٹ خریدا تھا۔ سب نے ہی اسے گفٹ دیئے تھے حتیٰ کہ ناصر اور ارینہ نے بھی اسے کارڈ بھیج کر وش کیا تھا۔

"جی اور اب دکھایئے اصل تحفہ اور کارڈ۔"

رات کو اس کے کمرے میں اس کے بیڈ پر انیل کو لٹاتے ہوئے میں نے کہا تو اس نے حیران ہو کر مجھے دیکھا۔

"سب گفٹ تو تم نے دیکھ لئے تھے اور کارڈز بھی' ہاں عافیہ کا کارڈ پہلے آ گیا تھا وہ ادھر پڑا ہے۔"

"نہیں خاتون! میں تو اسفر کا گفٹ اور کارڈ دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"مگر......!" وہ لمحہ بھر کے لیے جھجکی" اسفی کو ان باتوں کا خیال نہیں رہتا۔"

"جب تم کو ان باتوں کا خیال رہتا ہے تو اسے بھی رکھنا چاہیے۔"

مجھے یاد آ گیا تھا کہ وہ کتنے اہتمام سے اس کی برتھ ڈے ارینج کرتی اور اس کے لیے گفٹ خریدتی تھی۔

"اپنے اپنے مزاج کی بات ہوتی ہے نا۔"

"مزاج کی یا کنجوسی کی۔" لیکن وہ خاموش رہی تھی۔

"تو کیا اس نے آج تک تمہیں کبھی کوئی گفٹ نہیں دیا۔" میں نے دوبارہ کہا۔

"اور تم......" میں نے بہت حیرت سے اسے دیکھا" انو! تم تو کہتی تھیں کہ تمہیں وہ مرد اچھے نہیں لگتے جو لڑکیوں سے گفٹ وصول کرتے ہیں اور جو پیسہ خرچ کرنے کے معاملے میں کنجوس ہوتے ہیں۔"

"ہاں! میں آج بھی یہی کہتی ہوں۔"

"لیکن اسفر سے محبت کرتی ہو؟"

"ہاں اسفر کی اور بات ہے۔ وہ کنجوس نہیں ہے۔ جہاں اسے خرچ کرنا ہوتا ہے کر لیتا ہے فراخدلی سے' لیکن تمہیں پتا تو ہے اس کے معاشی پرابلم ابھی اسے بہنوں کی شادیاں کرنا ہیں اور میرے متعلق اسے یقین ہے کہ میری محبت ان ساری باتوں ماورا ہے۔ میں اور وہ الگ نہیں ہیں۔ ہماری محبت تحفوں کی محتاج نہیں ہے' میں کہا کرتی تھی کہ لڑکیوں کو لڑکوں کو گفٹ نہیں دینا چاہیے۔ یہ تو مرد کا منصب ہے عورت کے لیے گفٹ خریدنا۔ لیکن محبت آدمی کو سراسر تبدیل کر دیتی ہے انوشا! میں جب بھی شاپنگ کے لیے جاتی ہوں۔

میرا جی چاہتا ہے میں اس کے لیے کچھ خرید لوں۔ کوئی اچھی سی کتاب' کوئی خوبصورت لائیٹر' کوئی ڈیکوریشن پیس' کف لنکس' ٹائی کچھ بھی مجھے اس کے لیے شاپنگ کرنا اچھا لگتا ہے انوشا۔"

"جو شخص ڈیفنس میں گھر لے سکتا ہے اور ہنڈا اکارڈ لے سکتا ہے اس کے معاشی پرابلم کیا ہو سکتے ہیں۔"

"گھر کرائے کا ہے انوشا! اور گاڑی اس نے سیکنڈ ہینڈ لی ہے۔"

وہ تمہارا خوبصورتی کے ساتھ دفاع کرتی تھی' اسفر ایسا اندھا یقین شاید ہی کسی نے تم پر کیا ہو۔

"یہاں اسی فیصد لوگ کرائے کے مکانوں میں رہتے اور سیکنڈ ہینڈ گاڑیاں خریدتے ہیں۔ لیکن وہ معاشی مسائل کا شکار نہیں ہوتے یا تو وہ انتہائی کنجوس ہے اور یا پھر اس نے تم سے محبت نہیں کی۔ ابھی ابھی تم نے خود کہا ہے کہ جب محبت ہو جاتی ہے کسی سے تو خود بخود اس کو کچھ دینے کو دل چاہتا ہے۔"

"ہاں شاید کنجوس ہو کچھ" وہ افسردہ سی تھی۔ لیکن محبت تو بے حد کرتا ہے۔

اسی یقین و بے یقینی میں ایک ماہ گزر گیا۔ میری تم سے دوبارہ ملاقات نہ ہو سکی تھی اور میری واپسی کا وقت آ گیا تھا۔

* * *

مجھے کراچی آئے ابھی چھ ماہ ہی ہوئے تھے کہ اچانک میری طبیعت خراب ہو گئی اور اس

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

حد تک کہ کچھ دیر کے لیے تو ڈاکٹر بھی میری زندگی سے مایوس ہوگئے تھے۔ ایسے میں لاہور سے ابا اور اماں کے ساتھ انعم بھی آگئی تھی۔ میرے ہاسپٹل سے گھر آنے کے بعد اماں اور ابا تو چلے گئے مگر میں نے انعم کو زبردستی روک لیا۔

وہ پہلے سے زیادہ کمزور ہو رہی تھی اور اس کی آنکھیں ہر وقت بھیگی رہتی تھیں۔

''انو! کیا ہے تمہیں؟ اتنی اداس کیوں ہو رہی ہو اسفر تو ٹھیک ہے نا۔''

''ہاں ٹھیک ہے اور بہت مصروف۔ کبھی کبھار بات ہوتی ہے اب...... بہت دنوں بعد۔''

''اور تم...... کیا تم اب بھی اپنے فیصلے پر قائم ہو۔''

''ہاں!'' اس کی آنکھوں میں دیے سے جل اٹھے۔

''انو! محبت اور فلرٹ کا فرق کیسے پتا چلتا ہے۔ کیسے تم نے یقین کرلیا کہ اسفر تم سے محبت کرتا ہے فلرٹ نہیں کر رہا۔''

''جذبے خود بخود اپنا آپ منواتے ہیں اور میرے دل نے بھی مجھے بتایا تھا کہ یہ محبت ہے۔ کوئی بیکار اور فضول جذبہ نہیں۔''

اور اسفر علی خان کتنا مان تھا اسے تم پر کتنا یقین تھا اسے کہ تم نے اس سے محبت کی ہے۔ حالانکہ تم تو اس کے ساتھ محض وقت گزار رہے تھے اور یہ کتنا بڑا المیہ تھا کہ تم نے...... تم نے انعم جمال سے کبھی محبت نہیں کی تھی اور اس کا اعتراف تم نے خود کیا تھا۔

باسط افضال سے۔

باسط افضال تمہارے ہی قبیلے کا ایک فرد تھا اور رافت کا چچازاد۔ اسے بھی شعر و ادب سے کافی شغف رہا تھا اور وہ تمہارا کلاس فیلو تھا اور کسی زمانے میں تمہاری اس سے کافی دوستی تھی۔

انہی دنوں جب انعم کراچی میں تھی۔ وہ اپنے کسی کام سے کراچی آیا تو رافت کے اصرار پر ہمارے پاس ہی ٹھہر گیا تھا۔ عموماً وہ رافت کے آفس سے آنے سے پہلے ہی آجاتا اور پھر انیل کو گود میں اٹھائے پھرتا۔ انیل بھی چند ہی دن اس سے خاصا مانوس ہو گیا تھا۔ مگر اس روز رافت کے آنے کے بعد وہ واپس نہ آیا حالانکہ صبح نو بجے والی فلائٹ سے اسے واپس بھی جانا تھا۔ رافت کراچی کے حالات کی وجہ سے ازحد پریشان تھے۔

''اب اس کا کہاں پتا کریں۔ مجھے تو اس کے کسی دوست وغیرہ کا بھی پتا نہیں اور عزیز کوئی ہمارا یہاں ہے نہیں کہ ادھر سے پتا کروں۔''

پریشان تو میں بھی تھی لیکن میں نے انہیں تسلی دی۔

''ممکن ہے کہیں کسی کام سے رک گیا ہو۔ یہ کراچی ہے، یہاں تو رات کے ایک بجے بھی کوئی واپس آئے تو اچنبھے کی بات نہیں ہے۔''

''ہاں مگر آج کل کے حالات ایسے نہیں ہیں۔''

بارہ بجے اس کا انتظار کر کے ہم کھانے کے لیے بیٹھے ہی تھے کہ وہ آ گیا۔

''یار! بہت پریشان کیا تم نے۔''

رافت اسے دیکھ کر ریلیکس ہوگئے۔ میں دیکھ رہی تھی کہ میرے اصرار کے باوجود انہوں نے ابھی تک کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔

''سوری یار! وہ اسفر مل گیا تھا۔ تقریباً تین سالوں بعد ہم ملے ہیں وہ یہاں اپنے کسی کام سے آیا ہوا تھا۔ اچانک ملاقات ہوگئی ایک آفس میں اور وہاں سے مجھے ساتھ گھسیٹ لے گیا۔ بس پھر اس نے مجھے آنے ہی نہیں دیا، بہت کہا تم پریشان ہو گے لیکن جس دوست کے ہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا وہاں فون کی سہولت بھی نہیں تھی۔''

''کون اسفر؟'' رافت کو یاد نہیں آرہا تھا۔

''یار وہی اسفر، میرا کلاس فیلو تھا۔ شاعر ٹائپ آدمی تھا بلکہ آج کل تو خاصا معروف شاعر ہے۔ ایک کتاب مارکیٹ میں آچکی ہے دوسری زیر طبع ہے۔''

''اچھا اچھا۔ تم اسفر علی خان کی بات کر رہے ہو۔''

''ہاں ہاں۔'' انعم اور میں نے بیک وقت چونک کر اسے دیکھا۔

''تمہاری تو اس سے بہت دوستی ہوا کرتی تھی۔'' رافت نے اس کی طرف ڈونگہ بڑھایا۔

''ہاں یار! بس بعد میں کچھ فاصلے ہوگئے۔ وہ اچھا دوست تھا لیکن اس کی کچھ باتیں مجھے پسند نہیں تھیں، جس پر اختلاف ہو جاتا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ میں تو اسلام آباد واپس چلا گیا وہیں جاب بھی مل گئی اور اسفر اس وقت تو گاؤں چلا گیا تھا بعد میں لاہور ہی سیٹل ہوگیا۔ میرا آنا جانا تو رہا لاہور لیکن اس سے کبھی تفصیلی ملاقات نہ ہوسکی، یوں ہی سرسری ایک دو بار ملا۔

اس کے ساتھ یقیناً مخلص ہے۔

"میرے سامنے ہی ایک لڑکی کا فون آیا تھا' کوئی میڈم فاخرہ تھیں۔ اتنے لانگ ڈسٹنس سے اس نے کوئی گھنٹہ بھر بات کی ہوگی اسفر سے۔"

"میری دوست ہے بہت اچھی۔" اس نے مجھے بتایا۔

"لیکن یار! پچھلے سال تو تم کسی انعم نامی لڑکی کے اسیر تھے اور اس کے فون آیا کرتے تھے یہاں کیا اب۔"

اس کے دوست نے پوچھا تو پتا ہے بھابی اس نے کیا کہا۔ کہنے لگا کہ وہ اب بھی میری دوست ہے اور یہ حیرت کی بات ہے کہ اس کی دوستی کسی بھی لڑکی سے ایک سال سے زیادہ نہیں رہتی۔ بقول اس کے' ایک سال بعد ہر لڑکی ایک جیسی لگنے لگتی ہے۔ اس کی انفرادیت وغیرہ سب ختم ہوجاتی ہے۔ یقیناً اس میں کچھ ہے جو آج تک وہ اس کی دوست ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ تقریباً چار سالوں سے اس کی فرینڈشپ ہے اس کے ساتھ۔"

مجھے یوں لگ رہا تھا اسفر علی خان! جیسے کہیں کوئی زلزلہ آگیا ہو اور میرے اردگرد ساری عمارتیں ڈھے گئی ہوں۔ میرے اندر شور سا مچا تھا۔ جیسے پتا نہیں کتنی ٹوٹ پھوٹ ہوگئی ہو اور انعم۔ مجھے ایک دم اس کا خیال آیا اس پر کیا بیت رہی ہوگی۔ میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا وہ ایک دم ساکت بیٹھی تھی اور اس کا رنگ خطرناک حد تک سفید ہو رہا تھا۔

"انو!" گھبرا کر میں نے اسے جھنجوڑا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

رافت نے پوچھا تو بے حد مدہم آواز میں اس نے بتایا کہ اس کے سر میں درد ہے اور پھر معذرت کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پتا نہیں اسفر علی خان میں نے کیسے خود کو سنبھالا ہوا تھا اور پتا نہیں کیسے میں نے ٹیبل سے برتن سمیٹے اور انیل کو رافت کے پاس چھوڑ کر اس کے پاس آ گئی۔ وہ اپنے بیڈ پر دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے بیٹھی تھی۔ یوں جیسے کوئی سب کچھ ہار کر بیٹھا ہو۔

"انو!" میں نے آہستگی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اس نے نگاہیں اٹھائیں۔ اس کی آنکھیں اتنی سرخ ہو رہی تھیں جیسے ابھی ان سے خون ٹپک پڑے گا۔

"نہیں۔" اس نے جیسے سرگوشی کی۔ "نہیں انوشا۔" پھر اس کی آواز ذرا سی بلند ہوئی۔

"ایسا نہیں ہوسکتا یہ غلط ہے۔ اس کا ماضی جو بھی تھا لیکن اس کا حال۔ نہیں انوشا! وہ محبت تھی۔ بھلا جھوٹ پر محبت کا گمان کیسے ہوسکتا ہے۔ لیکن اس نے مجھ سے محبت کی۔ اس نے مجھ سے محبت کی ہے وہ مجھ سے محبت کرتا تھا یقین کرو۔ اس نے میرے ساتھ کوئی کھیل نہیں کھیلا۔ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔ وہ انجوائے منٹ نہیں تھی۔ وقت گزاری نہیں تھی۔ وہ محبت تھی صرف محبت۔"

جو آنسو اس نے اب تک روکا ہوا تھا۔ بے اختیار ہو کر اس کے رخساروں پر پھسل آیا۔

"انوشا!" میں اس کے قریب ہی بیٹھ گئی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

تمہیں یقین نہیں آئے گا اسفر علی خان اپنے کانوں سے تمہارے متعلق اتنا کچھ سننے کے باوجود اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ تم نے اسے دھوکا دیا ہے اور اس کے ساتھ محض وقت گزارا ہے۔ وہ بار بار مجھے یقین دلاتی۔

"میرا اعتبار کرو انوشا! اس نے مجھ سے محبت کی ہے۔ سچی اور کھری محبت۔"

وہ رونے لگی اور روئے چلی جاتی اور میں جو تمہیں برا بھلا کہنا چاہتی تھی بے بس سی ہوجاتی۔ اس کی حالت بہت عجیب ہو رہی تھی' اس لئے میں اسے جانے نہیں دے رہی تھی۔ حالانکہ اس کی چھٹی کب کی ختم ہوگئی تھی۔

تم اسفر علی خان اندازہ کرسکتے ہو اس اذیت کا جس سے وہ ان دنوں گزر رہی تھی۔

تم نے تو صرف پایا ہی پایا ہے اسفر علی خان۔

عقیدہ کی محبت۔

اپنی بیوی کی محبت۔

انیلا ربانی کی محبت۔

میڈم فاخرہ بٹ کی محبت۔

انعم جمال کی محبت اور نہ جانے کس کس کی محبتوں سے تمہارا دامن بھرا ہے اسفر علی خان۔

اور یہ کتنا کمال ہے تمہارا کہ کوئی بھی تم سے بدگمان نہیں ہوا کبھی۔ سب ہی نے مجبور جانا اور تمہاری مجبوریوں سے سمجھوتہ کر کے پیچھے ہٹ گئیں اور باسط افضال نے بتایا تھا کہ جس روز

تم نے انیلا ربانی کو اپنی مجبوریوں کی کہانی سنا کر اس کی ابدی رفاقت سے معذرت کی تھی تو.. روتے روتے بے ہوش ہوگئی تھی۔

اور یہ ایک لڑکی انعم جمال۔

جو اپنی ذات میں پوری کائنات تھی۔

کیسے تمہارا احوال سن کر ٹوٹ رہی تھی' لیکن اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

''میں عالم برزخ میں ہوں انوشا!''

ایک روز اس نے میرے ہاتھ تھام لیے۔ شدت گریہ سے اس کی آنکھیں سوج رہی تھیں۔

''یا میرا یقین مجھے لوٹا دو یا اسے بالکل کرچی کرچی کر دو' یہ درمیانی کیفیت مجھے پیسے جا رہی ہے۔''

''اسفر سے بات کرلو۔'' میں نے ہی اسے مشورہ دیا تھا۔

اس کا یقین بعض اوقات مجھے بھی بے یقین کر دیتا اور مجھے باسط افضال کی باتیں گپ ہی لگنے لگتیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ اسفر علی خان نے انعم کے ساتھ دل لگی کی ہو۔

بھلا اس کا کیا فائدہ۔

''دراصل کچھ لوگ اس طرح اپنی ناآسودہ خواہشوں کی تکمیل کرتے ہیں۔''

میں نے کہیں پڑھا تھا۔ پھر بھی پتا نہیں کیوں اسفر علی خان میں بھی لاشعوری طور پر اس بات کی منتظر تھی کہ تم باسط افضال کی ہر بات جھٹلا دو اور کہہ دو کہ اس نے جو کچھ کہا وہ جھوٹ تھا' لیکن تم مل ہی نہیں رہے تھے۔ کتنی بار انعم نے تمہیں فون کیا لیکن شاید تمہارا فون خراب تھا۔ یا پھر نمبر بدل گیا تھا۔

***

اماں کا فون آیا کہ ناصر کا بیٹا پیدا ہوا ہے اور یہ کہ گھر میں انعم کے بغیر بہت اداسی ہے۔

بابا بہت مس کر رہے ہیں اسے اور میں انعم کے ساتھ لاہور آنے کو تیار ہوگئی۔

''صرف چند دنوں کے لیے رافت۔ ناصر کے بیٹے کی خوشی میں شریک نہ ہوئی تو ارینہ کا دل برا ہوگا اور ناصر کا بھی۔''

میں نے رافت سے اجازت لے لی۔

گھر میں بے حد رونق تھی۔ ارینہ کی بہنیں' بھائی' بھابیاں سب ہی اٹھے تھے اور اماں پوتے کو پا کر کھلی تھیں۔ پھر بھی ان کی نظروں نے انعم کو اندر تک دیکھ لیا۔

''یہ انو کو کیا ہوا ہے انوشا۔ کیا بیمار تھی۔ کتنی پیلی ہو رہی ہے۔''

''ہاں۔''

''اور تم نے اطلاع بھی نہیں دی۔''

''میں نے سوچا۔ آپ لوگ پریشان ہو جائیں گے۔''

بابا کتنی ہی دیر تک اسے گلے سے لگائے رہے۔

''میرا دل یونہی تو نہیں گھبرا رہا تھا اور اب تم نہ آتیں تو میں نے سوچ لیا تھا خود آ جاتا۔''

اور وہ سب سے مل کر بابا کے ساتھ اپنے پورشن کی طرف چلی گئی اور میں رات بہت دیر سے فارغ ہوئی تو یہ سوچ کر اس کی طرف نہ گئی کہ وہ آرام کر رہی ہوگی۔ لیکن رات کو کھانے کے بعد جب میں کر ماں بی بی کے ساتھ برتن وغیرہ سمیٹ کر سونے کے لیے جا رہی تھی تو لاؤنج میں پڑے فون کو دیکھ کر مجھے تمہارا خیال آ گیا۔ ایک بار تم سے پوچھوں تو سہی تم نے ایسا کیوں کیا۔

رینو کو فون کر کے تمہارے نئے گھر کا نمبر لیا اور پھر تمہیں فون کر ڈالا۔

اتفاق سے تم نے ہی فون ریسیو کیا۔

''ارے انوشا آپ۔ کہاں سے بات کر رہی ہیں۔''

''یہاں سے ہی۔''

اور پھر اچانک ہی تمہیں جیسے خیال آیا۔

''یہ میرے گھر کا نمبر تمہیں کہاں سے ملا۔''

''جہاں سے بھی' تم نے تو یہی بتا رکھا تھا نا انو کو تمہارے گھر میں فون نہیں ہے۔''

مجھے اچانک ہی خیال آیا تھا کہ انو نے بتایا تھا کہ تمہارے گھر فون نہیں ہے۔

''وہ دراصل۔'' تم ٹپٹا گئے۔

''انعم بہت بیمار ہے اسفر علی خان! بہت اپ سیٹ اور اس کے ذمہ دار تم ہو۔''

''اوہ اچھا۔ میں ذرا بزی ہوں۔ مہمان ہیں تو پھر بات ہوگی انشاء اللہ۔''

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

اور تم نے خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا اور میں کتنی ہی دیر ریسیور ہاتھ میں تھامے ساکت کھڑی رہی۔ یہ تم تھے اسفر علی خان جو انو سے کہا کرتے تھے کہ اس کے سر میں درد بھی ہوتا ہے تو تم اسے اپنے دل پر محسوس کرتے ہو۔ یقیناً باسط نے جو کچھ بتایا تھا اس کا حرف حرف سچ تھا بس پتا نہیں کیوں انعم کے ساتھ ساتھ میں بھی اسے تسلیم نہیں کر رہی تھی۔ کیا صلہ دیا تھا تم نے اس کی محبتوں اور اعتبار کا، تمہیں شاید یاد نہیں ہو اسفر علی خان۔ یہ وہی انعم جمال تھی جس نے ایک بار اپنی چیک بک نکال کر تمہارے سامنے رکھ دی تھی اور بلینک چیک پر دستخط کر کے وہ چیک تمہیں دے دیا تھا۔

یہ کیسا اعتبار تھا اسفر علی خان۔

اور تم...... تم نے اسے گھر کا فون نمبر تک بتانے کا اعتبار نہ کیا تھا اور اس سے جھوٹ بول دیا تھا کہ تمہارے گھر فون نہیں ہے۔ کس قدر نامعتبر کر دیا تھا تم نے اسے اگر وہ جان پاتی تو کس قدر اذیت ہوتی اسے۔

* * *

اگلے دو تین دن انتہائی مصروفیت رہی۔

اماں نے ناصر کے بیٹے کی پیدائش کی خوشی میں عقیقے کی دعوت کر ڈالی تھی۔ انعم بس ذرا کی ذرا آئی تھی۔ اسے ٹمپریچر تھا سو کسی نے اصرار بھی نہ کیا۔ میرا سارا دھیان اس کی طرف رہا۔ لیکن اس کے پاس جا نہ سکی۔ اگلے روز میں سسرال گئی تو پھر کئی دن تک نہ آ سکی، اچانک ہی میری نند کی منگنی اور نکاح طے پا گیا تھا۔ رافت بھی آ گئے تھے۔ میں نے انعم کو فون کیا۔

"اچھی ہوں انوشا!"

اس نے مجھے تسلی دی۔

"اپنا بہت خیال رکھنا۔ میں فارغ ہو جاؤں پھر ہم اسفر سے ملنے جائیں گے۔"

"ہاں انوشا اب تو دماغ کی رگیں پھٹنے لگی ہیں...... کچھ تو ہو...... کوئی اذیت ناک بات ہی سہی۔"

تم اسے فون پر نہیں مل رہے تھے۔ میں فارغ ہو کر آئی تو میں نے پوچھا کہ "تمہاری بات ہوئی اسفر سے۔"

"ہاں ایک دن بس دو منٹ کیلئے۔ میں نے فاخرہ کا پوچھا تو۔"

"تو کیا کہا؟"

"یہی کہ وہ صرف اس کے بچوں کی ٹیوٹر ہے اور کچھ نہیں اور بتا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے کوندا سا لپکا۔

"تم یقین کرو گی انوشا! اس نے مجھ سے کہا ہے کہ جب تم چلتی ہو انو تو تمہارے جوتے کی ایڑیوں سے جو دھول اڑتی ہے۔ اس دھول پر میں ہزاروں فاخراؤں کو قربان کر سکتا ہوں۔"

"میں...... میں کیا کروں انوشا؟"

وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

میں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور وہ بہت دیر تک میرے بازوؤں میں لپٹی روتی رہی۔

اور اسی شام میں اسے ساتھ لے کر تمہارے آفس آئی تھی اور اس روز کی طرح آج بھی تمہارے آفس کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مجھے اچانک خیال آیا تھا کہ تمہارا آفس تو چار بجے بند ہو جاتا ہے اور اس وقت ساڑھے چار بج رہے ہیں، دراصل عین وقت پر انعل نے رونا شروع کر دیا تھا اور پھر اسے سلانے میں کچھ دیر ہو گئی تھی اور اس روز کی طرح آج بھی تم آفس میں موجود تھے۔ تمہارے آفس کا دروازہ نیم وا تھا، اندر سے تمہاری باتوں کی آواز آ رہی تھی اور تمہارا چپڑاسی آس پاس کہیں نہیں تھا۔ میں غیر ارادی طور پر ٹھہر گئی اور میرے ساتھ انعم بھی۔

"تو بھئی وہ کیا تھا وہ سب...... انعم جمال کو دن میں بار بار فون کرنا رات کو جب رنگ کرو فون بزی۔ پوچھو تو جواب انعم سے بات ہو رہی تھی۔" وہ اجنبی آواز شاید تمہارے کسی راز دار دوست کی تھی۔

"یار! وہ میری بہت گہری دوست ہے۔ ہم دونوں بہت اچھے دوست ہے اور بس میں انعم کا بہت احترام کرتا ہوں۔ بہت اچھی لڑکی ہے وہ۔"

"کمال ہے یار! میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم اس کی محبت میں گرفتار ہو چکے ہو اور مجھے بار بار بھابی کا خیال آتا تھا۔"

"محبت۔ ہاں محبت میں تو گرفتار ہو چکا ہوں لیکن یار وہ انعم جمال نہیں بلکہ" تمہارے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

لہجے میں خمار سا اتر آیا تھا۔

"بلکہ وہ فاخرہ بٹ ہے۔"

"میڈم فاخرہ!"

تمہارے دوست کے لہجے میں استعجاب تھا۔

"ہاں۔"

"اور اس محبت کا انجام۔"

"انجام۔ میں نے زونی سے بات کی تھی میں اب اس پوزیشن میں ہوں کہ دو بیویوں کو افورڈ کرسکتا ہوں' لیکن اس نے تو یار واویلا مچا دیا۔ ہنگامہ کھڑا کردیا۔ بچوں کو ساتھ لے کر جانے کی دھمکی دی اور یار میں بچوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

تمہارے لہجے میں اداسی کے رنگ گھل مل گئے تھے۔ کتنے بڑے اداکار تھے تم آسکر ایوارڈ کے مستحق۔

"اور میں۔"

یکایک مجھے لگا جیسے میرے ہاتھ پر انعم کے ہاتھ کی گرفت کمزور ہوگئی ہے۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دھول اڑ رہی تھی اور چہرہ پتھر ہو رہا تھا اور ہم وہاں سے ہی پلٹ آئے' اب ہمارے پاس جاننے کے لیے رہ ہی کیا گیا تھا۔ وہ یوں جذب کے عالم میں چل رہی تھی جیسے اس کے اندر سب کچھ ڈھے گیا ہو...... اور تم نے کتنا ظلم کمایا۔"

کیا مل گیا تمہیں اس سے؟ چند لمحوں کی خوش کن رفاقت اور بس اور اس کے صلے میں تم نے اسے مار دیا۔

اور میں آج بھی سوچتی ہوں اسفر علی خان اور مجھے اپنے اس سوال کا جواب کہیں نہیں ملتا کہ کیا ایسا ممکن ہے کہ اتنی شدتیں اور ان کا اظہار جھوٹ ہو' کیسے کرلیتے ہو تم۔ کیسے سب سے ایک ہی جیسا اظہار کرلیتے ہو تم اسفر علی خان! محبت تو کسی ایک سے ہی ہوسکتی ہے نا اور تم۔

شاید تم نے کسی سے محبت نہیں کی۔

نہ عفیدہ سے۔

نہ انیلا ربانی سے۔

نہ انعم سے۔

اور نہ ہی فاخرہ بٹ سے۔

شاید تم کسی سے محبت نہیں کرسکتے۔ کتنے بدنصیب ہو تم اسفر علی خان۔ کیا زندگی کے سفر میں جن جن لڑکیوں کے دلوں کے تار چھیڑ کر انہیں پیچھے چھوڑ آئے ہو ان کی یاد بھی تمہیں نہیں آتی ہوگی اور اس انعم جمال کا خیال بھی کبھی تو آیا ہوگا تمہیں' جس نے اس روز سے چپ کی بکل اوڑھ لی ہے۔ خاموش خالی خالی نظروں سے سب کو دیکھتی ہے اور سر جھکا کر اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں جانے کیا کھوجنے لگتی ہے۔

اس کی ہنسی کی کھل کھل اب سنائی نہیں دیتی۔ اسفر علی خان اور اس کی آنکھوں میں جگمگ جگمگ کرنے والے ہنسی کے تارے مر گئے ہیں۔

اور رخساروں پر کھلتے پھول مرجھا گئے ہیں۔ وہ یوں ہر ایک کو دیکھتی ہے جیسے ابھی تک سمجھ نہ پائی ہو کہ یہ کیا ہوگیا ہے اس کے ساتھ۔

پتا نہیں کیا کچھ ڈھے گیا ہے اس کے اندر کہ اس کی آنکھوں میں ہر وقت ریت اڑتی رہتی ہے۔

اور وہ مضطرب و بے چین گرم دوپہروں میں ننگے پاؤں برآمدوں اور صحن میں چکراتی پھرتی ہے۔ جانے کیا کھوجتی ہے وہ اسفر علی خان۔

کبھی کبھی اچانک کسی خیال کا جگنو اس کی ریت اڑاتی آنکھوں میں لمحہ بھر کو دمکتا ہے اور وہ قلم اور ڈائری لے کر بیٹھ جاتی ہے ان بیتے چار سالوں میں اس نے کیا کچھ لکھ ڈالا ہے اسفر علی خان۔

وہ جو شاعری کو وقت کا زیاں سمجھتی تھی۔ لیکن ایک وقت آئے گا اسفر علی خان جب تم اکیلے رہ جاؤ گے' تنہا بیوی اور بچوں کے ہوتے ہوئے بھی بالکل اکیلے اور تنہا۔ پھر یہ سب تمہیں یاد آئیں گی۔

یہ عفیدہ' انیلا ربانی اور انعم جمال۔

ان کے آنسو تمہیں تڑپائیں گے' لیکن تب...... تب...... بابا سے اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی اسفر علی خان' اس لئے میں اسے ساتھ لے آئی ہوں۔

اور اسے دیکھ کر قطرہ قطرہ لہو کی بوندیں میرے اندر گرتی ہیں۔ میں گرم دوپہروں میں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

تڑپ کر گہری نیند سے بیدار ہو جاتی ہوں اور اسے کوریڈور میں ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے دیکھتی ہوں تو سسک پڑتی ہوں اور بے اختیار میرے لبوں سے تمہارے لئے کچھ نہ کچھ نکل جاتا ہے۔ تو وہ تڑپ کر رہ جاتی ہے۔ اس قدر بے چین اور مضطرب کہ میں نادم ہو کر۔

اس سے معذرت کرنے لگتی ہوں۔ جانتے ہو اسفر علی خان وہ آج بھی تم سے اتنا ہی پیار کرتی ہے' اتنی ہی شدتوں سے بے خبری میں بھی وہ تمہارے خلاف کچھ نہیں سن سکتی۔

اور تم نے کیا کیا۔ کیا کیا تم نے۔ کون سا تم نے اسے اپنے رفاقتیں دینا تھیں۔ بس ایک مان ہی تو تھا اس کے پاس تمہاری محبت اور وفا کا اور وہ مان تم نے توڑ دیا۔

اگر وہ باوفا ہوتا تو کیا ہوتا
وہی وہ بے اجر چاہت
مسافت رائیگاں اپنی
وہ رستے جدا اپنے
اسے ملنا نہیں تھا
پر اگر وہ باوفا ہوتا
ہمارے زخم سل جاتے
ہمارا مان رہ جاتا

یہ نظم آج صبح ہی تو میں نے اس کی ڈائری میں پڑھی ہے اسفر علی خان۔
کیسی بے طلب محبت تھی اس کی اور تم نے اس محبت کی نفی کر دی۔
سونے سے ترشا ہوا دل تھا انعم جمال کا' جسے تم نے ایک مکھی سے بھی حقیر جانا۔
کیا کچھ نہیں دیا تھا اس نے تمہیں۔

اور تم نے برتے ہوئے لفظ بوسیدہ جملے بدلے میں دیئے تھے اور وہ بھی واپس لے لئے' کتنے تنگ دل اور کم ظرف تھے تم اسفر علی خان۔ میں اسے ہاتھ پکڑ کر اندر لاتی ہوں تو میرا جی روتا ہے اور میرا اندر بھیگ جاتا ہے۔

اس شام تمہارا اچانک ہی فون آ گیا تھا۔ انعم سکون دواؤں کے زیر اثر سو رہی تھی اور میں نے تمہارا فون اٹینڈ کیا تھا۔ وہی خوشگوار چہکتا ہوا لہجہ۔ میں نے تمہیں آئندہ فون کرنے سے منع کر دیا۔

''مگر کیوں انوشا! پلیز بہت دن اس سے بات نہ ہو تو اپنا آپ نامکمل سا لگنے لگتا ہے۔ پلیز انوشا انعم سے بات کرا دو۔''

تمہاری آواز بھرا رہی تھی اور اگر میں نے اپنے کانوں سے تمہاری وہ گفتگو نہ سنی ہوتی تو تمہارے لہجے پر ایمان لے آتی' لیکن اسفر علی خان اب تو تمہارا اصلی چہرہ میرے سامنے تھا۔

''ایکٹنگ ختم کرو اسفر علی خان! اور اب ذرا پیچھا چھوڑ دو اور پلیز آئندہ جب دل بہلانا ہو تو فاخرہ بٹ کو فون کرو اور اگر وہ نہ مل سکے تو یقیناً تمہارے پاس کوئی اور متبادل ضرور ہو گا۔ سمجھو انعم جمال مر گئی ہے۔''

میں نے ریسیور رکھ دیا تھا۔ تم یقیناً بہت حیران ہوئے ہو گے اور پھر کندھے اچکا کر فاخرہ بٹ کو رنگ رکنے لگے ہو گے۔ ممکن ہے کبھی پھر تم نے انعم کو فون کیا ہو۔ ممکن ہے کبھی اس سے تمہاری بات ہوئی ہو یا پھر کبھی رینو یا مومنہ نے اچانک کہیں ملاقات ہونے پر انعم جمال کو بتایا ہو۔

اسفر علی خان اور سارے حساب رہنے دو' لیکن اس ایک گناہ کا حساب تو تمہیں دینا پڑے گا۔ محبت کی توہین کا گناہ۔ لیکن تم...... تم شاید اب بھی ایسے ہی ہو گے۔ اتنے ہی خوش اور مطمئن۔

لیکن ایک دن ایسا آئے گا اسفر علی خان جب تمہیں انعم جمال یاد آئے گی۔
اپنی زیادتیاں یاد آئیں گی۔
اور اس کی محبتیں۔
پھر تمہیں کہیں سکون نہیں ملے گا۔ کہیں چین نہیں آئے گا اسفر علی خان کہ میں نے تمہیں معاف نہیں کیا۔
میں تم سے خون بہا طلب نہیں کرتی۔
میں تمہیں بددعا نہیں دیتی۔
لیکن میں تمہیں معاف بھی نہیں کر سکتی۔

میں انوشا کمال آج انعم جمال کے ان آنسوؤں کو جو صرف میں نے دیکھے ہیں' اور اس چپ کو گواہ بنا کر جس نے ان کی آنکھوں کے تارے بجھا دیئے ہیں' قسم کھاتی ہوں کہ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ انعم جمال کے ساتھ یہ سنگین مذاق کرنے پر میں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

نے تمہیں معاف نہیں کیا ہے اسفر علی خان یہ بات یاد رکھنا۔

بھلے انعم جمال معاف کر دے۔

اور مجھے اس بات کا یقین ہے کہ ایک دن تم ضرور انعم جمال کو پکارتے ہوئے آؤ گے۔

اسی طرح جس طرح گرم دوپہروں میں ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے وہ تمہیں بے آواز پکارتی ہے۔

اسی طرح یاد کرو گے جس طرح وہ تمہیں یاد کرتی ہے اور اسی طرح تڑپو گے بے چین ہو گے، جس طرح وہ ہوتی ہے، ہاں ابھی سفید نرم نازک ہتھیلیوں پر شعر لکھو اسفر علی خان اور......

اس موسم میں کھل کر کھیلو اپنے اور پرائے چاند۔

* * *

معروف خواتین رائٹرز

بیلی راجپوتاں کی ملکہ — نمرہ احمد — قیمت -/400 روپے

گونگے دکھ — اقبال بانو — قیمت -/500 روپے

محرمِ دل — نوشین ناز اختر — قیمت -/450 روپے

وردی، وعدہ اور وفائیں — ساجدہ حبیب — قیمت -/300 روپے

شہرِ دل — شمع حفیظ — قیمت -/600 روپے

خوبصورت سرورق، سفید کاغذ، عمدہ طباعت

ناشر القریش پبلی کیشنز

سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور

فون (042) 37652546, 37668958

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام